

پیغمبر حکمت و بصیرت
صلی اللہ
علیہ وسلم

پروفیسر محمد صدیق قریشی



پیغمبر حکمت و بصیرت

227098

Marfat.com

پروفیسر محمد صدیق قریشی

ناشران و تاجران کتب
عزنی شریٹ اردو بازار لاہور

الفیصل

297-9921

میں سے سب

۱۲۷۵۸۱

۲

نومبر 2005ء

محمد فیصل نے

تعریف پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔

قیمت: -/200 روپے

AI-FAISAL NASHRAN

Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore. Pakistan

Phone : 042-7230777 Fax : 09242-7231387

http : www.alfaisalpublishers.com

e.mail : alfaisal_pk@hotmail.com

e.mail : alfaisalpublishers@yahoo.com

۲۷-۵۲-۱۵

والدہ محترمہ مرحومہ و مغفورہ

کے نام

خانیک بیگم

محتویات

۷	پیش لفظ
۱۳	اسلام کا نظام عدل، احسان اور برائیوں کا انسداد
۲۵	حضور ﷺ کی شخصیت داعی امن و اخوت
۷۱	لسانی و گروہی اختلاف کا خاتمہ۔۔۔ تعلیمات نبویؐ کی روشنی میں
۱۰۱	اسلامی فلاحی ریاست اور اس کے تقاضے
۱۳۱	اسلام کا معاشی نظام
۱۵۱	محسن نسواں
۱۶۷	عصر حاضر کے مسائل اور تعلیمات نبویؐ
۱۸۹	حضورؐ کی عائلی زندگی اور اس کی اہمیت
۲۱۵	انقلاب نبویؐ
۲۲۹	اسلام میں انسانی رشتے
۲۶۱	حضورؐ کی عسکری فراست
۲۹۱	بین الاقوامی تعلقات کا اسلامی نظریہ
۳۱۳	کتابیات

پیش لفظ

ظہور اسلام کے وقت ہر سو جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، نہ اس سے قلب و روح محفوظ تھے اور نہ ہی فکر و ذہن۔ ملکوتی اور روحانی جمود نے انسانی ذہن کو معطل کر کے رکھ دیا تھا۔ انسانیت مغلوب، مقہور اور ذلیل ہو رہی تھی، استحصال کا دور دورہ تھا۔ اخلاق ناپید تھا اور روحانیت دم توڑ چکی تھی۔ علم کی جگہ جہالت اور صدق کی جگہ کذب بیانی نے لے لی تھی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور سیرت طیبہ نے امن عالم کے لیے مفروضے اور بے بنیاد ضابطے، چارٹر اور رسمی تدابیر انسانوں کو نہیں دیں بلکہ حقیقت پر مبنی راہ عمل دکھائی کہ قلوب پر مردہ حیات نو سے متمتع ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بادیہ نشینوں کو ایسے گرتلائے کہ ان کی کایا پلٹ گئی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کا اعجاز ہی تھا جس کی بدولت اہل عرب کا انداز معاشرت تبدیل ہو گیا، انداز سیاست میں تبدیلی آئی اور انداز معیشت میں تبدیلی وقوع پذیر ہو گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید الہی، احترام آدمیت اور دین و دنیا کے معاملات میں ایسے نادر نمونے پیش کیے کہ فکر و تصور کے دھارے ہی تبدیل ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی نامساعد و تشکیب ربا حالات میں باہم برسر پیکار عربوں میں اخوت و محبت پیدا کر دی۔ وہ دوسروں کے لیے رحمت بن گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بھی دعویٰ کیا اسے سچا کر دکھایا۔ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

حکمت و بصیرت کے گوہر آبدار بانٹنے کا آغاز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شباب ہی میں ہو گیا تھا۔ عرب میں بد امنی اور انتشار کا دور دورہ تھا۔ قافلے لوٹ لیے جاتے تھے۔ غریبوں، کمزوروں اور زیر دستوں پر ظلم انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ مکہ مکرمہ کی فضا زیادہ دگرگوں تھی۔ جنگ فجار کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زبیر بن عبدالمطلب نے سرداران مکہ کو ابن عامر کے مسئلے کی بگڑتی ہوئی صورت حال سے سب کو آگاہ کیا اور ان کو عبد اللہ بن جدعان کے گھر پر جمع کیا۔

مباحث کے نتیجے میں علاقے میں قیام امن کے لیے حلف الفضول نامی ایک انجمن قائم کی۔ یہ ایک قسم کا اجتماعی معاہدہ تھا جس کے تحت برائی کے انسداد کی ذمہ داری ہر فرد پر عائد کی گئی۔ تنظیم میں بنو ہاشم، بنو عبدالمطلب، بنو اسعد، بنو زہرہ، اور بنو تمیم شامل تھے۔ اس کے اراکین درج ذیل حلف اٹھایا کرتے تھے:

۱۔ ہم ملک سے بد امنی دور کریں گے۔

۲۔ ہم مسافروں کی حفاظت کریں گے۔

۳۔ ہم غریبوں کی امداد کرتے رہیں گے۔

۴۔ ہم زبردست کو زبردست پر ظلم کرنے سے روکیں گے۔

ایک نوجوان کی حیثیت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس تنظیم میں شریک ہوئے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر بیس برس تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عمر تک پہنچتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی سوسائٹی میں اپنے اخلاق جمیلہ کی وجہ سے بہت نامور ہو چکے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت کے بعد بھی فرمایا کرتے تھے کہ ”اس معاہدہ کے مقابلے میں اگر مجھے سُرخ رنگ کے اونٹ بھی دیئے جائیں تو میں نہ بدلتا۔ آج بھی ایسے معاہدے کے لیے کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں۔“

رفعتوں کے اس سفیر کے خلق عظیم بننے کی ایک اور مثال ہمیں اُس وقت نظر آتی ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پینتیس برس کے ہوئے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کے دوران میں حجر اسود کی تنصیب پر نزاع پیدا ہو گیا۔ ہر قبیلہ اسے نصب کرنے میں اپنا حق مقدم خیال کرتا تھا۔ بات بڑھتی گئی اور تلواریں چلنے تک نوبت آ گئی۔ بالآخر ابوامیہ بن مغیرہ نام کے ایک معمر شخص نے رائے دی کہ کسی کو حکم مقرر کیا جائے۔ طے پایا کہ جو فرد علی الصبح پہلے پہل حرم میں داخل ہو وہ اس مناقشے کو جس طرح چاہے، حل کر دے۔ حسن اتفاق سے اگلی صبح سب سے پہلے کعبہ کی چار دیواری میں تشریف لانے والے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر سب پکار اٹھے ”ہذا الامین هذا محمد صلی اللہ علیہ وسلم (یہ تو الامین ہمارا محمد صلی اللہ علیہ وسلم آ گیا۔ ہم اس کے فیصلہ پر راضی)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی معاملہ فہمی اور زیر کی سے ایسی تدبیر کی کہ سب خوش ہوئے اور ایک سخت لڑائی رُک گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اکیلے ہی حجر اسود کو نصب کرنے کی بجائے اپنی چادر زمین پر بچھائی، اس پر حجر اسود رکھا اور تمام قبائل کے نمائندوں کو چادر کے کونے پکڑنے کو کہا۔ بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کو اٹھا کر اپنی جگہ پر نصب کر دیا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا فیصلہ تھا جو سب کے لیے قابل قبول تھا۔ اس طرح آقا نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت سے اہل مکہ کو درپیش ایک ہولناک لڑائی کا خطرہ ٹل گیا۔ اگر یہ لڑائی چھڑ جاتی تو نا معلوم کتنی نسلیں، کتنی صدیاں انتقام در انتقام کی آگ میں جلتی رہتیں۔ یہ تھا اس اجتماعی عدل کا مظاہرہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات کے فطری عدل کا آئینہ دار ہوا۔

اسلام دین فطرت ہے اور صلح و امن اور آشتی و سلامتی کا نقیب ہے۔ یہ جور و ظلم، جبر و استبداد اور تشدد و بربریت کا مخالف ہے۔ یہ ان امور کی شدت کے ساتھ مذمت کرتا ہے۔ حکمت و بصیرت کا اصل سرچشمہ حیات نبوت اور منہاج مقام رسالت ہے جسے قرآن حکیم نے ”الحکمة“ سے تعبیر کیا ہے: ۱

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ ط

”اور جس کو حکمت ملی، اُسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔“

اس طرح قرآن حکیم نے حکمت کو خیر کثیر سے تعبیر کیا ہے اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت حسنہ ہے۔ حکمت انسان کو حسین زندگی بسر کرنے کا ہنر سکھاتی ہے۔ یہاں یہ ذکر بر محل معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی قانون صفت میں دیانتداری و اخلاقیات اور فطری انصاف سے متعلق دیگر اقدار اسلام کے اصول قانون سے اخذ کی گئی ہیں، حالانکہ انگلستان میں 1780ء تک 350 مختلف جرائم میں سزائے موت تھی۔ 1814ء میں تین لڑکوں اور تین لڑکیوں (جن کی عمریں 8، 9، 11 سال تھیں) کو جوتوں کا جوڑا چرانے کی پاداش میں سزائے موت دی گئی۔ اس کے برعکس اسلام نے اپنے ہاں تمام غیر انسانی سزاؤں کو چودہ صدیاں قبل ہی یکسر موقوف کر دیا تھا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے: ۲

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ.

”وہی ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا جو انہیں اُس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگی سنوارتا ہے، اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فضائل کے لیے عمدہ تشبیہات اور رذائل کو قبیح مناظر اور قابل نفرت صورتوں میں پیش فرماتے تاکہ سننے والا بالطبع فضائل کی طرف مائل اور رذائل سے انحراف کرنے لگے۔ مثال کے طور پر نیکی کو اس طرح بیان فرمایا کہ کَمَثَلِ حَبَّةٍ - یہ نیکی ایک دانہ ہے۔ زمین سے ہر دانہ ایک بالی ہو کر اُگتا ہے اور ہر بال میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں۔ اس طرح نیکی کا ہر ایک دانہ سینکڑوں انعامات ربانی کا موجب بنتا ہے۔ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم اچھے کاموں کے اچھے اور برے کاموں کے بُرے نتیجہ کو نہایت فصاحت کے ساتھ بیان فرماتے تاکہ اچھے اخلاق کو اختیار اور بُرے کام کو ترک کرنے کا جذبہ اُبھرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ارشاد میں حکمت و بصیرت پنہاں ہے۔ ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اس کے پڑوسی کا رویہ اس کے ساتھ بے حد ناروا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنا سامان گھر سے نکال کر باہر راستے پر رکھ دے۔ آنے جانے والے پوچھیں تو بتاؤ کہ پڑوسی جینے نہیں دیتا اس لیے یہاں سے جا رہے ہیں۔ اس طرح اُس کا علاج ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب دو چار آدمیوں سے بات چیت ہوئی تو وہ پڑوسی اپنے گھر سے باہر آیا اور اُس کی منت سماجت کر کے اُسے واپس وہیں رہنے پر مجبور کیا۔ ساتھ ہی اس نے اپنا رویہ بھی درست کر لیا۔^۱

ایک موقع پر معلم انسانیت نے فرمایا کہ ”ظالم و مظلوم دونوں کی مدد کرو۔ استفسار پر فرمایا کہ مظلوم کو کسی ظالم کے مظالم سے چھڑانا اس کی مدد ہے اور ظالم کو ظلم سے روک کر اسے جہنم کی آگ سے بچانا اس کی مدد ہے۔“ انسانی فطرت تنوع پسند ہے اسی لیے اسلام نے دن بھر کی مصروفیات کو اس طرح تقسیم کیا ہے نماز فجر کے بعد ظہر تک مشغولیت رکھی۔ پھر عصر پر آ کر موقعہ دیا۔ اس کے بعد پھر مشغولیت نماز مغرب پر منقطع ہوئیں۔ بعد ازاں خانگی مصروفیات شروع ہوئیں اور عشاء پر جا کر اختتام ہوا۔ پھر استراحت کا وقت رکھا گیا ہے۔ اس طرح روحانی وقفہ سے جسم نئی صلاحیتوں اور جذبوں سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے سرور کائناتؐ کو مکارم اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز فرمایا اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: انما بعثت لاکرم اخلاق۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تعلیم میں سختی اور نرمی کے موقع و محل سے بخوبی آگاہ تھے اور اس پر عمل فرماتے تھے۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلہ نہیں لیا مگر یہ کہ کوئی شریعت کے حدود کو توڑے تو اس کی سزا دیتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اتباع کرنے والوں کے لیے نمونہ اور صبر کرنے والوں کے لیے ڈھارس ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ان کے لیے فتح و کامرانی ہے جو انہیں حجت بنا کر پیش کرے۔ ان کے لیے بہتر بہدف ہے جو ان کو دستور بنائے۔ محض خلوص، نیت اور حسن عمل کی ضرورت ہے۔ ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم ان تعلیمات پر تدبر کریں اور ان کی روشنی میں اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کا محاسبہ کریں اور اپنی اصلاح کریں۔ اسی لیے ارشاد ربانی ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

”در حقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے۔“

ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ کی تقلید کی سعادت سے ہی دنیا اور آخرت میں انتفاع و تمتع حاصل کر سکتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے: وَمَا اتَّكُمْ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ

”جو کچھ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں دے وہ لے لو۔“

اگر آج ہم نے تعلیمات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا لیا تو:

وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا

”جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔“

ورنہ خود ہم ناتواں اور عاجز ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گدا شیتم

کان ذات پاک مرتبہ دان محمد است

حوالہ جات

- ۱ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۲۹۳، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج ۱، ص ۱۲۱، علامہ شبلی نعمانی
- ۲ وہ نمائندے یہ ہیں:
- عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس بن عبد مناف، اسود بن مطلب بن اسد بن عبد العزیٰ بن قصی، ابو حذیفہ بن مغیرہ بن عمرو بن مخزوم، قیس بن عمرو بن مخزوم اور قیس بن عدی سہمی۔
- ۳ قرآن حکیم ۲: ۲۶۹
- ۴ قرآن حکیم ۲: ۶۲
- ۵ قرآن حکیم ۲: ۲۶۱
- ۶ بخاری، کتاب الادب المفرد، باب شکایت الجار، ابو داؤد کتاب الادب، باب حق الجوار
- ۷ قرآن حکیم ۲۱: ۳۳
- ۸ قرآن حکیم ۷: ۵۹
- ۹ قرآن حکیم ۷۱: ۳۳

اسلام کا نظام عدل، احسان اور برائیوں کا انسداد

قرآن حکیمؑ کی سورہ نحل کی آیت کریمہ ۹۰ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَايَ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ۔ اہم ترین اور کلیدی آیات میں سے ایک ہے کیونکہ اس میں مامورات و منہیات مذکورہ میں تمام اشیاء حسنہ و قبیحہ آگئی ہیں۔ اس میں تین احکام ایجابی ہیں یعنی عدل و احسان اور اہل قرابت کو عطا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور تین تحریمی احکام ہیں یعنی بے حیائی، بُرائی اور سرکشی سے منع کیا گیا ہے۔ یہ آیت تَبَيَّنَا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً (النحل: ۸۹) (کھلا بیان ہر چیز کا اور ہدایت و رحمت) کی بہترین مثال و نمونہ ہے۔ کوئی بات اچھی یا بُری ایسی نہیں جو اس میں شامل نہ ہو۔ اس آیت کی اسی جامعیت کے پیش نظر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عبدالعزیز نے اسے جمعۃ المبارک کے خطبہ کا جزو لاینفک بنا دیا۔ عکرمہ تابعی سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت دشمن اسلام ولید بن مغیرہ کو سنائی تو اس نے کہا یا ابن اخی اعد (میرے برادر زادے! ایک بھر پھر پڑھو) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مکرر پڑھا تو وہ منکر اللہ تعالیٰ اور رسول اور کتاب الہی بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔

والله ان له طلاوة وان عليه مطلاوة وان اصله لمورق و اعلاه لثمر
وما هو بقول البشر.

”بخدا یہ تو بڑی شیریں ہے۔ اس کا ظاہر بڑا رنگین ہے۔ اس کا تنا پتوں والا ہے
اور اس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہیں۔ بخدا یہ کسی بشر کا کلام نہیں۔“

عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن مسعود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم ہونے کے ناطے
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے شاہد اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت علم نواز سے
فیض یاب ہوتے رہتے تھے، فرماتے ہیں:

هذه اجمع آية في القران لخير تمثيل و لشر يجتنب.

”قرآن حکیم کی یہ آیت خیر و شر کے بیان کی جامع ہے۔“

رب ذوالجلال نے اس گنج شایگان میں انسان کو ایک نہایت ہی کامیاب زندگی بسر کرنے کا راز بتایا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو پوری کائنات کا نظام ہی عدل پر قائم ہے۔ تمام مظاہر قدرت نظام عدل سے ہی قائم ہیں۔ سب سے پہلے ہم عدل کے مفہوم کا جائزہ لیتے ہیں۔ لفظ عدل کا ذکر قرآن حکیم میں سولہ مرتبہ آیا ہے۔ عدل کی صفات میں نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا، مساوات عامہ، تجسس سے پاک، جرم ثابت کرنے سے قبل مجرم کا بے گناہ ہونا، حاکم و محکوم کا قانون کی نظر میں برابر ہونا، سزا کا جرم سے زائد نہ ہونا، نفاذ قانون سے قبل کیے گئے افعال کا قابل مواخذہ نہ ہونا، افراد کا باہمی محاسبہ ہونا، انصاف کا بلاتا خیر مہیا ہونا، توازن اور تعصب سے پاک ہونا شامل ہیں۔ عدل کے لغوی معنی درج ذیل ہیں:

سیدھا کرنا، برابر کرنا، توازن قائم رکھنا، افراد و تفریط سے بچنا۔ عدل کی اصطلاح از روئے اشتقاق اسم ذات اور اسم صفت دونوں طرح استعمال ہوتی ہے۔ اسم ذات کے طور پر عدل کے معنی دادرسی اور اسم صفت کے طور پر اس کے معنی مستقیم، منصفانہ اور متوازن کے ہیں۔ ۱۳۱ الماوردی کے ہاں عدل کی کیفیت یعنی عدالت کو اخلاق اور دینی کمال کی ایک حالت بتایا گیا ہے۔ ابن رشد کے نزدیک اس کی شرط یہ ہے کہ انسان کبار کا مرتکب نہ ہو اور صغار سے بھی اجتناب کرے۔

قانون کی تدوین کی ایک کوشش انیسویں صدی میں سلطنت عثمانیہ میں کی گئی۔ اس میں عدل کی حسب ذیل تعریف کی گئی:

عدل (عادل) وہ ہے جس میں خیر کے رجحانات شر کے رجحانات پر غالب ہوں۔ حضرت داتا گنج بخش کشف المحجوب میں عدل کے حسب ذیل معنی لکھتے ہیں:

”کسی چیز کو اس کے صحیح موقع محل میں رکھنا۔ اس کی ضد ظلم ہے جس کے معنی ہیں

کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا جو اس کے لائق نہ ہو۔“

مزید براں عدل سے مراد ہے: قوائے علمی و عملی میں اعتدال۔ التوسط فی الامور الاعتقادات و عملاً و خلقاً یعنی ”عقائد و اعمال و اخلاق کے مامورات میں اعتدال و توازن کا قائم کرنا۔“ اس طرح عقائد و اعمال و معاملات کے سارے ضمنی مامورات اس کے اندر آ گئے۔

حضرت سفیان ابن عیینہ نے فرمایا کہ یہاں عدل سے مراد ظاہر و باطن کی یک رنگی ہے۔ عدل کا ایک مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے حظ نفس پر اور اُس کی رضا جوئی کو اپنی خواہشات پر مقدم جانے اور اُس کے احکام کی تعمیل اور اس کی ممنوعات و محرّمات سے مکمل اجتناب کرے۔ مزید برآں انسان خود اپنے نفس کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے یعنی اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے بچائے جس میں اس کی جسمانی یا روحانی ہلاکت ہو۔ ایسی خواہشات کو پورا نہ کرے جو اُس کے لیے انجام کار مضر ہوں اور قناعت و صبر سے کام لے، نفس پر بلا وجہ زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔

گویا عدل کا مطلب یہ ہے کہ فرد کے تمام عقائد، اخلاق، معاملات، جذبات اور اعتدال و انصاف کی ترازو میں تلے ہوں۔ افراط و تفریط سے کوئی جھکنے یا اٹھنے نہ پائے۔ اُس وقت بھی اچھے کام کیے جائیں جب شاید عدل بھی سختی سے اس کا مطالبہ نہ کرتا ہو۔ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ کسی سے بُرائی نہ کی جائے نہ قولی، نہ فعلی، نہ ظاہری اور نہ باطنی۔ عدل تمام محاسن اعمال کی اصل ہے۔ اس کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے:

اولاً: لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور تناسب قائم کرنا۔

ثانیاً: ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقہ سے دینا۔

سید قطب شہید نے کیا خوبصورت اور دلنشین انداز میں بات کی ہے کہ ”جس عدل کو اسلام چاہتا ہے وہ بے لاگ عدل و انصاف ہے جو نہ تو محبت سے متاثر ہوتا ہے نہ عداوت سے، نہ مال و جاہ سے دیتا ہے اور نہ احکام سے۔“^۱

قرآن حکیم میں کئی ایک مقامات پر عدل کے متعلق تاکید فرمائی گئی ہے۔ چند ایک نمونے

ملاحظہ ہوں:

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ^۱

”اللہ تعالیٰ عدل کا حکم دیتا ہے۔“

۲۔ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ^۲

”اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔“

۳۔ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى^۳

”اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو۔“

۴۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ اَلَّا تَعْدِلُوْا ۗ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی. ۹
 ”کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔“

قرآن حکیم کی متذکرہ بالا سورہ نحل کی آیت میں معاشرتی عدل کے قیام کا حکم دیا گیا ہے۔ معاشرہ میں ہر نوع کے لوگ ہوتے ہیں: ہمسائے، احباب، رفقاء کار، دشمن و دوست، مسلمان اور غیر مسلم۔ اسلام سب سے عادلانہ سلوک کا خواہاں ہے۔ قرآن حکیم میں عدل کی بلند ترین صورت کو ”قسط“ بھی کہا گیا ہے اور یہ لفظ اپنی مختلف صورتوں میں تقریباً ۲۷ مقامات پر مذکور ہے۔ جیسے اِنَّ اللّٰهَ يَحِبُّ الْمَقْسِطِيْنَ (اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)۔ اسی طرح متعدد احادیث سے بھی عدل کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ چند ایک احادیث کے تراجم پیش ہیں:

۱۔ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ قریب مقام پانے والا شخص امام عادل ہوگا اور سب سے زیادہ مبغوض اور شدید ترین عذاب کا مستحق امام جائز ہوگا۔

۲۔ قیامت کے دن جب کہ اللہ کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا اللہ تعالیٰ ساٹھ اشخاص کو اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک امام عادل ہوگا۔

۳۔ وہ لوگ جو اپنے گھروں میں یا ان لوگوں میں جن کی حکومت انہیں سونپی گئی ہے، انصاف کرتے ہیں وہ نور کے میناروں پر ہوں گے۔

ہم عدل کی مختلف اقسام بیان کر سکتے ہیں:

(۱) انفرادی

(ب) اجتماعی

(۱) انفرادی عدل سے مراد کسی شخص کا میانہ روی اختیار کرنا ہے۔ اپنے نفس سے اعتدال کے ساتھ کام لینا، اُسے غیر معمولی تکلیف میں مبتلا نہ کرنا بھی عدل ہے۔ یہ منزل بڑی کٹھن ہے۔ اس کی رہنمائی قرآن حکیم میں اس طرح کی گئی ہے۔ ۱۱

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ ۗ شٰهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰی

أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ
بِهِمَا ۚ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ۚ وَإِنْ تَلَّوْا أَوْ تَعْرِفُوا فَإِنَّ اللَّهَ
كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو
اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا
تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ
مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ لہذا اپنی خواہش نفس کی
پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو
بچایا تو جان رکھو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔“

اس سے واضح ہوا کہ عدل کے معاملہ میں نفس، عزیزوں، قرابتداروں، دولت مندوں
اور محتاجوں کا لحاظ نہ کیا جائے، بلکہ سب کو برابر سمجھا جائے اور جو حق ہو وہی کہا جائے۔

(ب) اجتماعی عدل سے مراد وہ عدل ہے جو زندگی کے مختلف شعبوں میں مجموعی طور پر اختیار کیا
جاتا ہے۔ زندگی کے تمام مظاہر اور ہر طرح کی سرگرمیاں اس کے دائرہ میں داخل ہیں۔
وہ فکر اور عمل، ضمیر اور وجدان سب پر چھایا ہوا ہے۔^{۱۲}

اجتماعی عدل تین بنیادی اصولوں پر مبنی ہے:

- ۱۔ مطلق اور مکمل آزادی ضمیر
- ۲۔ کامل انسانی مساوات
- ۳۔ ٹھوس اور پائیدار اجتماعی تکافل

انسان کی اصل زندگی اجتماعی زندگی ہے اور ہر فرد کی بھلائی اس میں ہے کہ وہ اجتماعی
زندگی کے سنوارنے میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو صرف کر دے۔

عدل کی ابتدا عائلی زندگی سے ہوتی ہے۔ وہ گھر جنت کا نمونہ ہوتا ہے جس میں خاوند
بیوی اور والدین و اولاد ایک دوسرے کے باہمی حقوق عدل سے ادا کرتے ہوں۔ اگر کسی فرد کی
ایک سے زائد بیویاں ہوں تو ان کے درمیان عدل ایک ضروری امر ہے۔ بصورت دیگر خاندانی
انتشار ایک ناگزیر نتیجہ ہوگا۔ بچوں کے درمیان دشمنی اور والدین کے ساتھ نفرت اور بغض پیدا

ہونے کا احتمال ہے۔ ارشاد ربانی ہیں:

۱- وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَ
ثَلَاثَ وَرُبْعًا ۚ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۗ ذَٰلِكَ
أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا. ۳۳

”اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو
پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمہیں
اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو، یا ان
عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں۔ بے انصافی سے بچنے
کے لیے یہ زیادہ قرین صحاب ہے۔“

۲- وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَمْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمِيلِ
فَتَذَرُوهُنَّ كَالْمُعَلَّقَةِ ۗ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۳۴

”بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ تم چاہو بھی
تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ لہذا (قانون الہی کا منشا پورا کرنے کے لیے یہ کافی
ہے کہ) ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا چھوڑ
دو۔ اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنے
والا اور رحم فرمانے والا ہے۔“

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں فرمایا: ۳۵

عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا كانت
عند الرجل امراتان فلم يعدل بينهما جاء يوم القيامة وشقه ساقط.
”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا جب کسی شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں عدل نہیں کرتا تو
قیامت کے دن وہ ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کا نصف بدن خمیدہ ہوگا۔“
خود اپنے معاملہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل عدل کر کے سکھایا یہاں عدل سے
مراد یہ ہے کہ نان و نفقہ میں، حسن سلوک میں اور کفایت میں عدل کی سب اطراف سے مال،

جسمانی اور نفسیاتی..... سب کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ یہ پابندیاں ایک لحاظ سے اس کے لیے زیادہ شادیاں کرنے کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔

معاشرتی زندگی میں بھی عدل نہایت اہم ہے۔ باہمی تعلقات، لین دین، ناپ تول اور دیگر معاملات میں اگر عدل کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو معاشرہ میں اخلاق پستی رونما ہوتی ہے۔ اگر صحیح ناپ تول اور حسابات درست نہ ہوں تو تجارت تباہ ہو جائے گی۔ ارشاد الہی ہے: ^{۱۶}

وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ.

”اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو۔“

عدل کی اصطلاح میں معاشرتی اور معاشی عدل کا مفہوم بھی شامل کیا گیا ہے۔ اسلام ایک ایسے معاشی نظام کے قیام کا خواہاں ہے جس میں ہر انسان کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں۔ اسلامی تعلیمات معاشی برائیوں کے ارتکاب سے روکتی ہیں اور حصول معاش کے سلسلے میں اخلاقی بندھنوں کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اسلام ہر فرد کو باور کراتا ہے کہ کام کرنے میں عزت ہے۔ اسلام کے نزدیک نجی ذرائع آمدنی ایک امانت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسلام مسلمانوں پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے ناداروں اور غرباء پر خرچ کریں۔ باری تعالیٰ کا حکم ہے: ^{۱۷}

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ.

”اور ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لیے۔“

زکوٰۃ کا مقصد ارتکاز دولت کی حوصلہ شکنی اور دولت کی منصفانہ تقسیم ہے۔ قرآن حکیم میں متعدد جگہ ذخیرہ اندوزی اور حرام مال کے حصول کے طریقوں کی ممانعت کی گئی ہے۔ معاشی عدل کے قیام کے لیے ایسے دائمی اصول پیش کیے گئے ہیں جنہیں بروئے کار لا کر معاشرہ کی معاشی خرابیوں کو دور کیا جاسکتا ہے۔ معیشت خواہ حقیقی ہو یا زرعی، اسلام اہل ثروت پر بے سہارا افراد کی کفالت کی ذمہ داری عائد کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ریاست پر بھی فرض قرار دیتا ہے کہ وہ ایسے مادی وسائل اور اخلاقی نظام کو بروئے کار لائے جس سے معاشرہ کی معاشی خرابیوں کو دور کیا جاسکے۔ اسلام یتیموں کے حقوق کی حفاظت کا بھی حکم دیتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ^{۱۸}

وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ.

”اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ تمہیں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”حکومت اُس کی سرپرست ہے جس کا کوئی سرپرست نہ ہو۔“^{۱۹} خلفاء راشدین کے عہد میں مدینہ کی اسلامی ریاست نے ایک ایسا انقلابی نظام قائم کیا جس کی مثال دنیا میں کہیں بھی نہیں ملتی۔

عدل کی خاص طور پر ضرورت عدالتی معاملات میں ہوتی ہے کیونکہ اس جگہ حق و باطل، جائز و ناجائز اور صحیح و غلط میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ اسلام نے ہر قسم کے مذہبی اور عدالتی فیصلوں کے لیے عدل کو لازمی قرار دیا ہے اور اس سلسلہ میں رنگ و نسل، قبیلہ و خاندان، آزاد و غلام، مرد و عورت، امیر و غریب اور دین و مذہب میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔ ارشادِ باری ہے:^{۲۰}

وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ.

”اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔“

اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو میں عدل کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ جیسے فرمایا گیا ہے:^{۲۱}

وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ.

”فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے۔“

اسلامی تعلیمات کی رو سے ایک منصف میں درج ذیل اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے:

- ۱۔ اسلام
 - ۲۔ عقل و بلاغت (احناف کے نزدیک عورت بھی منصف بن سکتی ہے)
 - ۳۔ عدالت و تقویٰ
 - ۴۔ علمیت
 - ۵۔ صحت و تندرستی
 - ۶۔ نفسیات انسانی سے کما حقہ، واقفیت
- نیز منصف پر لازم ہے کہ وہ لوگوں سے ہدیے اور تحائف قبول نہ کرے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:^{۲۲}

هدایا العمال غلول یعنی حاکموں کو دیئے جانے ہدیے خیانت ہیں۔

آپ کی پوری زندگی عدل سے عبارت ہے۔ اپنے تو اپنے رہے، غیروں کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل و انصاف پر حد درجہ اعتماد تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ مقدمہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ یہود کے حق میں اور کسی مسلمان کے خلاف صادر ہوا۔ غزوہ فتح مکہ میں قبیلہ مخزوم کی ایک خاتون (فاطمہ بنت اسود) زیور کی چوری کی مرتکب ہوئی۔ قریش کی عزت کو دھبہ سے بچانے کے لیے لوگوں نے اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شفیع بنا کر بھیجا وہ کامیاب نہ ہوئے، اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بہت زیادہ چاہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ^{۲۳}

”تم سے پہلی امتیں اسی لیے ملیا میٹ ہو گئیں کہ وہ بڑوں کے جرائم معاف کر دیتی تھیں اور چھوٹوں کو سزا دیتیں۔ خدا کی قسم! اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی یہ سرقہ کرتی تو میں یہی سزا دیتا۔“

چنانچہ مجرمہ کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ یہ اس لیے کہ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہیں:

۱۔ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ. ^{۲۴}

”اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو۔“

۲۔ وَالسَّارِقِ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا. ^{۲۵}

”اور چور خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔“

کہا اس نظام کی نظیر تاریخ میں کہیں مل سکتی ہے؟ ہاتھ کٹ جانے کے بعد اس عورت کی حالت اچھی ہو گئی اور وہ شادی کر کے باعزت زندگی بسر کرنے لگی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: ”پھر اس کو اگر کوئی ضرورت پیش آتی تو وہ مجھ سے کہتی اور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ کر اس کی وہ حاجت پوری کر دیتی۔“ ^{۲۶}

عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ غزوہ حنین میں ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاؤں میں ایک بھاری اور مضبوط جوتا تھا۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ اس لیے ان کے جوتے سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی پنڈلی کو چوٹ آئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پاؤں پر کوڑا مارا۔ دوسرے روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور فرمایا کہ وہ اس

مار کا عوض لے لے۔ چنانچہ اس کوڑے کے عوض ان کو اسی بھیڑ میں عطا ہوئیں۔^{۲۷}
 مرض الموت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع عام میں اعلان کیا کہ اگر میرے ذمہ کسی
 کا قرض آتا ہو، اگر میں نے کسی جان و مال یا آبرو کو صدمہ پہنچایا ہو تو میری جان و مال اور آبرو
 حاضر ہے۔ اس دنیا میں انتقام لے لے۔ مجمع میں سناٹا تھا۔ صرف ایک شخص نے چند درہم کے
 لیے کھڑے ہو کر دعویٰ کیا جو اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً دلوادئے۔^{۲۸}

عدل نام ہے ایک پابندی کا جو آپ کی آزادی کی ایک حد مقرر کرتا ہے۔ قیام عدل کی
 شرائط میں شرعی حدود کا علم، حرص سے گریز اور راست گوئی اور آخری ضمانت صرف خشیت الہی
 ہے۔ غیر مشروط عدل قائم رکھنا ہی کلمۃ اللہ ہے جس کا ہر حال میں ہر جگہ سر بلند رہنا ضروری
 ہے۔ اسلامی عدل محض مجرد نظریات تک ہی محدود نہیں بلکہ علمی زندگی میں بھی اس نے نفوذ کیا اور
 تاریخ کے اوراق پر اس کی ان گنت مثالیں رقم ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عدل
 آج تک ضرب المثل ہے۔ ان کے صاحبزادے عبدالرحمن نے اپنے قیام مصر کے دوران میں
 ایک دفعہ نبیذ پی لی اور ان پر نشہ طاری ہو گیا۔ چونکہ گورنر مصر عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ
 عنہ نے ان کو تخیلہ میں ان کے اصرار پر سزا دی تھی، عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عمرو بن
 العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ڈانٹ پلانے کے علاوہ عبدالرحمن کو مدینہ بلا کر دوبارہ حد لگوا دی۔
 آپ کا لخت جگر کوڑوں کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گیا یہاں تک کہ اس کی روح قفسِ عنصری
 سے پرواز کر گئی۔ کوڑے ابھی باقی تھے جو اس کی قبر پر لگوائے گئے۔

ایک دفعہ ایک شخص عورتوں کے ساتھ خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا۔ عمر فاروق رضی اللہ
 تعالیٰ عنہ نے اسے درے لگوائے کیونکہ آپ نے عورتوں کے طواف کا ایک وقت مخصوص کر رکھا
 تھا۔ کوڑا لگنے کے بعد اس شخص نے کہا: ”خدا کی قسم! یہ جرات مندی کا کوئی اچھا مظاہرہ نہیں۔
 اگر میں نے غلطی کی تھی تو آپ نے بہتر طریقے پر میری فہمائش نہیں کی۔ اور اگر میں نے غلطی
 نہیں کی تو آپ نے مجھ پر ظلم کیا۔“ یہ سننا تھا کہ آپ نے درہ اس کے ہاتھ میں دے دیا لیکن وہ
 شخص بدلہ لینے پر آمادہ نہ ہوا۔ رات کو اس نے اپنا بدلہ پورا کیا۔ دوسرے روز جب اُس کی نظر
 آپ کے چہرے پر پڑی اور اس پر چوٹ کے نشان دیکھے تو کہا: ”غالباً یہ نشان کل کی چوٹ کے
 ہیں۔“ عدل کے پیکر عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا: ”ہاں“

اسی طرح عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے عظیم الشان جرنیل کے قصر کوفہ کی ڈیوڑھی مسمار کرنے کا حکم دیا کیونکہ یہ حاکم و محکوم کے درمیان انصاف کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو گئی تھی۔ عدل کا یہی تقاضا تھا کہ معمولی سے معمولی شخص بھی بھری محفل میں اٹھ کر ان کو خدا سے ڈرائے، اس پر وہ خوف و خشیت کی شدت سے برگ حشیش کی طرح کانپ جاتے۔ اس جلیل القدر سربراہ ریاست کو چشم فلک نے دیکھا کہ جب آپ کی سواری بیت المقدس میں داخل ہو رہی تھی تو سواری کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی اور سوار ان کا غلام اسلم تھا جس کی سواری کی باری اس مقام پر آ گئی تھی۔

عدل صرف انتظام سلطنت کے لیے نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں لازمی ہے۔ دنیوی معاملات میں عام طور پر انسان کو جب شہادت یا گواہی دینے کا موقع آتا ہے تو دونوں حالتوں میں اکثر کایمان ڈگمگاتا ہے۔ ایک اُس وقت جب کہ فریق مقدمہ اپنا قرا بتدار ہو یا اس سے گواہ یا حاکم کی عداوت ہو۔ قرآن حکیم ان دونوں حالتوں میں عدل کا حکم دیتا ہے۔

۱۔ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۚ

”اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو۔“

اسلام نے غیر مسلموں تک کے ساتھ بھی عدل کی سخت تاکید فرمائی ہے:

۲۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۚ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ ۤأَلَّا تَعْدِلُوا ۚ

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور

انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے

کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو۔“

یہود و نصاریٰ اسلام کے کھلے دشمن تھے۔ اس پر بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ مِمَّا آتَانَا مِنَ الْقُرْآنِ وَلَمْ نَكُنْ لَكُمْ بِشَاهِدِينَ ۚ

”اور ان سے کہہ دو کہ اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان

لایا۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔“

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

وَإِنْ حَكَمْتَ فَأَحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ ۗ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝
 ”اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

اسلام جہاں عدل سے ہٹنے والے فرد کے خلاف کارروائی کا حکم دیتا ہے وہیں ظالم و بے رحم معاشرے، گروہ اور حکومت کے خلاف بھی کارروائی کا حکم دیتا ہے تاکہ حقیقی عدل قائم ہو سکے۔ ارشاد ربانی ہے: ۲۳

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ
 وَالنِّسَاءِ وَالْوَالِدِينَ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ
 أَهْلُهَا ۗ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۗ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ
 نَصِيرًا ۝

”آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کرتے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔“
 پھر فرمایا: ۲۴

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۗ فَإِنْ بَغَتْ
 إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ ۗ
 فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ
 الْمُقْسِطِينَ ۝

”اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کراؤ اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

قرآنی تعلیمات کی روشنی میں عدل کے درج ذیل ثمرات حاصل ہونے یقینی ہیں:
مساوات، امن و امان، ظلم و تشدد سے نجات، استحکام حکومت، عزت و وقار، اقتصادی
ترقی اور سب سے بڑھ کر آخرت میں سرفرازی۔

دوسری چیز احسان ہے جس سے یہاں مقصود حسن عمل ہے۔ لفظ احسان کا ذکر قرآن حکیم
میں بارہ مرتبہ کیا گیا ہے۔ احسان کا دائرہ وسیع ہے۔ اس کا جتنا تعلق معاشرت سے ہے، اتنا ہی
معیشت سے۔ جتنا تعلق معاملات سے ہے، اتنا ہی عبادت سے۔ احسان اور ایثار ذی القربی
قرب الہی کی دو سیڑھیاں ہیں۔ امام راغبؒ نے احسان اور عدل کے فرق کی اس طرح
صراحت کی ہے:

”احسان تو عدل سے افضل اور بڑھ کر ہے کیونکہ عدل کے معنی ہیں دوسرے کا حق پورا
کرنا۔ لیکن احسان یہ ہے کہ دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دیا جائے اور اپنے حق سے کم لیا
جائے۔“

احسان کرتے وقت نظر تعدیل اور تسوید دونوں پر ہوتی ہے اور یہ دونوں حسن کی اساسی
اقدار ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ میں اسی اصل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالی مرتوم ہے: ^{۳۵}

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ.

”تو اپنے رب کی اس طرح عبادت کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر مراقبہ کی

یہ کیفیت نہ پیدا ہو سکے تو کم از کم یہ یقین کر لو کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔“

مشکوٰۃ المصابیح کی کتاب الایمان کا افتتاح اسی حدیث جبرئیل سے ہوا ہے۔ جبرئیل
انسانی شکل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کچھ سوالات کیے۔ ان میں ایک سوال
یہ بھی تھا کہ احسان کیا ہے؟“ جس کا جواب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں دیا تھا۔
علامہ قرطبی کی رائے ہے کہ ارباب قلوب میں سے اعلیٰ درجہ کے لوگ عبادت کرتے وقت
کانک تراہ کے مقام پر فائز ہوتے ہیں اور بعض کی رسائی اس مقام تک نہیں ہوتی لیکن فانہ
براک کی لذتوں سے وہ محظوظ ہوتے ہیں۔

گویا احسان یہ ہے کہ باطن کی صفائی ظاہر سے بھی زیادہ ہو۔ عدل اگر معاشرے کی

ناگوار یوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوشگواریاں اور شیرنیاں پیدا کرتا ہے۔
اللہ تعالیٰ عادل بھی ہے اور محسن بھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جا بجا عدل کے
ساتھ احسان کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ احسان میں دوسروں کی زندگیوں کو حسین و خوشحال
بنانے کا مفہوم مضمحل ہے۔ ارشاد الہی ہے: ^{۳۶}

وَ أَحْسِنَ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ.

”اور احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے۔“

احسان کے معنی یہ ہیں کہ انسان بذات خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا
چاہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ^{۳۷}

هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ.

”نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟“

بھلا کمال اطاعت کا بدلہ بجز کمال عنایت کے کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟

یہ دونوں خصلتیں یعنی عدل و احسان تو اپنے نفس اور ہر ایک خویش و بیگانہ اور دوست
دشمن کے متعلق یقین لیکن اقارب کا حق اجانب سے کچھ زیادہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم عیش و عشرت
کرتے رہو اور تمہارا کوئی رشتہ دار نان شبینہ تک کا محتاج ہو۔ قرآن حکیم میں سب سے پہلے
والدین کے ساتھ احسان کا حکم دیا گیا ہے۔ چند ایک آیات ملاحظہ ہوں:

۱۔ وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا. ^{۳۸}

”اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ اور والدین
کے ساتھ احسان کرو۔“

۲۔ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا. ^{۳۹}

”ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک
کرے۔“

۳۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۖ إِذَا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَيْهِمَا فَلَا تَقُلْ

لَهُمَا أَوْفٍ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جُنَاحَ الذُّلِّ

مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْتَنِي صَغِيرًا ۝ ^{۴۰}

”والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو۔ اور دعا کیا کرو کہ ”پروردگار، ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔“

احادیث میں بھی والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔ والدین میں سے ماں کا حق فائق ہے۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک نفل نماز سے مقدم ہے۔^{۴۱} مشرک والدین بھی حسن سلوک کے مستحق ہیں۔ والدین کی وفات کے بعد ان کے احباب سے حسن سلوک ضروری ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا واقعہ ہے کہ حج کے ایک سفر کے دوران میں انہوں نے اپنے والد کے ایک بد دوست کے ساتھ عمدہ سلوک کیا جس پر لوگوں کو بڑی حیرانی ہوئی۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے احسان سے مراد الاخلاص فی التوحید یعنی خالص اور ستھری توحید مراد لی ہے۔^{۴۲} امام راغب رحمۃ اللہ علیہ نے احسان کی دو اقسام بیان کی ہیں:

- ۱۔ دوسروں پر انعام کرنا (اور اس طرح اسے خوش کرنا)
- ۲۔ اپنے کاموں میں (اقوال و افعال) میں حسن پیدا کرنا۔ یہ چیز حسن علم اور حسن عمل سے پیدا ہوتی ہے۔

احسان صرف مالی امداد سے ہی متعلق نہیں بلکہ ہر قسم کی امداد، خواہ وہ زبانی ہو یا عملی، احسان کی فہرست میں آتی ہے۔ احسان کرنے کے دوسرے کا دل موہ لیا جاتا ہے اور کینہ و بغض کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں۔ انسانی طبیعت کے لیے احسان جتانے سے بڑھ کر گراں گذرنے والا، تلخ، رسوا کن اور قبول احسان سے روکنے والی دوسری کوئی چیز نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے سخت ناپسندیدگی سے دیکھا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:^{۴۳}

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنْفِقُ
مَالَهُ رِثَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانَ
عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا

”اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اُس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو، جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔ اُس کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان تھی جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا۔“

اس کے علاوہ مقروض کو مہلت دینا، ^{۴۴} قصور والوں کے قصور معاف کر دینا ^{۴۵} اور ان کے مقابلہ میں غصہ کو پی جانا بھی احسان ہی میں شامل ہے۔ ارشادِ باری ہے: ^{۴۶}

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكُظُمِينَ الْغَيْظِ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝

”جو (خدا ترس) ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بد حال ہوں یا خوش حال، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔“

بڑے ہی عجیب انداز میں نفسیاتی طور پر عفو و درگزر کی ترغیب دی گئی ہے۔ ^{۴۷}

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ط اَلَا تُحِبُّونَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

”انہیں معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کرنا چاہیے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے۔“

ایک دفعہ آپ سے ایک شخص نے پوچھا: ”یا رسول اللہ! میں ایک شخص کے پاس سے گذرتا ہوں تو وہ میری مہمانی نہیں کرتا۔ جب وہ میرے پاس آئے تو کیا میں بھی اس کی کج خلقی کا یہی بدلہ دوں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں تم اس کی مہمانی کرو۔“ ^{۴۸} سغزوہ بدر میں جو قیدی سمنانوں کے ہاتھ آئے وہ اسلام کے کٹر دشمن تھے۔ کچھ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ان کو قتل کرنے کی تجویز پیش کی لیکن محسن انسانیت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے ساتھ

احسان فرمایا اور اپنے حسن سلوک سے سب کی جان بخش دی۔ اسی طرح آپ نے فتح مکہ کے موقع پر اپنے تمام دشمنوں کو معاف فرما دیا۔ یہ ایسے دشمن تھے کہ جن کے ظلم و ستم سے بے بس اور نہتے مسلمانوں کا خون زمین پر گرا۔ اس سے بڑھ کر احسان کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ہوازن کا مال غنیمت آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے ”مولفتہ القلوب“ کو دیا۔ ابوسفیان سمیت قریش کے دیگر سرداروں پر داد و دہش کی ایسی بارش فرمائی کہ تاریخ ایسی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ غزوہ حنین میں عورتوں اور بچوں سمیت کوئی چھ ہزار کافر اسیر ہوئے۔ ان کو بغیر کسی شرط اور جرمانہ کے نہ صرف آزاد کیا بلکہ بہت سے قیدیوں کو انعام و اکرام سے نوازا۔ مالک بن عوف جو کفار کے لشکر کی تجارت کر رہا تھا اس کا نہ صرف تمام مال و اسباب واپس کیا بلکہ اپنی طرف سے اس کو سواونٹ مزید عطا کیے۔

اسلام نے انتہائی غصہ اور اضطراب میں بھی احسان کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر میاں بیوی کے درمیان تنازعہ انتہائی صورت اختیار کرے اور نتیجہ طلاق کی صورت میں نکلے تو بھی احسان کا حکم دیا گیا ہے۔^{۴۹}

الطَّلَاقُ مَوْتَانِ ۖ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ ۗ^ط
 ”طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے۔“

اگر منکوحہ عورت سے خلوت کے بغیر طلاق ہو گئی ہو تو شوہر پر نصف مہر واجب ہوگا۔ یہ قانون یا عدل ہے۔ مگر اخلاقی حکم یا احسان یہ ہے کہ عورت اس نصف کو بھی معاف کر دے یا شوہر پورا مہر ادا کر دے۔^{۵۰}

وَ اِنْ طَلَقْتُمْوهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لِهِنَّ فَرِيْضَةً
 فَنِيْصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّا اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَّعْفُوَ الَّذِيْ بِيْدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۗ^ط
 وَ اَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۗ وَلَا تَنْسُوْا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۗ^ط

”اور اگر تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی ہو لیکن مہر مقرر کیا جا چکا ہو تو اس صورت میں نصف مہر دینا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ عورت نرمی برتے اور مہر نہ لے (یا وہ مرد، جس کے اختیار میں عقد نکاح ہے، نرمی سے کام لے) اور پورا

مہر دے دے) اور تم (یعنی مرد) نرمی سے کام لو تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو۔“

احسان کی صورت یہ بھی ہے کہ قرضہ داروں کا بوجھ ہلکا کیا جائے۔ تنگ دستوں اور مقروضوں کو مہلت دیں کہ جو لوگ قرض ادا کرنے کے قابل نہ ہوں ان کا قرضہ معاف کر دیا جائے۔ اسلام نے احسان اور نیکی کرنے کو صرف مسلمانوں کی حد تک ہی محدود نہیں کیا بلکہ دوست، دشمن، مسلم اور کافر کے ساتھ بھی احسان کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہاں قرآن حکیم نے احسان کے لیے تیرہ کالفظ استعمال کیا ہے۔^{۵۱}

لَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الدِّينِ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝

”اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

زندگی تو زندگی موت کے معاملہ میں بھی احسان کے دائرہ کو وسیع رکھا گیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:^{۵۲}

”جب تم کسی کوراہ خدا میں قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو اور جب تم کوئی جانور ذبح کرو تو اُسے اچھے طریقے سے ذبح کرو۔ اور تم میں سے کوئی آدمی ذبح کرنے سے پہلے اپنی چھری کو تیز کرے اور اپنے ذبح کو راحت دے۔“

ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ بکری کو گرا کر اُسے ذبح کرنے کے لیے چھری تیز کر رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم اسے مرنے سے پہلے مار دینا چاہتے ہو۔“

اسلام نے اگر احسان کرنے والوں پر کچھ اخلاقی پابندیاں عائد کی ہیں تو اُس کے علی الرغم ان لوگوں پر کچھ پابندیاں عائد کی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر صدیق رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کا احسان مانتے ہوئے فرمایا: ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے احسان کا بدلہ اللہ ہی قیامت کو دے گا۔ اسی طرح اسلام میں احسان یاد رکھنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری ہے: ۵۴

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرُوْا نِعْمَتِيْ الَّتِيْ اٰنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْ
اَوْفٍ بِعَهْدِكُمْ ۗ وَاِيَّايَ فَاَرْهَبُوْنَ ۝

”اے بنی اسرائیل! ذرا خیال کرو میری اس نعمت کا جو میں نے تم کو عطا کی تھی۔

میرے ساتھ تمہارا جو عہد تھا اسے تم پورا کرو، تو میرا جو عہد تمہارے ساتھ تھا

اسے میں پورا کروں اور مجھ ہی سے تم ڈرو۔“

ان مباحث سے یہ اندازہ ہوا کہ کسی معاشرے کا صحت مند بنیادوں پر قائم ہونا عدل اور احسان پر موقوف ہے۔ عدل اگر معاشرے کی اساس ہے تو احسان اس کا جمال اور کمال ہے۔ عدل قانون کا تقاضا ہے اور احسان اخلاق کا مطالبہ۔ عدل اگر معاشرے کی ناگوار یوں اور تلخیوں کے آگے ایک ڈھال ہے تو احسان اس معاشرے میں شیر میناں گھولتا ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں خلوص و محبت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ کل کیسی بلندیاں تھیں اور آج کیسی پستیاں ہیں۔ انسان کی حیوانی خواہشات کو بے لگام چھوڑ دینے کے نتائج ابا حیت اور سلبیت کی شکل میں نمودار ہو رہے ہیں۔ اخوت کی جگہ خود پسندی اور نسلی تفاخر اور ایثار و احسان کی جگہ حرص، لالچ اور بخل نے لے لی ہے۔ یہ عمرانی امراض ملت کو نحیف و نزار اور مفلوج کر دیتے ہیں اور ہلاکت و بربادی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

اس آیت کریمہ میں فحشا، منکر اور بخی سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس طرح نواہی کے سارے مقاصد پورے کر دیئے گئے ہیں۔ فواحش کے مفہوم میں وہ سب بری باتیں اور بے حیائی کے کام بھی شامل ہیں جو ظاہر ہیں اور وہ بھی جو پوشیدہ ہیں۔ ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیہ ہو، فحش ہے۔ اسی طرح علی الاعلان برے کام کرنا اور برائیوں کو پھیلانا بھی فحش ہے۔ منکر سے مراد ہر وہ برائی ہے جسے انسان بالعموم برا جانتے ہیں۔ ہمیشہ سے برا کہتے ہیں اور تمام شرائع الہیہ نے جس سے منع کیا ہے۔ اس میں ہر قسم کی برائی، بد کرداری، بے راہ روی، بدنظمی، جرم و عصیاں اور لاقانونیت شامل ہے۔ منکر معروف کی ضد ہے یعنی نامعقول کام جن پر فطرت سلیمہ اور عقل صحیح انکار کرے اور بخی سرکشی کر کے حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست

درازی کرنا خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد۔ قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے: ۵۵
 خَصْمِنِ بَغْيٍ بَعْضُنَا عَلَى بَعْضٍ یعنی ”ہم دو فریق مقدمہ میں جن میں سے ایک نے
 دوسرے پر زیادتی کی ہے۔“

بغی کے لفظی معانی تو طلب کے ہیں پھر اس میں حد سے ”بڑھنے کی خواہش“ اور کوشش
 بغی عملاً حد سے تجاوز کر جانے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ بغی کا ترجمہ ”سرکشی، ظلم اور ظلم و زیادتی اور
 درندوں کی طرح دوسروں کو چیرنے پھاڑنے کے اس یعنی اس ”بارش“ کو بھی کہتے ہیں جو حد
 سے زیادہ برس جائے اور کھیتوں کو تباہ کر دے اور حق واجب میں کمی رکھنے کو بھی بغی کہتے ہیں اور
 یا حق واجب سے افروزی کرنا بھی بغی ہے۔“

فحاشی اہل حسن نظر کے لیے سوہان روح ہے اور قلب و نظر کی موت ہے۔ بے شرمی اور
 بے حیائی کے پانی سے سب کے بدن بھگے اور عریاں نظر آتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے:

۱۔ وَلَا تَقْرُبُوا لِفَوَاحِشٍ مَّا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطْنٌ ۵۶

”اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی۔“

۲۔ قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّي الْفَوَاحِشَ مَّا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطْنٌ ۵۷

”اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی

ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرمی کے کام..... خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے۔“

فحاشی کی ایک بدترین قسم زنا ہے جو بے حد خطرناک و گمراہ کن راستہ ہے اور یہ فرد و قوم کو
 ہلاکت و بربادی کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے حیا اور وقار کا حکم دیا ہے اور اظہار
 جمال اور آوارگی سے روکا ہے۔

ارشاد ربانی ہے: ۵۸

وَلَا تَقْرُبُوا الزِّنَىٰ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ۵۸

”زنا کے قریب نہ پھلکو۔ وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ۔“

جو انسان نیکی کے حصول کے لیے کوشش کرنا چاہے اُسے پہلے عدل کا مقام اپنے اندر

پیدا کرنا چاہیے، پھر احسان کا اور پھر ایتا ذی القربیٰ کا۔ اسی طرح جو بدیوں سے بچنا چاہتا ہے۔

اسے پہلے بغی سے بچنا چاہیے پھر منکر سے بچنے کے قابل ہو سکے گا۔ منکر سے بچنے کی جدوجہد

کے بعد وہ فحشاء سے بچنے کے قابل ہوگا۔

حسد ایک نہایت مذموم خصلت ہے۔ اسلام نے اس سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ۵۹

لَا تَبَاغَضُوا وَلَا تَحْسَدُوا وَلَا تَدَابَرُوا وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا.

”ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو۔ باہم حسد مت کرو اور ایک دوسرے سے

روگردانی مت کرو۔ اے خدا کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔“

ایک اور مقام پر فرمایا: ”تم حسد سے دور بھاگو کیونکہ حسد بھلائیوں کو اس طرح بھسم کر

دیتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔“

غیبت ایک نہایت ہی مذموم خصلت ہے جو انسان کو ذلیل و رسوا اور اس کے اعمال کو تباہ

و برباد کر دیتی ہے۔ بد قسمتی سے یہ تمدن و معاشرت کا ایک جزو بن گئی ہے اور اسے برا بھی خیال

نہیں کیا جاتا۔ بدگمانی، تجسس یا عیب جوئی اور غیبت گھناؤنی برائیاں ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے: ۶۰

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا

تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبَ بَعْضُكُم بَعْضًا أَيَحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ

أَخِيهِ مَيْتًا فَكِرْهُتُمْوهُ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۗ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ۝

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان

گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا

تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے

گا۔ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو۔ اللہ بڑا توبہ قبول کرنے

والا اور رحیم ہے۔“

ایک مشہور قول ہے کہ تلوار کا زخم تو بھر جاتا ہے مگر زبان کا زخم نہیں بھرتا۔ زبان امرت بھی

ہے اور زہر بھی۔ یہ راحت دل و جان کا باعث بھی بنتی ہے اور کئی افراد اور خاندانوں کی ہلاکت کا

سامان بھی پیدا کرتی ہے۔ عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضور نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

”نجات کا ذریعہ کیا ہے؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اپنی زبان کو قابو میں

رکھ، اپنے گھر میں پڑے رہو اور اپنے گناہوں پر روؤ۔“

جو لوگ بے گناہ عورتوں کی عزت و آبرو پر حرف رکھتے ہیں ان کی سزا اللہ تعالیٰ نے اسی کوڑے مقرر کی ہے۔^{۶۲}

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ
ثَمِينًا جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝
”اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں،
ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو اور وہ خود ہی فاسق
ہیں۔“

یہ سزا اس لیے رکھی گئی ہے کہ تہمت درازی کا یہ جرم نیک نامی اور آبرو پر حملہ، بے جا اور
بغض و عناد کی جڑ ہونے کے باعث زنا کے ہم پلہ ہے۔ مزید براں اس کے چرچے سے فحاشی
اور زیادہ پھیلتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کی بے جا مدح اور خوشامد سے باز رہنے کی تلقین فرمائی
ہے۔ فرمایا: ”مداحی کرنے والوں سے ملو تو ان کے منہ میں خاک جھونک دو۔“^{۶۳} اس سے
مدوح یہ خیال کرتا ہے کہ وہ واقعی ایسا ہی ہے۔ پھر وہ ہر شخص سے ایسی ہی توقع کرتا ہے۔ نتیجہ یہ
نکلے گا کہ اس کے مغرور ہونے سے اُس کا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا۔

تکبر کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے حق بندگی کو ادا نہ کرنا اور اُس کے بندوں کو حقیر گردانا۔
بالفاظ دیگر حق و صداقت کی توہین و ابطال کرنا اور لوگوں کی تحقیر و تذلیل کرنا۔ اس کے کئی ایک
اسباب ہیں:

حسب و نسب، حسن و جمال، مال و دولت، عہدہ و منصب، قوت و طاقت وغیرہ۔ یہ ایک
برا فعل اور تمام مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ یہ انسان میں فرعونیت اور
قارونیت پیدا کرتا ہے اور اس طرح اسے اس کے مقام عبدیت سے گرا کر اسفل السافلین میں
پہنچا دیتا ہے۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دفعہ دوران خطبہ میں فرمایا:^{۶۴}

”اے لوگو! تواضع یا انکساری اختیار کرو۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ
جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی خاطر تواضع اختیار کرے، اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ بلند کر

دیتا ہے۔ وہ اپنی نظر میں حقیر ہوتا ہے اور لوگوں کی آنکھوں میں عظیم۔ اور جو شخص تکبر و غرور کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے نظروں سے گرا دیتا ہے۔ اس طرح وہ لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل و خوار ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو بڑا خیال کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ ان کے نزدیک کتے اور سور سے ذلیل تر ہو جاتا ہے۔“

بسا اوقات ایک عمل بطور خود احسن ہوتا ہے لیکن مقصد درست نہیں ہوتا، نیت نیک نہیں ہوتی اور اخلاص نہیں ہوتا۔ لیکن اگر نیت ریا کاری ہو تو ان افعال کی بجا آوری محض ترضیح اوقات ہے۔

عصر حاضر میں دولت کی محبت اور معیار زندگی کے خبط نے لوگوں کا ذہنی سکون چھین لیا ہے۔ یہ بخل کا بھی باعث بنتی ہے۔ جو انسان کے دل میں فسادات پیدا کرتا ہے۔ نتیجتاً اس میں ایثار و قربانی، اخوت اور عدل و احسان کے جذبات کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ بخیل اپنے بیگانوں سب کے ساتھ احسان تو کیا عدل کرنے سے بھی باز رہتا ہے۔ دوسری طرف دولت مند زندگی کے مختلف شعبوں میں بڑھ چڑھ کر اپنے ٹھاٹھ دکھاتے ہیں۔ ان میں سے ایک شادی بیاہ بھی ہے۔ یہ رجحان غریب اور متوسط طبقے کے لیے جان کا آزار بن جاتا ہے۔ بعض دفعہ تو ضرورت مند افراد دولت کے حصول کے لیے ناجائز ذرائع اختیار کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اسلام وسیع معاشی تفاوت کو پسند نہیں کرتا۔ ایک طبقے کے بے دریغ اسراف و ضیاع کی وجہ سے معاشرے کی بنیادیں ہل جاتی ہیں اور اس بے جا امتیاز، حق تلفی، اور سنگدلی سے قلب و ضمیر آلودہ ہو جاتے ہیں۔

اسلام نے ذخیرہ اندوزی کو حرام ٹھہرایا ہے جس کا ہمارے معاشرے میں عام رجحان ہے۔ انسان حصول زر کے لیے ملاوٹ کرتا ہے اور اس طرح انسانی جانوں کا قاتل بن رہا ہے۔ عقلی و ذہنی قوت کی بے اعتدالی کا نام ظلم ہے۔ قرآن حکیم میں ظالمین کا لفظ بکثرت آیا ہے جس کے معنی ہیں: قانون شکنی، حدود فراموشی، دوسروں کی ملکیت پر ناجائز تصرف کرنے والا یا دوسروں کو زندگی کی نعمتوں سے محروم رکھنا وغیرہ۔ ظلم کی ایک قسم یہ ہے کہ ظالم کی ہمنوائی و حمایت کی جائے۔ ظلم جس کے ہیولے ہی میں خرابی کی صورت مضمحل نظر آتی ہے، حیات ملی کا شیرازہ منتشر کر دیتا ہے۔ احساس غضب اور خواہش انتقام کو چھوٹ دینے سے بھی انسان ظالم بن جاتا

ہے۔ اسی لیے اسلام اعتدال پر رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔

اسلام ان برائیوں کا خاتمہ کر کے ایک ایسے حسین معاشرے کا قیام چاہتا ہے جس میں لوگوں کے ساتھ عدل و احسان ہو۔ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ہمارے جذبات، ہمارے احساسات اور ہمارے اداروں کے نقشے درست ہو سکتے ہیں۔ انفرادی سطح پر اخلاقی اقدار کو اپنا کر ان برائیوں کا انسداد کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے حکومت ایسے اقدامات کر سکتی ہے جن سے ان کا فروغ ہی نہ ہو سکے۔ جب کوئی بگاڑنے والی قوت حد سے بڑھنے لگے تو اس کو دبا دیا جائے تاکہ بھلائی کا پلہ بھاری رہے۔ اس توازن کے قائم رکھنے کا نام عدل ہے۔

چونکہ نفس برائی کا حکم دیتا ہے اس لیے نفس امارہ کی اخلاقی نشوونما ضروری ہے۔ مومن کا فرض ہے کہ وہ عمر بھر اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ کرے۔ نظر غائر، طلب صادق اور قلب منیب شرف و مجدد انسانیت کے مقامات بلند حاصل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک وہ فرد یقیناً کامیاب و بامراد ہے جس نے تزکیہ نفس کر لیا اور وہ شخص لاریب بے نیل و مرام ہے جس نے اپنے آپ کو برائیوں کے نیچے دفن کر لیا۔ ان برائیوں کی تیرگی سے ہمیں صرف اسلامی تعلیمات کا نور ہی نجات دلا سکتا ہے۔ ان کی تعلیم عام کی جائے۔ اس سے قوت فکر پاکیزہ ہوتی ہے اور انسان پیکر اخلاص و محبت بن کر کامیاب زندگی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

باہمی قرابتداری باہمی فرائض و تعاون کا فرض عائد کرتی ہے۔ قرابتداری میں سب سے بلند درجہ والدین کا ہے۔ حسن سلوک اور نیکی پہلے ایک عام انسانی جذبہ ہے اور تب قرابتداری کا تقاضا ہے۔ جو منعم ہیں وہ دولت کے امین بنیں اور اپنی کمائی کا ایک حصہ کمزوروں کو لوٹا دیں۔ ارشادِ بانی ہے: ۶۵

وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ.

”اس کی محبت میں مال صرف کرے قرابتداروں پر۔“

اسلام ایسے رشتہ داروں سے بھی حسن سلوک کا حکم دیتا ہے جن سے کوئی تکلیف دہ حرکت صادر ہو جائے۔ جیسا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عزیز مسطح بن اثاثہ سے ہوئی گئی جس نے عائشہ صدیقہ کے بارے میں جھوٹی تہمت پھیلانے میں حصہ لیا تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق

نے آئندہ مسطح کا روزینہ بند کرنے کی قسم کھالی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا۔^{۶۶}

وَلَا يَأْتِلْ أَوْلُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أَوْلِيَ الْقُرْبَىٰ
وَالْمَسْكِينِ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلِيَصْفُوا وَلِيَصْفَحُوا ۗ إِلَّا
تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

”تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحب مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار، مسکین اور مہاجرین سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے۔ انہیں معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کرنا چاہیے کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے۔“

چنانچہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی قسم چھوڑنا پڑی اور مسطح کی مالی امداد و گنا اضافہ کے ساتھ جاری رکھنا پڑی۔

قربت میں یہ سلسلہ جہاں تک پھیلتا چلا جائے گا، ذمہ داریاں بڑھتی چلی آئیں گی۔ اسلام میں نظام میراث اس خاندانی کفالت کی ایک عملی صورت ہے لیکن اسلام اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ انسان اقربا نوازی میں اس حد تک بڑھ جائے کہ حرام و حلال اور جائز و ناجائز کا امتیاز نہ رہے۔

اسلام نے زکوٰۃ کو فرض قرار دیا جائے۔ یہ افراط زر کو روکتی اور اخوت و ہمدردی کے جذبات کی نشوونما کرتی ہے۔ اس کے علاوہ صدقہ اور خیرات کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ صدقہ کے متعلق قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کو دیا جانے والا قرضہ ہے جس کی ادائیگی کی ضمانت دی گئی ہے۔^{۶۷}

مَنْ ذَا الَّذِي يُقرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضِعْفَهُ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيمٌ ۝
”کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض، تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس کر دے اور اس کے لیے بہترین اجر ہے۔“

اس سے نفس کی بھی تطہیر ہوتی ہے اور مال کی بھی کیونکہ:^{۶۸}

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝

”تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں اور اللہ ہی ہے جس کے

پاس بڑا اجر ہے۔“

فرد کی عزت نفس محفوظ رکھنے کے لیے صدقہ میں اخفاء سے کام لینے کی ترغیب دی گئی ہے تاکہ ہاتھ پھیلانے والے کی شخصیت کے اجزائے خودی کی آشفنگی مقدر نہ بن جائے۔ بیشتر اسلامی تعلیمات امتزاجی نوعیت کی ہیں مثلاً ایک طرف گداگری کو لعنت قرار دیا گیا ہے تو دوسری طرف سائل کی حاجت روائی کی تلقین کی گئی ہے۔

حیادل کا حجاب ہے جو انسان کو فواحش و منکرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ مرد کی عزت نفس اور عورت کی نسوانیت کی محافظ ہے اسی لیے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حیا کو ایمان کا جزو قرار دیا ہے۔ بے حیائی کے کاموں کے قریب بھی جانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے زنا، جو ایک بہت بڑی برائی ہے، کی زبردست سزا مقرر کی ہے۔ قرآن حکیم میں حکم ربانی ہے: ^{۶۹}

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ

عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

”تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی

کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح

پائیں گے۔“

ہر فرد اس بات کا مکلف ہے کہ جو برائی بھی دیکھے اسے مٹادے۔ من رائ منکم

منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطح فبلسانہ فان لم یستطح فیقلبه و ذالک

اضعف الایمان. ^{۷۰}

”تم میں سے جو کوئی کسی منکر کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ اسے بزور بازو مٹادے۔

جس سے یہ نہ ہو سکے وہ زبان سے ہی اس کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ جس

سے یہ بھی نہ بن پڑے وہ دل میں اس کے خلاف جذبہ رکھے اور یہ ایمان کا

سب سے نچلا درجہ ہے۔“

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ”خدا اس شخص پر رحم فرمائے جو مجھے میرے عیوب سے مطلع کرے۔“ ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (جیسا کہ تم خیال کرتے ہو) ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قسم! تم ان باتوں کی تلقین کرو اور بری باتوں سے روکو۔ ظالم کے ہاتھوں کو پکڑ لو۔ ان کو حق پر آمادہ کرو اور حق پر ان کو قائم کرو۔“

انفرادی طور پر اصلاح احوال کی کوششوں کے ساتھ اجتماعی طور پر بھی کوشش کرنا لازمی ہے۔ معاشرے کے تمام افراد کو مل کر ظلم کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے اور یہ ہاتھ اس وقت تک اٹھا رہے جب تک کہ مظلوم کو اس کا حق نہ مل جائے۔ ایک صالح معاشرہ کی تعمیر اور عدل اجتماعی کا قیام اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ حکومت کو ایسے قوانین وضع کرنے چاہئیں کہ شہریوں کو بلا امتیاز رنگ و نسل اعلیٰ شہری بننے کے تمام مواقع فراہم کیے جائیں مثلاً تعلیم اور روزگار کی ضمانت موجود ہو۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عام معذور افراد کے لیے وظائف مقرر کیے۔ ایک دفعہ آپ نے ایک ذمی کو مدینہ کی گلیوں میں بھیک مانگتے ہوئے دیکھ لیا۔ آپ نے فوراً اُس کا وظیفہ مقرر کیا اور اس کا جزیہ بھی معاف کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے صاحب بیت المال کو لکھا: ”خدا کی قسم! یہ قرین انصاف نہیں کہ ہم لوگوں کو ان کے بڑھاپے کی عمر میں بے یار و مددگار چھوڑ دیں جب کہ ان کی جوانی کے ایام میں ہم نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا ہو۔“ اے

اسی طرح عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک یتیم بچے کے چچا زاد بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پرورش کے ذمہ دار ہوں۔ ایک دوسرے یتیم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعید ترین رشتہ دار بھی موجود ہوتا تو میں اس پر اس کی پرورش لازم کر دیتا۔

حکومت کو زندگی کے ہر شعبہ کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کے لیے معاشرتی،

ثقافتی، تعلیمی اور معاشی اصلاحات نافذ کرنا ہوں گی۔ عدل اجتماعی کے قیام کا عظیم منصوبہ صرف اسی صورت ہی میں کامیاب ہو سکتا ہے جب حکومت کی پوری مشینری اس کام کے لیے وقف ہو جائے۔ تمام ذرائع ابلاغ اس کے لیے وقف کر دیئے جائیں۔ ارکان حکومت خود اپنی زندگیوں کے عملی نمونے پیش کریں۔

ان برائیوں کے انسداد کے بعد ایک جمیل و جلیل اور مطہر و منور معاشرہ معرض وجود میں آئے گا جس کے ماحول میں درخشندگی اور فضا میں تابندگی ہوگی اور یہ دین و دنیا دونوں کی سرفرازیوں اور سر بلندیوں کا امین ہوگا۔

حوالہ جات

- ۱ قرآن حکیم ۹۰:۱۶
- ”اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو۔“
- ۲ طبقات ابن سعد، حصہ اول، ص ۲۳۵، ۲۳۷
- ۳ دائرۃ المعارف اسلامیہ، ج ۱۳، ص ۴
- ۴ مجلہ، دفعہ ۱۷۰۵
- ۵ ابن عالم اور اسلام ص ۱۶۱، لاہور ۱۹۷۴
- ۶ قرآن حکیم ۹۰:۱۶
- ۷ قرآن حکیم ۵۸:۴
- ۸ قرآن حکیم ۱۵۲:۶
- ۹ قرآن حکیم ۸:۵
- ۱۰ قرآن حکیم ۴۲:۵، ۴۹:۹، ۶۰:۸
- ۱۱ قرآن حکیم ۱۳۵:۴
- ۱۲ اسلام میں عدل اجتماعی، سید قطب شہید، ص ۹۷۰، لاہور ۱۹۶۹
- ۱۳ قرآن حکیم ۳:۴
- ۱۴ قرآن حکیم ۱۲۹:۴
- ۱۵ ترمذی، ابوداؤد، نسائی
- ۱۶ قرآن حکیم ۱۵۲:۶
- ۱۷ قرآن حکیم ۱۹:۵۱
- ۱۸ قرآن حکیم ۱۲۷:۴
- ۱۹ ابوداؤد، ترمذی
- ۲۰ قرآن حکیم ۵۸:۴
- ۲۱ قرآن حکیم ۲۸۲:۴
- ۲۲ مسند امام احمد
- ۲۳ بخاری، مسلم، ابوداؤد کتاب الحدود و کتاب بدء الخلق

- ۲۳ قرآن حکیم ۲:۲۳
- ۲۵ قرآن حکیم ۳۸:۵
- ۲۶ بخاری کتاب الشہادات و کتاب المغازی
- ۲۷ ابن کثیر، ج ۱، ص ۲۲۸
- ۲۸ ابن اسحاق بروایت ابن ہشام
- ۲۹ قرآن حکیم ۱۵۲:۶
- ۳۰ قرآن حکیم ۸:۵
- ۳۱ قرآن حکیم ۱۵:۲۲
- ۳۲ قرآن حکیم ۴۲:۵
- ۳۳ قرآن حکیم ۷۵:۴
- ۳۴ قرآن حکیم ۹:۴۹
- ۳۵ بخاری کتاب الایمان، باب سؤال جبریل النبی عن الایمان والاسلام
- ۳۶ قرآن حکیم ۷۷:۲۸
- ۳۷ قرآن حکیم ۶۰:۵۵
- ۳۸ قرآن حکیم ۳۶:۴
- ۳۹ قرآن حکیم ۸:۲۹
- ۴۰ قرآن حکیم ۲۳:۱۷.....۲۳
- ۴۱ مسلم باب ۲۷
- ۴۲ بحر محیط ص ۱۰۱
- ۴۳ قرآن حکیم ۲۶۴:۲
- ۴۴ قرآن حکیم ۲۸۰:۲
- ۴۵ قرآن حکیم ۱۳۴:۳
- ۴۶ ایضاً
- ۴۷ قرآن حکیم ۲۲:۲۳
- ۴۸ جامع ترمذی باب ما جاء فی الاحسان والعفو
- ۴۹ قرآن حکیم ۲۲۹:۲
- ۵۰ قرآن حکیم ۲۳۷:۲
- ۵۱ قرآن حکیم ۸:۶۰

- ۵۲ مسلم
- ۵۳ شرح از بعین نووی از ابن حجر
- ۵۴ قرآن حکیم ۲: ۴۰
- ۵۵ قرآن حکیم ۲۲: ۳۸
- ۵۶ قرآن حکیم ۶: ۱۵۱
- ۵۷ قرآن حکیم ۷: ۳۳
- ۵۸ قرآن حکیم ۱۷: ۳۲
- ۵۹ بخاری و مسلم
- ۶۰ روایت ابوداؤد، ابن ماجہ از ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ و انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- ۶۱ قرآن حکیم ۱۲: ۴۹
- ۶۲ قرآن حکیم ۲: ۲۲
- ۶۳ ابوداؤد باب بخشش فی وجوہ المداحین
- ۶۴ بیہقی، موضوع: کبر و غرور
- ۶۵ قرآن حکیم ۲: ۱۷۷
- ۶۶ قرآن حکیم ۲۲: ۲۲
- ۶۷ قرآن حکیم ۵۷: ۱۱
- ۶۸ قرآن حکیم ۶۴: ۱۵
- ۶۹ قرآن حکیم ۳: ۱۵۴
- ۷۰ مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی
- ۷۱ ابویوسف، کتاب الخراج، ص ۷۲، مصر بحوالہ سیرۃ النبی، ج ۶، ص ۱۶۹، علامہ شبلی نعمانی

حضور بحیثیت داعی امن و اخوت

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت کا نام ہی اسلام ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجسم بن کر کتاب الہی کی عملی تشریح و تفسیر کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو تمام جہان کے لیے اسوہ حسنہ قرار دیا ہے۔ ارشادت ربانی ملاحظہ ہوں:

۱۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۗ

”در حقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک بہترین نمونہ تھا۔“

۲۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۗ

”اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے۔“

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی دعوت الگ الگ دعوتیں نہیں بلکہ یہ ایک ہی دعوت ہے۔ قرآن حکیم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کا چونکہ ایک مشن ہے جس کا مقصد و مدعا ایک ہے۔ امن و اخوت کی سب سے پہلی اور اہم بنیاد توحید باری تعالیٰ ہے۔ اگر تصور توحید بنیاد ہے تو امن و اخوت اس کے دروازے، دیواریں اور چھت وغیرہ ہیں۔ اگر عقیدہ توحید روح ہے تو امن و اخوت اس کا جسم اور اعضاء ہیں۔ تصور توحید اساسی امن کائنات ہے۔

امن و اخوت کے قیام کے لیے دوسری اہم بات توحید کے ساتھ اقرار رسالت ہے۔ یہ ضروری ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا سچا اور آخری رسول تسلیم کیا جائے۔

امن و اخوت کی تیسری بنیاد استحضار آخرت ہے۔ فکر و آخرت کا تصور خود احتسابی کا تصور پیدا کرتا ہے یاد رہے کہ قطع رحمی، افواہ سازی، اہانت مومن، طعن و تشنیع، کسی کے خفیہ حالات کا تجسس، بغض و کینہ اور غیبت امن و اخوت کے لیے زہر قاتل ہے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور قدسی کے وقت خدا کی مقدس زمین فواحش و منکرات، عصیان، طغیان، بد اخلاقی و بد اعمالی اور فسق و فجور کی نجاستوں سے بھر چکی تھی۔ لیکن یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا ہی نتیجہ تھا کہ پورے عرب اور پھر پوری دنیا کا سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی منظر یکسر تبدیل ہو گیا۔ یہ پر امن انقلاب انقلابات عالم کی تاریخ میں ایک معجزہ ہے۔ اس کی بھرپور مخالفت ہوئی لیکن اس کے باوجود رفاقت کرنے والوں کی مثالی رفاقت کے پیش نظر اسلام قریہ قریہ اور بستی بستی کی آواز بن گیا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ثمرہ ہی تھا کہ قرآن حکیم ”چوں بحاں در رفت“ کے مصداق صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے رگ و ریشے میں سرایت کر گیا۔ ان کے اذہان و قلوب اس کے نور سے منور ہو گئے۔ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کر کے زندگی بخشنے والی تازگی جیسی نعمت حاصل کی۔ اگر پہلے ان کو زندگی عزیز تھی تو اب موت عزیز تر ہو گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے خیالات کی رو بدل گئی، اخلاق اقدار بدل گئیں۔ جنگ و صلح کے اسالیب بدل گئے۔ یہ تبدیلی ہمہ گیر تھی۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک خیر و فلاح کے علاوہ کچھ نہ رہا۔ یہ سب کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا اعجاز تھا۔ اسی لیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **إِنَّمَا بَعَثْتُ مُعَلِّمًا** یعنی ”میں تو صرف معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر اقرار باللسان ہی کافی نہیں بلکہ تصدیق بالقلب بھی اس کے لیے لازمی شرط ہے۔ اس سلسلے میں منافقین مدینہ کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جو ارکان اسلام کی بجا آوری کرتے تھے لیکن ان کے دل نور یقین سے خالی تھے۔ اس لیے ان کا ٹھکانہ جہنم ٹھہرا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا تَمَاجِثُ بِهِ.

”تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہش نفس اس

(ہدایت) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لایا ہوں۔“

کامل اطاعت ہی عمل کی تحریک کو جنم دیتی ہے اور اس کے ذریعے ہی نفس کی خواہشات کو کچلنے کا ولولہ ابھرتا ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ **اطيعوا الله واطيعوا الرسول** ”اللہ کے مطیع بنو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع فرمان بن کر رہو۔“ اس پیروی میں بقا و دوام ہے۔

صاحب تفسیر مظہری رقم طراز ہیں: فان طاعة الرسول في كل امر بحی القلب و عصيانہ یمنیہ کہ ”ہر بات میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے دل زندہ ہوتا ہے اور اس کی نافرمانی سے دل مردہ ہوتا ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی اساس حکمت ہے جو انسانی عقل اور شعور کی پختگی سے عبارت ہے۔ یہی قرآن ہے جس میں نجات، بقا اور حیات ہے۔ یہی وہ جنس کیاب ہے جسے قرآن حکیم خیر کثیر قرار دیتا ہے یُسَوِّی الْحِكْمَةَ مَنْ یُشَاءُ ج وَ مَنْ یُؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ط یعنی ”(اللہ) جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت ملی اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر پورا اسلامی معاشرہ باہمی خیر خواہی کے گہرے جذبے سے سرشار ہو کر بنیانِ مرصوص بن جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے ایسے ہی معاشرے کے افراد کی یہ صفت بیان کی ہے۔ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ۔ یعنی ”وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔“ یہی لوگ اسلام کی دولت سے مالا مال ہونے سے قبل ضعیف اور ذلیل تھے۔ لیکن جب انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر لبیک کہا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو عزت بخشی۔ انہوں نے معاشرے کو طاغوتی طاقتوں سے پاک و صاف کیا اور خالص توحید، حسن و صداقت، اخوت و مساوات اور محبت و رحمت کی بنیادوں پر ایک ایسے معاشرے کی تشکیل و تعمیر کی جو ہر اعتبار سے مثالی تھا۔

جو شخص اسلام کے دامن میں پناہ لیتا ہے اس کی زندگی مسلسل جہاد بن جاتی ہے۔ کبھی نفسانی خواہشات غلبہ کرتی ہیں تو ان سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ شیطان کبھی دشمن کا خوف سامنے لاتا ہے اور کبھی مال و دولت کے لٹ جانے کا غم، کبھی دشمن کی ناپاک نگاہیں سرحدوں کی طرف سے اٹھتی ہیں تو کبھی آئین خداوندی پکارتا ہے۔ کبھی وطن اور دین الہی کے لیے جان و مال کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے۔ ہر مسلمان کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنا رشتہ صحیح بنیادوں پر استوار کرے۔ کیونکہ یہ رشتہ ہی ہمارا مقصد زندگی مقصود حیات اور نصب العین ہے۔ اگر کسی قسم کی پہلو تہی کی گئی تو یہ رشتہ قائم نہ رہے گا اور دنیا میں پھر ذلت اور رسوائی ہمارا مقدر بن جائے گی۔ اسی لیے زندگی کے ہر شعبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر لبیک کہنے میں ہی کامیابی کی ضمانت مضمر ہے۔ چاہے یہ شعبہ دعوت و تبلیغ کا ہو یا

یہ جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھ وابستہ ہو، ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی تکمیل کے لیے اپنے تمام ذرائع بروئے کار لانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا چاہیے۔ جب جہاد کی نفیر بج جائے تو پھر تمام دیگر حقوق اور پابندیاں ساقط ہو کر صرف فریضہ جہاد ہی قائم رہ جاتا ہے۔ اس لیے کہ دین کی حقیقی زندگی اور اس کے غلبہ کاراز جہاد فی سبیل اللہ میں ہی پوشیدہ ہے۔

جہاد کسی بھی مسلم ریاست کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ جرائم کے انسداد کے لیے پولیس اور عدالت کا انتظام، اسلام درحقیقت ایک اخلاقی، معاشرتی و معاشی اصلاح کی دعوت سے عبارت ہے۔ یہ جہاں عدل و انصاف سے ہٹنے والوں کے خلاف کارروائی کا حکم دیتا ہے وہیں ظالم و بے رحم، سماج، گروہ اور حکومت کے خلاف بھی کارروائی کا حکم دیتا ہے تاکہ اللہ کی دنیا میں حقیقی عدل و انصاف قائم ہو سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ خود غرض افراد یا پارٹیاں دنیا کے امن کو خراب نہ کر سکیں۔ جہاد کے لغوی معانی نہ جنگ کے ہیں اور نہ اصلاحی، اصلاح کی اس کوشش کا نام جہاد ہے جس کا آغاز تبلیغ سے ہوتا ہے، اس جدوجہد رحمت کی نوعیت مستقل ہے۔ یہ تمام مخلوقات کے لیے رحمت بننے کی سعی بیہم ہے جب کہ یہ برائیوں کے لیے پیغام مرگ ہے۔ اسلامی معاشرے کا قیام، ظالم اور تخریب پسند قوتوں کا خاتمہ اور دعوت اسلام دینا نظریہ جہاد کی خصوصیات ہیں۔ جہاد امن و سلامتی کے قیام کا ضامن ہے اور تحریک رحمت للعالمین کا جزو لاینفک ہے۔ یہ فی سبیل اللہ ہوتا ہے اور مظلوموں کی حمایت میں کیا جاتا ہے۔ اس کی چار اقسام ہیں:

جہاد بالسیف، جہاد باللسان، جہاد بالقلم اور جہاد بالمال۔ یہ صلح پر یقین رکھتا ہے اور شہری آبادی کی ہلاکت کے خلاف ہے۔ اس کا مقصد اور نصب العین انصاف اور حق کا بول بالا ہے ورنہ ایک انسانی جان کا قتل گویا بنی نوع انسان کا قتل ہے۔ اس میں کسی بھی قسم کی ذاتی اغراض کا رفرمانظر نہیں آتیں۔ دنیا میں ایسے بھی حکمران نظر آتے ہیں جن کی زندگی کا مشن ہی جوع الارض یا ذاتی انا کی تسکین تھا جیسے اسکندر اعظم اور ہٹلر۔ اول الذکر فاتح اعظم بننے کے جنون میں مقدونیہ سے ہندوستان تک کے علاقے مسخر کرتا چلا آیا۔ جب کہ موخر الذکر نے محض اس لیے لاکھوں یہودیوں کا قتل عام کرایا اور یورپ کے امن کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا کہ تمام غیر آریائی لوگ ناپاکیزہ نسل کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اسلامی جہاد میں جنون یا تشدد جیسے عوامل بھی کارفرما نظر نہیں آتے جیسے کہ صلیبی جنگیں جو کہ مذہبی جنون کے زیر اثر لڑی گئیں۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ

بادشاہوں اور حکمرانوں نے اپنی دھاک بٹھانے کے لیے بے شمار بستیوں کو اجاڑا ہے۔ اسی کا نقشہ قرآن نے ملکہ سبا کی زبان سے ادا کیا ہے: ^۸

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً. ^ج

”بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اسے خراب اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔“

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کو ایک نیا مقصد دیا یعنی امن کا قیام جو انصاف کے رنگ میں رنگا ہو، اور انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلا کر انہیں عزت، وقار اور عدل سے ہمکنار کیا جاسکے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں بتوں کی پوجا کی جاتی تھی، قبائلی عصبیت شرفساد کا سرچشمہ تھی وہاں داعی اسلام کا اعلائے کلمۃ اللہ کہہ دینا ہی اعلان جنگ تھا۔ کیونکہ یہ ان کی سرے سے ہی نفی کرتا تھا۔ حق کی حمایت اور اشاعت کے لیے جدوجہد کرنا، اس میں جان و مال کی قربانی دینا اور بے خوف ہو کر تکلیف برداشت کرنا ہی جہاد ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جسے قرآن حکیم نے اس طرح واضح کیا ہے: ^۹

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ.

”جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔“

ہر قوت کے لیے ایک مخالفت قوت ہوتی ہے۔ حق و باطل کے درمیان تصادم ناگزیر ہوتا ہے۔ باطل قوتیں ہر وقت دنیا میں فتنہ و فساد پھیلاتی رہتی ہیں لہذا دنیا سے فتنہ و فساد ختم کرنے کے لیے باطل قوتوں کا مقابلہ ضروری ہوتا ہے تاکہ بنی نوع انسان کی فلاح حاصل ہو جو کہ فتح کی صورت میں حاصل ہوگی۔ بعثت سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد احترام حاصل تھا لیکن اُس کے فوراً بعد ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعذیب شروع ہو گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقاومت بے مزاحمت کی۔ اس جہاد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف ایک ہتھیار تھا۔ ”صبر“۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی صبر سے کام لیتے تھے اور اپنے متبعین اور مقلدین کو بھی اس کی تلقین و تاکید فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ساتھ مسلح تصادم کی راہ اختیار نہ کی

کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آفاقی مشن تلوار کی بجائے کردار کے ذریعے قریش کے قلوب کی تسخیر کرنے کا عزم کر چکا تھا۔ یہ تعذیب بالآخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت پر منتج ہوئی۔ اس کے بعد کے اقدام مستعد مزاحمت کا حامل بن گئے۔ یہ عمل تکبیر رب کی سعی و جہد ہے۔ مکی دور میں دعوت و تبلیغ شدائد و مصائب کے برداشت کرنے کے درجہ میں تھی جب کہ مدنی دور میں ایک مسلح تصادم بدر و احد اور خندق کے معرکوں کی صورت میں ہویدا تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد قریش نے مدینہ کی ایک سرکردہ شخصیت، عبداللہ بن ابی جو بعد میں رئیس المنافقین کے نام سے مشہور ہوا، کو خط لکھا کہ تم ہمارے دشمنوں کو مدینہ سے نکال دو ورنہ ہم سب تم پر حملہ آور ہو کر تمہارے مردوں کو قتل کر دیں گے اور عورتوں سے داد عیش دیں گے، لڑکے اور لڑکیوں کو غلام اور لونڈیاں بنائیں گے۔^{۱۱}

یہ باطل کی طرف سے کھلم کھلا اعلان جنگ تھا۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے کبھی بھی ہتھیار نہ چلایا تھا اور جن کی رحمدلی کے باعث طعنے دیئے جاتے تھے ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ تلوار اٹھائیں۔ بالآخر بدر کا عظیم الشان معرکہ ظہور پذیر ہوا جو تحریک اور جمود کے درمیان ٹکراؤ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت انسانی کا اندازہ ہم اس واقعہ سے بھی کر سکتے ہیں کہ بدر کے قیدیوں کی کراہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نینداڑ گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک آرام سے نہ سو سکے جب تک کہ ان کے بندھن ڈھیلے کر کے انہیں آرام نہ پہنچا دیا گیا۔ اس غزوہ میں گرفتار ہونے والے دشمنان اسلام کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احسن سلوک کیا اس کے متعلق ولیم میور رقم طراز ہے:

”محمد کی ہدایت کے مطابق اہل مدینہ نے اور ان مہاجرین نے، جن کے پاس خود رہنے کو مکان تھے، قیدیوں کو اپنے یہاں ٹھہرایا اور ان کے ساتھ بڑی مروت سے پیش آئے۔ بعد میں ان میں سے ایک قیدی نے کہا: خدا کی رحمت ہو جو مدینہ کے لوگوں پر ہمیں سواری دیتے تھے اور خود پیدل چلتے تھے۔ ان کے ہاں گندم کی روٹے کی کمی تھی۔ پھر بھی انہوں نے ہمیں وہ کھانے کو دی اور خود کھجوروں پر بسر کی۔“^{۱۲}

اللہ تعالیٰ نے انہی کے متعلق فرمایا: ^{۱۲}

وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝

”اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ میں ایک بھی واقعہ ایسا نظر نہیں آتا جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت جذبات میں کوئی ایسا اقدام کیا ہو جس کی اخلاق اجازت نہ دیتا ہو۔ غزوہ ابوا (صفر ۲ھ) کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امن پسندی اور وسعت قلبی ملاحظہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ ان سے غیر جانبدار رہنے کو فرماتے ہیں بلکہ فیصلہ بھی ان ہی پر رکھتے ہیں کہ صلح و انصاف کی جو بات ان کی سمجھ میں آئے وہ فریقین کے سامنے پیش کریں، ماننے نہ ماننے کا ان کو اختیار ہے۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کرنا ہی چاہتے تو کوئی بھی امر مانع نہ تھا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے معاہدہ کی شرائط ماننے پر تیار ہو جاتے ہیں جو بظاہر بڑی حوصلہ شکن ہیں۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام مشیر بھی انگشت بندھاں ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہے کہ امن کی فتوحات جنگوں کی نسبت بہت بڑی ہوتی ہیں۔ معاہدہ طے پانے سے قبل قریش نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اشتعال دلانے کے لیے کئی ایک اقدامات کیے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقل صبر و تحمل اور ضبط نفس سے کام لیا اور کسی بھی طرح اشتعال کی نوبت نہ آنے دی۔ ان اقدامات میں قریش کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی خراش بن امیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اونٹ کو ذبح کرنا، ان کے قتل کے درپے ہونا، عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روک لینا، مقام تنعیم کی طرف سے مسلمانوں پر چھاپہ مارنا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ چھاپہ مار پکڑ لیے گئے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی غیر منشر و طور پڑ چھوڑ دیا۔

راہ حق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بے پناہ صعوبتوں سے گذرنا پڑا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں کی گالیوں کا بدلہ ”صح جمیل“ سے دیا۔ ان کے مظالم کا مقابلہ ”صبر جمیل“ سے کیا اور ان کی خود غرضیوں اور جہالتوں کا عوض ”ہجر جمیل“ اور خاموشی کو بنایا۔ وہی مکہ جس کے باسیوں کے ہاتھوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان گنت شداکد جھیلنے پڑے اور جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے استحقاق میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ چھوڑا۔ جب اس پر قحط کا زمانہ پڑتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے غلہ کی رسد جاری کر دیتے ہیں اور اس شہر کے غرباء کے

لیے پانچ سواشریاں نقد بھجواتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امن پسندی کا ایک عدیم المثال مظاہرہ تاریخ نے فتح مکہ کے موقع پر دیکھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وهذا البلد الامین اور خانہ کعبہ کے متعلق فرمایا: ومن دخله كان امنا۔ ”اور جو شخص اس مبارک گھر میں داخل ہو اوہ امن میں آ گیا۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فوج کو درج ذیل ہدایات دیں۔^{۱۳}

۱۔ جو شخص بیت اللہ میں داخل ہو جائے اس کو امن دیا جائے۔

۲۔ جو شخص مقابلے کے وقت ہتھیار ڈال دے اس کو امن۔

۳۔ جو شخص لڑائی سے بھاگ جائے اس کو امن۔

۴۔ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اس کو امن۔

۵۔ جو شخص اپنے گھر میں داخل ہو کر کنڈی لگالے اس کو امن۔

۶۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو امن۔

فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو انسانوں کی فطری مساوات اور اخوت کے بارے میں قرآن حکیم کے احکام بیان کیے، پھر فرمایا: ”اے قریش! میری طرف سے تمہیں اپنے لیے کس سلوک کی توقع ہے؟“

انہوں نے جواب دیا: ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے شفیق برادر اور مہربان برادر کے

فرزند ہیں۔ ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھلائی ہی کی توقع ہے۔“ یہ الفاظ سن کر آپ صلی اللہ

علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اچھا میں بھی تم سے وہی

کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا: ^{۱۴} اَلَا تَتْرِبْ عَلَیْكُمْ الْیَوْمَ ط

یَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّحْمِیْنَ ۝ یعنی ”آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمہیں معاف

کرے، وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا کہ جاؤ

تم سب آزاد ہو اذہبوا، فانتم الطلقاء ^{۱۵} حالانکہ وہ لوگ عرفاً، قانوناً اور اخلاقاً ہر لحاظ سے مجرم

تھے اور دین و سیاست دونوں پہلوؤں سے قابل گردن زنی۔ یہ ایک ایسی فتح تھی جس میں نہ کوئی

فاتح تھا نہ مفتوح، نہ کوئی غالب تھا نہ مغلوب، ایک ایسی فتح جو فتح الفلوح تھی۔ فتح الایثار تھی، فتح

الایمان تھی۔ فتح الخیر اور فتح الاسلام تھی۔ ع

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ!

ہجرت سے پہلے ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ کعبہ کے اندر داخل ہو کر عبادت کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن طلحہ سے اس مقصد کے لیے کنجی مانگی۔ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خواہش کے احترام کی بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے عثمان کسی دن یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی۔ مجھے اختیار ہوگا کہ میں جس کو چاہوں اسے دوں۔“

فتح مکہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ کی کنجی بنو ہاشم کی خواہش کے باوجود ان کو نہ دی بلکہ عثمان بن طلحہ کو دی اور فرمایا:

”اے عثمان! اپنی کنجی لو۔ آج وفا اور سلوک کا دن ہے۔ اس کو لو یہ تمہارے خاندان میں ہمیشہ موروثی طور پر رہے گی۔ ظلم کے سوا کوئی بھی تم سے اس کو نہیں چھینے گا۔“^{۱۹}

اس کے برعکس عام طور پر اقتدار حاصل کرنے والے سب سے پہلے اپنے مخالفین کی سرکوبی کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق پسندی اور امانت داری کے اعتبار سے معاملات کو دیکھا۔

غزوہ احد میں وحشی بن حرب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا اور ہند بنت عتبہ نے ان کی لاش کا مثلہ بنایا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو وقتی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکل گیا کہ لئن اظہر فی اللہ علیہم لا مثلن بثلاثین رجلا منهم یعنی ”اگر اللہ نے مجھے ان کے اوپر فتح دی تو ان کے تین آدمیوں کا مثلہ کروں گا۔“^{۱۹} لیکن فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی معاف فرمادیا۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آئندہ کے لیے ہر قسم کی تخریبی سرگرمیوں کا دروازہ بند کر دیا۔ مزید براں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس رویے کی وجہ سے کفار کی اکثریت مشرف بہ اسلام ہو گئی۔

عکرمہ اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابو جہل کے بیٹے تھے جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بے پناہ صعوبتیں پیدا کیں۔ خود عکرمہ نے اسلام کے خلاف کئی لڑائیوں میں حصہ لیا۔ فتح مکہ کے بعد بھاگ کر یمن چلے گئے، البتہ ان کی بیوی نے اسلام قبول کر لیا۔ وہ خود

یمن گئیں اور عکرمہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو ان کے خیر مقدم کے لیے تیزی سے اٹھے کہ جسم اطہر پر چادر تک نہ تھی اور زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے: ^{۱۸} "مرحبا یا راكب المهاجر یعنی "اے مہاجر سوار تمہارا آنا مبارک۔" اس کے ساتھ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمایا:

يَا تَيْكُم عَكْرَمَةَ مَوْمِنًا فَلَا تَسْبُوا أَبَادًا فَان سَبَّ الْمَيْتِ يُوذَى النَّحْيِ.

"عکرمہ مومن ہو کر تمہارے پاس آ رہے ہیں تم ان کے باپ کو برا نہ کہنا۔ مردہ

کو برا کہنے سے زندہ کو تکلیف ہوتی ہے۔"

فتح مکہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے جو بیعت لی اس کے الفاظ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں نہ توقع کا غرور ہے نہ اپنی حاکمیت کا اقرار اور نہ ہی کوئی مادی مطالبہ۔ صرف انسانی سماج سے برائیاں اور گراہیاں دور کرنے کے لیے خدا کی حاکمیت کا اقرار ہے۔ فتح مکہ ہی کے روز سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ نعرہ لگایا: **اليوم يوم الملحمة، اليوم تسحل الحرمة.** "آج جنگ کا دن ہے، آج تو کعبہ کی حرمت بھی حلال ہو جائے گی۔" جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اليوم يوم المرحمة، اليوم يوم المرحمة "آج تو رحمت کا دن ہے، آج تو رحمت کا دن ہے۔" اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے علم لے کر ان کے بیٹے قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دے دیا جو ٹھنڈے مزاج کے مالک تھے۔ ^{۱۹} اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بخوبی جانتے تھے کہ زندگی کا اصل راز لڑائی سے بچ کر اپنے آپ کو اتنا طاقتور بنانا ہے کہ لڑائی کے بغیر محض دبدبہ سے حریف ہتھیار ڈال دے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت انسانی کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ غزوہ حنین کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو ہوازن کے چھ ہزار قیدی آزاد کر دیئے بلکہ متعدد قیدیوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کپڑے بھی دیئے۔ اصل مقصود یہاں لوگوں کو ہلاک کرنا یا غلام جمع کرنا نہیں تھا۔ مقصود تو صرف نظام حق کی اقامت اور دلوں کو اس کے لیے ہموار کرنا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کو اپنی متروکہ املاک بھی واپس نہ دلانیں۔ اگر جہاد کا مقصد حصول زبرد زمین ہوتا تو اس سے بڑھ کر نادر موقع اور کوئی نہیں تھا۔

ہجرت کے بعد مدینہ پہنچ کر سب سے پہلا فقرہ جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا وہ یہ تھا: یا ایہا الناس افسو السلام ”لوگو! امن و سلامتی پھیلاؤ۔“ ایک اور موقع پر ارشاد ہوا: وتحابوا بروح اللہ بینکم ”آپس میں ایک دوسرے سے ذات الہی کے واسطے سے پیار کرو۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب کے علاوہ یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی فیاضانہ برتاؤ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود مدینہ سے جو معاہدہ کیا وہ امن اور مفاہمت کی بہترین عملی شکل تھا۔ لیکن انہوں نے مدینہ اسلامی کی ریاست کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کیے رکھا۔ ان کو اپنے کرتوتوں کی سزا ملی۔ پھر بھی اکثر اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نرمی کا برتاؤ کیا۔ بنو قریظہ کو اپنی غداری کی جو سزا ملی۔ وہ ان کے اپنے چنے ہوئے ثالث (سعد بن معاذ) کے فیصلے کے مطابق تھی، جنہوں نے ان کو ان کے ہی قانون کے مطابق سزا سنائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کسی لشکر کو روانہ فرماتے تو اس کے قائد کو یہ ہدایت فرماتے: ^{۲۰}

”میں تمہیں اللہ سے ڈرنے اور جو مسلمان تمہارے ساتھ ہیں ان کے ساتھ اچھے برتاؤ کی نصیحت کرتا ہوں۔ اللہ کے نام پر قتال کرنا اور اللہ ہی کے راستے میں اس سے قتال کرنا جس نے اللہ کے ساتھ کفر کیا۔ غداری نہ کرنا، مال غنیمت کی چوری نہ کرنا۔ کسی بچے، عورت اور کار رفتہ بوڑھے یا کسی معبد میں بیٹھے ہوئے گوشہ گیر کو قتل نہ کرنا، کسی کھجور کو ہاتھ نہ لگانا کسی درخت کو نہ کاٹنا، کسی عمارت کو نہ گرانا۔“

اسلام سے پہلے یہ حالت تھی کہ پورے عرب میں قتل و غارت، انتقامی کارروائیوں، خانہ جنگیوں اور معرکہ آرائیوں کا سلسلہ قائم تھا اور بڑی بڑی حکومتوں کے کارواں بھی بڑے غیر معمولی پہرہ، حفاظتی بندوبست اور ماہر ہبروں کی مدد سے چلتے تھے ایک ایسا ماحول جہاں ڈاکے پڑ رہے تھے، قتل ہو رہے تھے، کھلم کھلا عصمتیں لٹ رہی تھیں۔ کون یہ تصور کر سکتا ہے کہ اس ماحول میں مسافرتن تنہا بے کھٹکے سفر کرے گا۔ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا کہ مکہ کو بے نگہبانی کے قافلہ جایا کرے گا۔ ^{۲۱} آپ کی جنگی حکمت عملی کو رحمت پر مبنی حکمت عملی ہی کہا جائے گا اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگ کا مقصد رفع شر اور

استیصال منکر تھا۔ قرآن حکیم نے جنگ کو بس اس وقت تک جائز رکھا جب تک فتنہ باقی ہو۔^{۲۲}

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ

”ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا

اللہ کے لیے ہو جائے۔“

جہاد مقدور بھر جدوجہد اور مساعی جمیلہ سے عبارت ہے۔ امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ”الجہاد والمجاہدۃ کے معنی دشمن کے مقابلے میں پوری قوت صرف کرنے کے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مطہرہ مقدور بھر جدوجہد اور مساعی جمیلہ کی عملی تفسیر ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی جدوجہد کے نتیجے میں عرب کے اطراف میں اس قدر امن و اطمینان ہو گیا کہ ایک محمل نشین خاتون حیرہ سے چلتی اور کعبہ کا طواف کر کے واپسی جاتی اور اللہ کے سوا اس کو کسی کا ڈر نہ ہوتا۔^{۲۳}

اسلام نے امن یا صلح کے نام پر ظلم کو خاموش تماشائی کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ وہ اس ظلم کو ختم کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ اس کا مقصد لوگوں کو جبر و تشدد سے بچانا ہے تاکہ عدل قائم ہو سکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا تقابل اگر عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے کیا جائے تو حیرانگی ہوتی ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ”یہ خیال نہ کرو کہ میں دنیا میں امن پھیلانے آیا ہوں۔ میں امن لے کر نہیں آیا بلکہ تلوار لے کر آیا ہوں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ بیٹے کو باپ سے، بیٹی کو ماں سے اور بہو کو ساس سے جدا کروں۔“^{۲۴}

اس کے علی الرغم رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کو صرف مظلوم کی امداد، ضعیفوں، عاجزوں اور بچوں کو پنجہ ستم سے نجات دلانے کا وسیلہ قرار دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ میں سفاکی اور انسانیت سوز حربوں کو ممنوع قرار دیا بلکہ جنگ کی نسبت ہر حالت میں امن اور صلح کو ترجیح دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد ربانی^{۲۵} کے مطابق دشمن کے دلوں پر اپنی دھاک بٹھائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں دس لاکھ مربع میل سے زیادہ کا علاقہ فتح ہوا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۸ غزوات میں سے صرف ۹ میں لڑائی ہوئی۔ باقی ۱۹ میں دشمن بغیر کسی مزاحمت کے بھاگ گیا۔ اس پورے عرصہ میں ۲۵۹ مسلمان شہید اور ۷۵۹ غیر مسلم ہلاک ہوئے۔ اس کے برعکس روس میں ۱۹۱۷ء میں لینن کے برپا کردہ انقلاب میں لاکھوں

افراد کو اپنی جان کی قربانی دینا پڑی۔ الجزائر کے جہاد آزادی میں ۲۵ لاکھ مسلمان شہید ہوئے۔ قیام پاکستان کے لیے کم و بیش ایک کروڑ انسان کام آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محض دس برسوں میں تاریخ کا دھارا موڑ دیا اور بکھرے ہوئے قبائل اور انتہائی وحشی افراد کو پاکیزہ اخلاقی تعلیم کے ذریعے عظیم سپاہیوں سے واقف کرایا۔ ارشاد نبوی ہے:

انا نبی رحمة انا نبی المحہ.

”میں رحمت کا پیغمبر ہوں، میں جنگ کا پیغمبر ہوں۔“

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہی کا اعجاز تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کشت و خون کی بجائے اخلاق سے دل موہ لیے۔ ایک لڑائی میں رومی سپہ سالار حالات سے آگاہی کے لیے اپنے جاسوس بھیجتا تھا جو واپس جا کر اسے بتاتے ہیں کہ مسلمان کیسے سپاہی ہیں: ہم باللیل رهبان و بالنهار فرسان یعنی وہ راتوں کے راہب ہیں اور دن کے شہسوار۔“ یہی اسلام کی اصل زندگی ہے۔ جہاد چونکہ تعمیری و مثبت مقاصد کی خاطر کیا جاتا ہے اس لیے اس میں خون انسانی کا احترام اور انسانیت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی لڑائیاں بھی لڑیں وہ ٹھوس اخلاقی اصولوں پر کار بند رہ کر لڑیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم فتوحات کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانیت اور انسانیت نوازی میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تاریخ ایسی کوئی بھی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جب زمین میں ایک دفعہ امن قائم ہو جائے تو پھر اسے تباہ نہ کیا جائے۔ کئی تشدد اور خون ریزی کے اس دور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ محسوس کر لیا کہ خیالات طاقت سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام حربی مہمات کا اصل مقصد یہ تھا کہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلا کر انہیں عزت، وقار اور عدل سے ہم کنار کیا جائے اور دنیا میں اجتماعی امن قائم کیا جائے۔ اسلام نے صرف اپنے تحفظ کی خاطر تلوار نیام سے نکالی اور اپنے تحفظ ہی کی خاطر اسے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ جہاں تک اسلام کی تبلیغ کا تعلق ہے یہ طاقت کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا چاہے یہ فوجی ہو، سیاسی ہو یا معاشی ہو۔^{۲۸} اسلام اس عظیم کائنات میں عظیم وحدت کا دین ہے۔ یہ شروع سے ہی ایسے عناصر کی نفی کرتا ہے جو جنگ و جدال کا باعث بنتے ہیں مثال کے طور پر نسلی تعصب، نوآبادیاتی اور اختصاصی قوتیں۔

اسلام دراصل اس لیے اس نام سے موسوم کیا گیا ہے کہ وہ کلی یعنی موضوعی، معروضی اور اخروی سلامتی کا نقیب و علمبردار ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے سلامتی کے معنی ہیں خوف و حزن کا فقدان اور امن و اطمینان کی حالت۔ قرآن حکیم میں ارشادِ باری ہے: ^{۲۹} **يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ خُلُوا فِي السَّلَامِ كَأَفَّةٍ** ص ”اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آ جاؤ۔“

اسلام ساری انسانیت کو ایک بشریت شمار کرتا ہے۔ یہ دین کو صرف ایک دین شمار کرتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو لڑائیاں بھی لڑیں وہ محض تلواروں اور تیروں کی لڑائیاں نہ تھیں۔ یہ عقیدے، نظریے اور کردار کی لڑائیاں تھیں۔ اجتماعی تبدیلیاں بغیر مزاحمتوں کے واقع نہیں ہوتیں۔ جب تک کوئی تحریک قوت کا سہارا نہیں لیتی، اجتماعی اصلاح کے منصوبوں کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر کا نیا نعرہ لے کر تشریف لائے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم میدان کارزار میں بھی رکوع و سجود سے غافل نہ ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ ڈسپلن کے مخصوص طور و اطوار تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امن کا ماحول فراہم کیا، قانون کی علمداری قائم کی اور معاشرے کو اخوت و مساوات کی بنیادوں پر استوار کیا۔

اخوت اسلامی تحریک کی جان ہے۔ اس کی مدد سے غیر اپنے اور مخالفت دوست بن جاتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اپنے اندر ایک ایسا نظام اخوت رکھتی ہے جو مسلمانوں کو بُنیانِ مرصوص بنا دیتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں ایک ایک فرد کی ایک دوسرے سے باہمی محبت، شفقت، اخوت، خیر خواہی، گرویدگی اور پیوستگی اس درجہ ہوتی ہے جیسے کسی عمارت کی اینٹیں باہمی طور پر پیوست ہوتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے سہارے کا باعث بھی بنتی ہیں اور ایک دوسرے کا وجود بھی سہارتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خیر خواہی کا سبق دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ^{۳۰}

الْمُؤْمِنُ كَابْنِيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا، ثُمَّ شَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ.

”مسلمان مسلمان کے لیے عمارت کی طرح ہیں جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو قوت پہنچاتا ہے۔ پھر آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی

انگلیوں میں پیوست کر کے بتایا۔“

باہمی اخوت و اتحاد کے بغیر قوم خلفشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے **لَا تَفَرَّقُوا مَعْنَى** ”سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔“

حضور نے فرمایا: ”جو مسلمان اپنی جماعت سے بالشت بھر بھی الگ ہوا، اور اسی حالت میں مر گیا تو اس نے جہالت یعنی کفر کی موت پائی۔“

ایک اور مقام پر فرمایا: ”تو دیکھتا ہے مومن باہمی رحم دلی، محبت اور ارتباط کی وجہ سے ایک جسم کی مانند ہیں کہ جب کوئی عضو بیمار ہو تو سارا جسم بے خوابی اور بخار میں اس کا شریک ہو جاتا ہے۔“

ظہور اسلام سے قبل دنیا نسل، زبان اور رنگ کے تین دوار میں منقسم تھی۔ بلحاظ نسل جو حقوق برہمنوں کو ہندوستان میں کھتری، دیوتی، شوبرہ اور چندال لوگوں پر حاصل رہے ہیں یا اسرائیلیت میں بنی لادی کے لیے مختص حقوق یا ادا، یعقوب علیہ السلام میں بنی یہودا کے لیے حقوق سلطنت مخصوص کر دیئے گئے تھے۔ ہندوؤں میں شودروں کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا تھا جیسا کہ شلوک میں درج ہے: ”یدی شودر آہنکار دی کسی برہمن کو دھرم کا اپدیش کرے تو راج اس کے منہ اور کان میں کھولتا ہوا تیل ڈلوائے۔“ ^{۳۲} چھوت چھات کا یہ عالم تھا کہ برہمن پر اگر ہریجن کا سایہ پڑ جاتا تو اس کا دھرم بھرشٹ ہو جاتا۔

زبان کے اعتبار سے سنسکرت کا غلبہ اکرت اور تامل، عبرانی کا غلبہ دیگر لغات پر، لاطینی کا تفوق یورپ کی باقی زبانوں پر، فارسی کا دبذیاس وقت کے ہندوستان، افغانستان، خراسان اور ترکستان میں اور عربی کی فضیلت دنیا کی سب زبانوں پر اس وقت جب کہ عرب اپنے مقابلہ میں سب کو عجمی (گونگے) کہتے تھے رہا ہے

تیسری تقسیم بلحاظ رنگ کے تھی۔ سرخ رنگ یا زرد رنگ یا مسھی رنگ یا گندی رنگ یا سفید رنگ یا سیاہ رنگ، انسانوں کے حقوق و مناصب میں ہمیشہ سے جو امتیازات رہے ہیں اور ہر فرمانروا نے اپنی رنگت کے سوا دوسری رنگت کے انسانوں کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا ہے اس پر ایک درد مند آج بھی لہو کے آنسو بہاتا ہے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ میں ایک نمایاں پہلو اخوت ہے۔ یہ وہ بھائی چارہ اور باہمی تعلق ہے جو اسلام نے مسلمانوں میں قائم کیا ہے۔ اسلام نے نسلی امتیاز کی نفی کرتے ہوئے حکم دیا ہے:

۱۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوا بَيْنَ اَخْوِيكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝۳۳

”مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلق کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔“

۲۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ط۳۳

”درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔“

ظہور اسلام سے قبل عربوں میں نہ کوئی وحدت تھی نہ اخوت بلکہ ہر طرف اختلاف، انتشار اور ظلم و ستم کا دور دورہ تھا۔ وہ بے شمار قبیلوں اور خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے۔ عرب بنیادی طور پر انارکسٹ اور انتہا پسند تھے۔ اسلام کا سب سے بڑا احسان، جو اس نے دنیا پر کیا، مساوات عام قائم کرنا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات سے انتشار کو وحدت اور ظلم و ستم کو اخوت اور مساوات میں بدلا۔ اسلام کی آواز پر لبیک کہنے والے معاشرے کے مظلوم اور پسے ہوئے افراد تھے۔ آپ کی تعلیمات کی بدولت مساوات اور جمہوریت نے جنم لیا جو اس سے پہلے دنیا میں موجود نہ تھی۔ اب دولت اور حسب و نسب کے پیدائشی دعووں کی کوئی اہمیت نہ رہی۔ غلام مسلمان ہو کر آزاد ہو جاتا اور اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی بدولت دھتکارے ہوئے غلام آقا بن جاتے۔ قریش نے اسلام کے اس مساویانہ انداز فکر کی بھرپور مخالفت کی کیونکہ اسلام نے ان کے اس تفوق کا بھی خاتمہ کیا جو اسے دیگر قبائل پر حاصل رہا تھا۔ ہجرت مدینہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے، اپنے گھر سے بھی پہلے، خانہ خدا کی نیوڈالی کہ مسجد میں اسلام کی میخ ہے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخاۃ کا ایک مثالی نظام قائم کیا۔ یہ اسلام کو ہر قسم کے قرابتی اور نسلی تار و پود سے بچانے کے سلسلہ کا پہلا مرحلہ تھا اور اس کی آخری کڑی فتح مکہ کے موقع پر ارشاد کیا گیا خطبہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

انصار کے ان قبائل کو، جو برسوں سے لڑتے چلے آ رہے تھے، شیر و شکر کر دیا۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ یعنی بھائی چارہ کر دیا مثلاً ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، خارجہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے، ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے، عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حذیفہ بن ایمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اور سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انہی قرار پائے۔

اس طرح کم و بیش پینتالیس مہاجرین انصار مدینہ کے بھائی بن گئے۔ ایسا کرتے وقت عمر، مزاج، سماجی مرتبے کا بھی لحاظ رکھا گیا تاکہ یہ سب تسبیح و خدت کے دانے بن جائیں۔ انصار نے اس رشتے کا اس درجہ احترام کیا کہ اپنی ہر شے، مال و اسباب کار و بار، زمین، جائیداد وغیرہ اپنے مہاجر بھائیوں کے ساتھ نصف نصف بانٹ لیے۔ جن انصاریوں کے ہاں ایک سے زائد بیویاں تھیں وہ ایک کو طلاق دینے اور اسے اپنے مواخاتی بھائی کے نکاح میں دینے کو تیار ہو گئے۔ سعد بن ربیع رضی اللہ تعالیٰ عنہ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے ساتھ گھر لے گئے اور یہ پیش کش کی۔ انہوں نے ان کی شفقت کا شکریہ ادا کیا اور صرف بازار کا راستہ پوچھا اور تجارت شروع کر دی۔ چند روز میں اتنا سرمایہ ہو گیا کہ شادی کر لی۔ رفتہ رفتہ ان کی تجارت نے اس حد تک فروغ پایا کہ خود ان کا قول تھا کہ مٹی پر ہاتھ ڈالتا ہوں سونا بن جاتی ہے۔ ان کا اسباب تجارت سات سات سو اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جس روز مدینہ منورہ پہنچتا تھا تمام شہر میں دھوم مچ جاتی تھی۔^{۳۵} اکثر مہاجرین نے صرف بقدر ضرورت نقد لے کر اپنا کاروبار شروع کیا اور جلد ہی وہ مدینہ منورہ کے متمول تاجروں میں شمار ہونے لگے۔ یہ تھی اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ کی جیتی جاگتی اور زندہ و جاوید عملی تصویر۔

اس مواخاۃ پر، اس اقتصادی تعاون و توازن پر، اس قلبی و نظریاتی یگانگت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست اور معاشرے کو استوار کیا۔ مدینہ منورہ کی چھوٹی سی بستی کے ہر ہر گھر نے اجڑے ہوئے مہاجرین کا بوجھ اٹھالیا جس کے نتیجے میں اتنی بڑی مصیبت، معاشی، سیاسی اور معاشرتی پیچیدگیاں پیدا ہونے والی تھیں، مل بانٹ کر سب نے اپنے سر پر اٹھالی اور بے شمار اجڑے ہوئے خاندانوں کا مسئلہ نہایت آسانی سے حل ہو گیا۔ درحقیقت یہ عظیم الشان اغراض اسلامی کی تکمیل کا سامان تھا۔^{۳۶} رشتہ اخوت استوار کرتے ہوئے اس نکتے کو ملحوظ خاطر رکھا گیا

کہ مواخاتی بھائی میں اُستاد اور شاگرد کا رشتہ بھی قائم ہو۔ ایسا کرتے وقت ہر فرد کے مزاج اور طبیعت کا خیال رکھا گیا۔ سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جن کی ترغیب سے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام لائے تھے) کو ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مواخاتی بھائی بنایا گیا جنہوں نے یہ مرتبہ حاصل کیا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کو سید المرسلین کہتے تھے۔ بارگاہ نبوت میں منصب انشاء پر سب سے پہلے وہی ممتاز ہوئے۔ فن قرأت کے امام کہلاتے ہیں۔ ابو حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قریش کے رئیس اعظم عتبہ بن ربیعہ کے فرزند تھے۔ اس مناسبت سے ان کو عباد بن بشر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھائی بنایا گیا جو قبیلہ اشہل کے سردار تھے۔

اس مواخاتہ کا مقصد باہمی یگانگت میں ایک دوسرے کو مربوط کرنا تھا۔ بعد میں بعض لوگ یہ خیال کرنے لگے کہ ان دینی بھائیوں کو حق تو ارث بھی مل گیا ہے تو یہ آیت نازل ہوئی:

وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ ۗ

”مگر اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔“
چنانچہ مواخات کی بناء پر قائم شدہ ورثہ رشتہ داری کی طرف پھیر دیا گیا۔ فتح خیبر کے بعد مہاجرین نے انصار کو ان کے پھلوں کے عطیے واپس کر دیئے۔

اس طرح اہل مدینہ نے خود ساختہ مخلوقات کے بچوں سے آزاد ہو کر اپنے کھوئے ہوئے رب قیوم کو پالیا۔ اب منادی کرادی گئی کہ دنیا ایک ہے اس کا معبود ایک ہے ان کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہے، ان کی کتاب ایک ہے اور ان کا کعبہ ایک ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نماز ایسی عبادت پر لگایا جس میں رنگ، نسل، امارت، غربت اور ہر طرح کی اونچ نیچ ختم ہو جاتی ہے۔

نہ کوئی بندہ رہا، نہ کوئی بندہ نواز

جس معاشرے کی بنیاد اس نوعیت کے تصور مساوات پر قائم ہو کہ آقا اور غلام باری باری سواری کریں اس کی پرچھائیں بھی کسی دوسرے نظام میں نہیں مل سکتی۔ قرآن حکیم میں اس اخوت کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔^{۳۸}

فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۗ وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ

مِنْهَا. ط

”اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔“

اس آیت کریمہ میں ان جنگوں کی طرف اشارہ ہے جو اسلام سے پہلے عرب معاشرے میں جاری و ساری تھیں اور اہل عرب ان میں بری طرح مبتلا رہتے تھے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اخوت کی تعلیم دے کر ان تمام عداوتوں اور مخالفتوں کا خاتمہ کر دیا۔

غزوہ احزاب میں مسلمان محصور ہو کر رہ گئے۔ باہر سے ہر قسم کی امداد آنا بند ہو گئی۔ سامان رسد کی اتنی کمی ہوئی کہ لوگ فاتحے کرنے لگے۔ اسی دوران کا واقعہ ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شکایت کی اور اپنا کرتہ اٹھا کر دکھایا کہ پیٹ پر ایک پتھر باندھ رکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں اپنا دامن اٹھایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لطن مبارک پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔^{۳۹}

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مساوات اور اخوت انسانی کی یہ عملی مثال پیش کی کہ ایک غلام (زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو اپنا متنبی بنایا۔ بعد میں ان کی شادی اپنی پھوپھی زاد زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ کر دی۔ اسی طرح امی بنت عم صباد بنت زبیر بن عبدالمطلب کو غریب الوطن صحابی مقداد بن الاسود کنذی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیاہ دیا۔ سریہ موتہ کے لشکر کی سرداری زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ملی۔ جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یکے بعد دیگرے ان کی شہادت کی شکل میں یہ منصب عطا ہوا۔ اس پر کئی ایک افراد معترض ہوئے لیکن اسلام جس مساوات عام کے قائم کرنے کا داعی تھا یہ اس کا ایک عملی نمونہ تھا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات کے آخری دنوں میں اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک لشکر کا سردار مقرر فرمایا اور کوئی ایک جلیل القدر صحابہ کو ان کے ماتحت کیا تو بھی اعتراضات سننے میں آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ ”تم لوگوں نے اس کے باپ کی افسری پر بھی اعتراض کیا تھا حالانکہ یقیناً وہ افسری کے قابل تھے۔“

ایک موقع پر جب کسی نے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ”جشن کا بچہ“ کہہ کر پکارا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ناراضگی کا اظہار فرماتے ہوئے کہا: ”تم میں ابھی دور جاہلیت کی خوب پائی

جاتی ہے۔“ عرب میں قبائل کی باہمی شرافت کی زیادتی اور کمی کا اس درجہ لحاظ تھا کہ لڑائی میں بھی اپنے سے کم رتبہ پر تلوار چلانا عار سمجھا جاتا تھا کہ ذلیل خون اس کی شریف تلوار کو ناپاک نہ کر دے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برملا فرمایا: ”لوگو! تم سب آدم علیہ السلام کے بیٹے ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے تھے۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل ہے نہ گورے کو کانلے پر برتری۔ اللہ کے نزدیک شرافت اور بزرگی کا معیار تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے ساتھ احسن سلوک کا حکم دیا اور خود بھی ان کا ہر دم پاس و لحاظ رکھا۔ ان کو وہی کھلانے کا حکم دیا جو آقا خود کھاتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایما پر غلاموں کو آزاد کرنے کے اقدام نے رواج پکڑا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تقویٰ کا درجہ دیا۔ زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، صہیب رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سبھی آزاد کردہ غلام ہی تھے لیکن جلیل القدر صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔

معلم اسلام نے عالمگیر محبت و اخوت کو محبت الہی کے نشان کے طور پر پیش کر کے ہزاروں مختلف طریقوں سے اس کی تلقین کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رنگ و نسل، زبان، مادی مصلحتوں اور علاقوں کی گھٹیا عصبیتوں کی بجائے انسانی تکریم کو عزیز جاننے کا حکم دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقیدہ و دین کے رشتہ پر اسلامی معاشرے کی تعمیر کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”مسلمان باہمی رحم دلی، شفقت اور ربط میں ایک جسم کی مانند ہیں جس کا کبھی ایک حصہ بیمار ہو تو سارا جسم بے داری اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔“ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاشرے میں انہی صفات حسنہ کی بدولت انسان مطمئن و حسین اور طیب زندگی کا حسین و مثالی نمونہ بن گیا۔ اسلامی معاشرے میں تمام انسانی نسلوں کی اعلیٰ و ارفع صلاحیتیں داخل ہوتی رہیں کہ ایک قلیل مدت کے اندر ایک ایسی درخشاں تہذیب نے جنم لیا جس کے تمام عناصر کا مرنا جینا اللہ کے لیے تھا۔ خاندانی، نسبی اور نسلی امتیازات کا خاتمہ ہو گیا، اس کے ساتھ ہی معاشی ناہمواریاں بھی دور ہو گئیں۔ ہمدردی و نمکساری، ایثار و احسان ایک دوسرے کے لیے رحمت بن گئے اور ایسی محبت اور دلداری پیدا ہو گئی کہ چشم فلک نے کبھی اس کی مثال نہ دیکھی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان پر عمل کیا کہ ”ہر

مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور مسلمان مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔“
 جمال یزل نے دنیاوی زندگی میں عروج و خوشحالی کی نوید سنائی بشرطیکہ مسلمان محض
 انفرادی طور پر ہی نہیں بلکہ اجتماعی اعتبار سے باہمی دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہوں اور اتحاد و
 اخوت کی لڑی میں پردے ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں عدل و مساوات، امن
 و سلامتی اور فلاح و نجات کی اساس پر ایک عظیم الشان معاشرہ قائم کیا جو ”انسانی رشتہ“ پر قائم نہ
 تھا۔ بلکہ اس کے باسیوں کو نفسیاتی، اخلاقی، معاشرتی اور عملی لحاظ سے بھی ایک دوسرے کا ہمدرد
 اور بھی خواہ بنانے کا اہتمام کیا کہ عقل اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز سمجھنے پر مجبور ہو جاتی
 ہے۔

دنیاوی خوشحالی اور عروج کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو آخرت میں
 بھی سرخرو ہونے کی نوید سنائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قیامت کے روز اللہ تعالیٰ
 فرمائے گا کہ باہم محبت رکھنے والے کہاں ہیں؟ مجھے اپنی عظمت کی قسم آج میں انہیں اپنے سایہ
 میں جگہ دوں گا۔ اور آج میرے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم
 بیعت لیتے وقت دوسرے مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی کا بھی وعدہ لیا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ
 علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی شخص اس وقت کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے مسلمان
 بھائیوں کے لیے وہ نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔

اسلام انسان کی حیاتیاتی وحدت کے عقیدے کا علمبردار ہے۔ اس نے اپنے اس
 عقیدے کی بنا پر اخوت و مساوات کا عقیدہ پیش کیا اور ساتھ ہی معاشرے میں تقویٰ کو عزت و
 تکریم کا معیار قرار دیا۔ یہ روح کی گہرائیوں میں محبت کے بیج بوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے آپ
 صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو کچھ انفرادی اور اجتماعی آداب سکھائے تاکہ وہ ایک دوسرے
 کے ممد و معاون بن سکیں۔ اجتماعی زندگی میں باہمی رضا اور سکون انہی آداب کے رہن منت
 ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے تمام افعال کی مخالفت کی جن سے دوسروں کے جذبات
 مجروح ہوتے ہوں۔ اس مقصد کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں میں اچھی باتوں کی
 اشاعت پر زور دیا تاکہ باہمی محبت فروغ پائے۔ ارشاد ربانی ہے: ^{۴۳}

وَقُلْ لِعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ط

”اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو۔“

مسلمانوں کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت ہی خود غرضانہ ماحول کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنے بہتر نظام کے باعث مسلمانوں کو اخوت کے ایک مثالی نظام میں منسلک کیا۔ ایک مشہور عربی کہاوت ہے کہ **الْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ** یعنی اصل کمال وہ ہے جس کا اعتراف کرنے پر دشمن بھی اپنے آپ کو مجبور کرے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے متعلق ایچ جی ویلز جیسا بغض رکھنے والا مصنف بھی اپنی کتاب **A Concise History of World** میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ ”انسانی حریت، اخوت اور مساوات کے وعظ تو اگرچہ دنیا میں پہلے بھی بہت کیے گئے تھے۔ چنانچہ مسیح ناصری کے یہاں بھی ان کا بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نوع انسانی کی تاریخ میں پہلی بار ان اصولوں پر مبنی نظام عملاً قائم کر کے دکھا دیا۔“

اسلام سب سے پہلے فرد کے ضمیر میں امن و سلامتی برپا کرتا ہے پھر خاندانی دائرے میں، پھر امت و قوم کے اندر اور سب سے آخر میں مختلف قوموں کے اندر اسے برپا کرتا ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو تیار ہی اسی لیے کرتا ہے کہ وہ ظالم طاقتوں کا استیصال کر کے انسانیت پر فلاح کی راہیں کھول دیں۔ گویا مسلمان ایک جماعت ہیں اور جہاد ایک انقلابی اقدام ہے۔ یہ ایک نظریاتی جدوجہد ہے۔ اگر پوری امت مسلمہ کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو جائے تو پھر جہاد ایک بین الاقوامی کارروائی کی حیثیت رکھتا ہے جو وہ کفار کے خلاف بین الاقوامی سطح پر کرتی ہے تاکہ حق کا بول بالا ہو سکے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی میں فریضہ جہاد ادا کرنے کی تمنا اپنے دل میں بیدار رکھے اور اس کے لیے مناسب تیاری بھی کرتا رہے۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ فلسفہ جہاد کا اثر زندگی کے ہر شعبہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر، خود غرضی، نسلی تعصبات، قبائلی حسد اور قائدانہ تفاخر کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی مدد سے ہم اپنے طبقاتی، لسانی، علاقائی، قومی، معاشی، معاشرتی اور روحانی مسائل حل کر سکتے ہیں۔ اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار کرنے سے ہم زندگی کے مختلف شعبوں میں

ترقی کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:

لا یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح به اولها.

”اس امت کے آخر کو اس چیز سے صلاح اور فلاح حاصل ہوگی جس چیز سے

امت اول کو صلاح اور فلاح حاصل ہوگی۔“

اگر ہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ سلامتی و امن اور اخوت کے رہنما اصولوں کو اپنی زندگی میں مرکزی حیثیت دیں تو معاشرے کی صورت مسخ نہیں ہوگی اور نسلی امتیازات نہیں ابھریں گے۔ آج دنیا میں ایک طرف جنگ و جدل کے بادل منڈلا رہے ہیں تو دوسری طرف نسلی، علاقائی اور خاندانی و قبائلی تعصبات کی آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ خود غرض، طمع اور حرص کے بے شمار سانپ کلبلا رہے ہیں۔ بلاشبہ آج بھی اگر ہم اپنے طور و اطوار اور کردار کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق ڈھال لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا میں امن و امان قائم نہ ہو اور اخوت و وحدت کی وہی فضا پیدا نہ ہو جو چودہ صدیاں پہلے قائم ہوئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام تر تعلیمات کا نچوڑ حجتہ الوداع کے خطبے میں پیش کر دیا جو سب سے پہلا منشور آزادی تھا اور جس نے دنیا کو امن، آزادی، اخوت اور وحدت کا ابدی پیغام دیا۔ اس کی پیروی میں ہی اس دکھی انسانیت کے لیے امن اور سکون کی ضمانت پائی جاتی ہے۔ آج کی دنیا اس الپے سے صرف اسی صورت میں نجات حاصل کر سکتی ہے جب ہم روزمرہ کے کاموں کے بجالانے میں زیادہ سے زیادہ خوبصورتی اور عمدگی پیدا کریں۔ اتباع سنت سے لطافت و پاکیزگی اور نظامت و نفاست کا ایسا دلنواز پہلو نمایاں ہوگا کہ زندگی کے موالات، باہمی مودت و محبت اور باہمی الفت و موانست کا مظہر بن جائیں گے۔ بقول حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ۔

بمصطفیٰ برسائے خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ او نرسیدی تمام بو لہی است

حوالہ جات

- ۱ قرآن حکیم ۲۱:۳۳
- ۲ قرآن حکیم ۲۳:۸
- ۳ سنن ابن ماجہ
- ۴ قرآن حکیم ۵۴:۲۲
- ۵ قرآن حکیم ۲۶۹:۲
- ۶ قرآن حکیم ۲۹:۴۸
- ۷ قرآن حکیم ۳۲:۵
- ۸ قرآن حکیم ۳۴:۲۷
- ۹ قرآن حکیم ۷۶:۴
- ۱۰ ابوداؤد، جلد دوم، باب خبر بنی النفیر
- ۱۱ Life of Mahomed, Vol. 3, P.122, William Muir.
- ۱۲ قرآن حکیم ۸:۷۶
- ۱۳ بخاری، مسلم فتح مکہ
- ۱۴ قرآن حکیم ۹۲:۱۲
- ۱۵ قرطبی، احکام القرآن، ج ۹۲ ص ۲۵۸ تفسیر سورۃ یوسف۔ نیز ملاحظہ فرمائیں: ابن ہشام ج ۲، ص ۴۱۲
- ۱۶ زاد المعاد جلد دوم ص ۲۹۱، ۲۹۲ حافظ ابن قیم
- ۱۷ تفسیر ابن کثیر جلد دوم، ص ۳۵۲
- ۱۸ موطا، ترمذی
- ۱۹ اس سے سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی کیونکہ علم ان کے فرزند کو مل گیا تھا
- ۲۰ واقدی بروایت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ارقم بسلسلہ غزوہ موتہ
- ۲۱ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج دوم، ص ۳۳ شبلی نعمانی
- ۲۲ قرآن حکیم ۳۹:۸
- ۲۳ بخاری باب علامات النبوة
- ۲۴ سیرت ابن ہشام، جلد دوم، ص ۵۸۱
- ۲۵ منی باب ۱۰، ص ۳۵، ۳۴

- ۲۶ قرآن حکیم ۸:۶۰
- ۲۷ قرآن حکیم ۷:۵۶
- ۲۸ قرآن حکیم ۲:۲۵۶
- ۲۹ قرآن حکیم ۲:۲۰۸
- ۳۰ بخاری، مسلم، ابو موسیٰ
- ۳۱ قرآن حکیم: ۱۰۳
- ۳۲ باب ۸، شلوک ۲۷۲
- ۳۳ قرآن حکیم ۲۹:۱۰
- ۳۴ قرآن حکیم ۲۹:۱۳
- ۳۵ اسد الغابہ ج ۳، ص ۳۱۳، ۳۱۵ بحوالہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج اول، ص ۱۷۹، شبلی نعمانی
- ۳۶ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج اول، ص ۱۸۰
- ۳۷ قرآن حکیم ۸:۷۵
- ۳۸ قرآن حکیم ۳:۱۰۳
- ۳۹ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج اول، ص ۲۵۵، شبلی نعمانی
- ۴۰ بخاری باب المغازی
- ۴۱ مسند ابن جنبل
- ۴۲ مستدرک حاکم، ج ۲، ص ۹۳
- ۴۳ قرآن حکیم ۱۷:۵۳

لسانی و گروہی اختلاف کا خاتمہ..... تعلیمات نبویؐ کی روشنی میں

اس مسلمہ حقیقت سے ہم آپؐ سبھی آشنا ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں سے صرف انسان کو ہی اس نرالی شان سے نوازا ہے کہ اسے نہ صرف دانش و عقل کی فراوانی سے مزین کیا بلکہ مرضی و ارادہ کی صلاحیتیں بھی عطا کیں۔ جس نے احکام ربانی کی جس قدر تعمیل کی وہ اتنا ہی بہتر انسان بنا۔ لیکن جو محض جبلتوں کا کہا مانتا رہا وہ اسفل السافلین کے درجے کو پہنچ گیا خواہ وہ کتنا ہی عالم و فاضل تھا۔ خالق حقیقی کو ہی بہتر طور پر معلوم ہے کہ انسان کن ضوابط و اسالیب کی تعمیل کرے اور کن باتوں کے نزدیک نہ جائے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ليس شيء اكرم على الله من المومن.

”صاحب ایمان شخص سے بڑھ کر اللہ کے نزدیک کوئی شے مکرم نہیں“

آپؐ کی بعثت کے وقت یہ عالم رنگ و بواضطراب اور بے چینی کا گڑھا تھا، ہر سو شیطانت و حیوانات کا راج تھا۔ عرب وحدت اور مرکزیت سے آشنا نہ تھے بلکہ ان پر ہمیشہ ہی تراج کا راج تھا۔ ان کی صلاحیتیں باہمی جنگوں میں صرف ہوتی تھیں۔ خود قرآن حکیم نے ان کو قوالدأ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی جھگڑا و قوم کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی وحدت و تنظیم کے بارے میں فرماتا ہے:

لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلْفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ.

”تم رہے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے۔“

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ برس کی قلیل مدت میں اللہ تعالیٰ کی ہمہ گیری،

وحدت انسانی، احترام آدمیت اور دین و دنیا کے معاملات میں ایسی ذاتی اور عملی مثالیں پیش کیں جن سے نوع انسانی کے فکر و تصور کے دھارے بدل گئے۔ ان کے صدیوں کے پرورش پائے ہوئے اسباب نزاع و اختلاف بھی ایک ایک کر کے دور ہو گئے۔ انسانی اخوت و مساوات کی یگانگت نے دشمنیوں اور کینوں کو نابود کر دیا اور کلمہ کفر و ضلالت کی جگہ کلمہ حق و صداقت کی بادشاہت کا اعلان عام ہوا۔ قوتوں اور ذاتوں کے امتیازات مٹ گئے، فخر و غرور اور جبر و ظلم کا بازار سرد پڑ گیا۔ سب انسان باہم بھائی بھائی اور حجب حقوق کے لحاظ سے یکساں قرار پائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوششوں سے ایک نیا معاشرتی نظام، ایک نئی تہذیب اور ایک نیا معاشرہ معرض وجود میں آ گیا جس نے پوری انسانیت کو اتحاد و تنظیم کا پیغام دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی ضرب کاری شرک و بت پرستی پر لگائی اور انسانوں کو خالق حقیقی کی عبادت کی راہ بتائی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو اس طرح نکھار کر پیش کیا کہ شرک کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کو ظلم عظیم قرار دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت کے عقیدے کو عقلی توجیہات کے ساتھ پیش کیا اور بتایا کہ آخری زندگی میں ہر فرد کو اپنے اعمال کی بنیاد پر جزا اور سزا ملے گی۔ یہ عقیدہ مسلمانوں کے ایسا ذہن نشین ہوا کہ دنیا کی تمام نعمتیں انعامات اخروی کے تابع نظر آنے لگیں۔ خود غرضی اور جاہ طلبی کے جذبات مدہم پڑ گئے اور ایثار، مساوات اور اخوت کا وہ جذبہ جاگ اٹھا جس نے ایسی ملت کو جنم دیا جو تمام مادی حد بندیوں کو توڑ کر پورے عالم پر چھا گئی۔ جس نے تعاون کی وہ بنیاد رکھی جو تاریخ عالم میں بے نظیر ہونے کے علاوہ اتنی مستحکم ثابت ہوئی کہ ہزاروں انقلابات اور سینکڑوں متضادم عوامل کے باوجود ہمیشہ مائل بہ وحدت رہی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تنظیم قائم کی اس کی تشکیل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو قومی، نسلی، لسانی، جغرافیائی تعصبات سے کوئی فائدہ اٹھایا اور نہ ہی ان کو دنیوی مفادات کے سبز باغ دکھائے۔ حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ تمام مدبر اور سیاستدان اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل کے لیے ایسے محرکات استعمال کرتے ہیں۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کو بروئے کار لاتے تو یہ لوگوں کی توقعات کے عین مطابق ہوتا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے قطعاً کوئی منفعت حاصل نہ کی بلکہ ان میں سے ہر چیز کو فتنہ قرار دیا اور ہر فتنے کے انسداد کے

لیے اقدامات کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی نمایاں خصوصیات میں خدائے واحد کی بندگی، عالمگیر انسانی اخوت، ہمہ گیر عدل و انصاف، اعلیٰ کلمۃ اللہ اور خوفِ آخرت سرفہرست ہیں۔ دورِ جاہلیت کے حوصلہ شکن حالات میں ایک بہترین امت کا ظہور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مساعیِ جمیلہ کا نتیجہ تھا جس کے متعلق فرمایا گیا:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.

”اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو۔“

کسی بھی معاشرے میں معیار مقرر کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ معاشرہ عقائد، روایات اور خیر و شر کے تصورات پر صدق دل سے ایمان رکھتا ہو۔ اگر دل ایمان سے خالی ہے تو روایات اور عقیدے بے جان ہو کر سکتے نظر آتے ہیں۔ اسلام ایک دائمی اور عالمگیر دین ہے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تاقیامت ہمارے لیے ایک معیار ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے عملی مثالیں چھوڑی ہیں جو امت مسلمہ کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ قرآن حکیم جیسی جامع اور سحر آگیز کتاب ہمارے پاس ہے جو ایک ہدایت ہے، حقانیت ہے اور رحمت ہے۔ اس میں ارشاد ہوتا ہے:

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرْحَمَةً وَّ ذِكْرًا لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝

”اور کیا ان لوگوں کیلئے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے؟ درحقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں؟“

یہ ہدایت بارانِ رحمت بن کر انسانیت کی مردہ روحوں میں نئی زندگی پھونک گئی کہ روحانی تروتازگی کا سامان ہو گیا۔ یہ تازگی مخلوق کو خالق کائنات کی ذات و صفات اور اس کے برگزیدہ اسماء سے روشناس کر گئی کہ ان کے قلب و روح میں اس کی محبت و یگانگت کے چراغ روشن ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی کتاب کی اساس پر، جس کا ایک ایک لفظ قانون کی

حیثیت رکھتا ہے، ایک ایسی قومیت کی بنیاد رکھی جس نے دنیا کی مختلف نسلوں اور زبانوں کے امتزاج سے ایک امت واحدہ کی تشکیل کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نسل و خون کے امتیازات کو ختم کر کے پستیوں میں گری ہوئی قوم کو ثریا کی رفعتوں سے ہمکنار کیا ہے۔

عرب جن پہ قرونوں سے تھا جہل چھایا پلٹ دی بس اک آن میں ان کی کایا تمام جزیرہ نما عرب کو اسلام سے روشناس کرانے کے بعد اسلام غلبہ کاملہ، تسلط عام اور ظہور عام کا خواہاں تھا جو میزان عدل کو قائم رکھے، شعائر الہیہ کی حفاظت کرے، دنیا کو امن و سلامتی کا پیغام سنائے۔ مساوات عامہ کی تعلیم دے، پرانے حقد و حسد کو مٹا کر نئے سرے سے الفت و محبت کی بنیاد ڈالے اور معاملات و مناوَضات کا صحیح اصول بتائے۔

قرآن حکیم مسلمانوں کی زندگیوں کو منضبط کرتا ہے۔ یہ دینی اور لادینی، روحانی اور رندانہ اور برتر اور ادنیٰ جیسی تقسیم کو انسان کی زندگی میں تسلیم نہیں کرتا۔ یہ انسان کی زندگی کو ایک ناقابل تقسیم وحدت خیال کرتا ہے۔ یہ فرد کو اللہ کے حسن اور طاقت سے مزین کرتا ہے۔ یہ ضراط مستقیم کو اختیار کرنے پر زور دیتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کو حبل اللہ قرار دیا ہے۔ سورۃ آل عمران میں **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ** کا حکم ہے۔ اس کی شرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی کہ اللہ کی یہ کتاب ہی درحقیقت اللہ کی وہ مضبوط رسی ہے جس سے اعضاء کا، چمٹ جانے کا، جڑ جانے کا اور تھام لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **هو حبل اللہ المتین**۔ اس مشہور حدیث کے راوی علی مرتضیٰ ہیں۔ اس میں قرآن حکیم کی عظمت و شوکت اس کے بلند مرتبہ اور اہمیت کا ذکر ہوا ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَقَدْ تَرَكَتُ فِيكُمْ مَا إِنْ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ فَلَنْ تَضِلُّوا أَبَدًا وَهُمْ كِتَابُ اللَّهِ.

”اور میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں جس کا سررشتہ اگر تم

مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو تم تا ابد (کبھی) گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ چیز ہے

کتاب (اللہ)۔“

بد قسمتی سے اسی حبل اللہ سے ہم اپنا تعلق توڑتے چلے گئے۔ جب تک ہم نے قرآن حکیم

کو مضبوطی سے تھامے رکھا، اسی پر اپنے سارے اعمال، اخلاق اور معاملات کا انحصار رکھا تو

انفرادی اور اجتماعی طور پر ہمارا رعب اور دبدبہ قائم رہا۔ ہم دنیا میں سر بلند اور غالب رہے۔ لیکن اس سے بے پرواہ ہوتے ہی ہم فساد اور انحطاط میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔ ارشادِ ربانی ہے: ۵

وَاطِيعُوا لِلَّهِ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ.

”اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ

تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔“

ارشادِ ربانی ہے: ۶

إِلَّا تَعْفَلُوا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ۝

”اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا۔“

لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو دنیا میں فتنہ و فساد پیدا ہو جائے گا، حق و باطل میں امتیاز

باقی نہ رہے گا۔

ہم نے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق قرآن حکیم کو مضبوطی

سے نہیں تھاما اور انتشار کا شکار ہو گئے۔

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلمان ہو کر

اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر

اقبال

محاسن اخلاق کا دوسرا ماخذ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اگر ہمیں مسلمان بننے کے

لیے قرآن حکیم کی تلاوت کی ضرورت ہے تو یقین کیجیے کہ اسے ایک عملی زندگی کی صورت میں

دیکھنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۝

”درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ تھا۔“

اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ۷

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ

ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

”اے نبی! لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو

میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔“

لا ریب رہتی دنیا تک بنی نوع انسان کے امراض قلوب و ارواح کے لیے قرآن حکیم کے بعد صاحب قرآن کی سیرت طیبہ کے مطالعہ سے بڑھ کر کوئی علاج تجویز نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل قرآن حکیم اور حیات مطہرہ روحاً ایک ہی ہیں۔ قرآن حکیم متن ہے اور سیرۃ مطہرہ اس کی تشریح ہے۔ قرآن حکیم علم ہے تو سیرۃ مطہرہ اس کا عملی نقشہ ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے شیخ عماد الدین واسطی کو ایک روز نصیحت کی:

ساری چیزیں چھوڑ کر صرف سیرۃ نبویہ کے مطالعہ اور تدبر و فکر کو اپنے اوپر لازم ٹھہرا لو۔ یقین اور ایمان کی تمام بیماریوں کے لیے یہی نسخہ شفاء ہے۔“

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ آج بھی ہم میں موجود ہے۔ یہاں سے ہمیں دینی احکام اور تمدن و تہذیب و شائستگی کا سبق ملتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر پہلو ہر مسلمان کی زندگی کی حالت اور ہر کیفیت کا آئینہ بن جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی معیار حق کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع ہی میں دین اور دنیوی کامرانیوں کی ضمانت موجود ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی محبت ہمارے قومی اتحاد کا روحانی سرچشمہ ہے۔ آج بھی اگر ہم خلوص نیت سے اپنی اصلاح کے خواہاں ہیں تو اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ سے ہدایت اور روشنی حاصل کریں۔ اگر ہم انسانی اور گروہی اختلافات کا خاتمہ چاہتے ہیں تو ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے سرموخرافے ہمیں کا وہ چاہے ہمیں کیسی ہی طاغوتی طاقتوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ اگر یہ اتباع نہیں تو پھر ہمارا زوال ہے، موت ہے۔ اگر ہمارے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سچے ہیں تو پھر ہم لوگوں کا اپنے اوپر کتنا صریح ظلم ہے کہ دیدہ دانستہ ہم خود اپنے افعال سے ہلاکت میں پڑتے ہیں۔ اس وقت ہم جن پر آشوب حالات سے گذر رہے ہیں اس کے لیے ایک انقلاب ناگزیر ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اگر محبت اور یقین قلبی کے بغیر اطاعت ہو رہی ہے تو اس میں منافقین کے ساتھ ایک مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوے ہیں لیکن اطاعت نہیں، فرائض کی ادائیگی نہیں، اوامر و نواہی کی

پرواہ نہیں، احکام کا سرے سے کوئی لحاظ نہیں تو یہ طرز عمل سراسر معصیت ہے۔ عصیان و نافرمانی کا نتیجہ ہمیشہ ہلاکت ہی کی صورت میں نکلتا ہے۔ دکھاوے کے عمل کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی قبولیت نہیں۔ جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو اپنائے گا وہ دنیوی اور اخروی فلاح سے ہمکنار ہوگا۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَمَنْ يَطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۝

”جو شخص اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرے اُس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔“

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

مَنْ يَطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اطَاعَ اللَّهَ ۝

”جس نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اُس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔“

اسلام کے ظہور سے دنیا نے جاہلانہ تعصبات اور علاقائی، لسانی اور تہذیبی عصبیتوں کی لعنت سے نجات پائی۔ ”انسانیت، جو قدر معزلت میں گری ہوئی تھی، نے قاب قوسین کی بلندی پا لی اور کائنات کی تاریکیاں سردی نور میں بدل گئیں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے تدبر و دانش، ہمدردی و غمگساری، افہام و تفہیم اور عدل و احسان کے جو جو ہر پیدا ہوئے ان میں پوری دنیا ایک سلسلہ اتحاد میں منسلک ہو گئی۔ اس سلسلہ امن و مساوات کا نام اسلام رکھا گیا۔ اسلام نے کہا:

وَ اٰخْتِلَافِ السِّنِّتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

”اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمند لوگوں کے لیے۔“

اس فرمان الہی کے پیش نظر اسلامی ریاست میں بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور صہیب رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں کوئی فرق نہ رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ۔ اسی لیے تمام تفرقے، تمام امتیازات اور تمام حد بندیاں دفعۃً ٹوٹ گئیں۔ ایک اور موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور مسلمان مسلمان

باہم بھائی بھائی ہیں۔“^{۱۲}

اسلام نے جن معاشرتی اقدار پر مبنی نظام قائم کیا، اخوت، مساوات اور باہمی اعتماد اس کی خصوصیات تھیں۔ ہجرت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخاۃ کو تعمیر ملت کے سنگ بنیاد کے طور پر پیش کیا۔ اس نظام میں ہر فرد ریاست کے امن، خوشحالی اور وحدت کا ذمہ دار تھا۔ قبائل اور نسلی تفاخر پاؤں تلے روند دیئے گئے۔ اس کی روح کی رو سے تمام مسلمان بلا امتیاز رنگ و نسل، قبیلہ اور قوم، امیر و غریب، اعلیٰ و ادنیٰ ایک برادری ہیں۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ کے مصداق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ مواخاتی نظام کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔^{۱۳}

وَ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ
فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ اِخْوَانًا وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ
مِنْهَا.^ط

”اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اخوت کو ایک محکم عمارت سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا:^{۱۴}
اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبِنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ وَ شَبَّكَ بَيْنَ اَصَابِعِهِ.
”مسلمان مسلمان کے لیے عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصے

کو قوت پہنچاتا ہے۔“

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پیوست کر کے بتایا۔ اس طرح گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر پر زور دیا کہ جس طرح بکھری ہوئی اینٹیں باہم جڑ کر مضبوط عمارت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اسی طرح مسلمانوں کی قوت کارا زان کے آپس میں جڑنے میں ہے۔ اگر وہ بکھری ہوئی اینٹوں کی مانند رہے تو ان کو ہوا کا ہر جھوٹا اثر ا لے جاسکتا ہے اور پانی کا ہر ریلا بہا لے جاسکتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً اعلیٰ و ادنیٰ کی تفریق ختم کر کے دکھائی۔ آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کی بارگاہ میں زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا دوسرے مساکین کا درجہ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کم نہ تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ غزوہ بدر میں وہ اسیر ہو کر آئے تو انصار نے اس بنا پر ان کا زرفدیہ معاف کر دینا چاہا کہ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد رشتے میں انصار کے بھانجے تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہرگز نہیں ایک دام بھی معاف نہ کرو۔“^{۱۵}

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کی تعمیر میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ برابر کام میں حصہ لیا۔ غزوہ خندق کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم باقی ساتھیوں کی معیت میں خندق کھودنے میں مصروف رہے۔ ایک دفعہ دوران سفر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا پکانے کے لیے لکڑیاں لانے کا فرض سنبھالا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کی کہ یہ کام ہم کر لیں گے تو معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں پسند نہیں کرتا کہ اپنے آپ کو تم سے ممتاز رکھوں۔ خدا اس بندے کو پسند نہیں کرتا جو ہمراہیوں میں ممتاز رہے۔“^{۱۶}

مسلمانوں کی محبت کی بنیاد صرف دین ہے۔ خونی رشتہ اور مالی لین دین نے ان کو آپس میں نہیں جوڑا بلکہ اسلام اور اسلامی زندگی پیدا کرنے کے جذبہ نے ان کو ایک دوسرے کا دوست اور رفیق بنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ^{۱۷}

تَرَى الْمُؤْمِنِينَ فِي تَرَاحِمِهِمْ وَتَوَارِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ،
إِذَا اشْتَكَى عَضُوٌّ تَدَاعَى لَهُ سَائِرَ الْجَسَدِ بِالسَّهْرِ وَاطْمَى.

”تو مسلمانوں کو آپس میں رحم کرنے، محبت کرنے اور ایک دوسرے کی طرف جھکنے میں ایسا دیکھے گا جیسا کہ جسم کا حال ہوتا ہے کہ اگر ایک عضو کو کوئی بیماری لاحق ہوتی ہے تو جسم کے بقیہ اعضاء بے خوابی اور بخار کے ساتھ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت فی سبیل اللہ کو پسند فرمایا ہے۔ معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ مروی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ^{۱۸}

”اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مجھ پر واجب ہے کہ میں ان لوگوں سے محبت کروں جو میری خاطر آپس میں محبت اور دوستی کرتے ہیں اور میرے ذکر کے لیے ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھتے ہیں اور

میری محبت کے سبب ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں اور میری خوشنودی چاہنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ نیک سلوک کرتے ہیں۔“

ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے ایک شخص گذرا۔ کچھ لوگ آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ! مجھے اس شخص سے محض اللہ کی خاطر محبت ہے۔“ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ”تو کیا تم نے اس شخص کو یہ بات بتا دی ہے۔“ وہ شخص بولا۔ ”نہیں۔“ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جاؤ اور اس پر ظاہر کر دو کہ تم اللہ کے لیے اُس سے محبت کرتے ہو۔“ چنانچہ اس شخص نے ایسا ہی کیا تو اس کے جواب میں اس دوسرے شخص نے کہا:

”مجھ سے وہ ذات محبت کرے جس کی خاطر تو مجھ سے محبت کرتا ہے۔“^{۱۹}

ایک مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: محض خوشنودی خداوندی کی وجہ سے باہم محبت کرنے والوں کے چہرے قیامت کے روز نورانی ہوں گے۔^{۲۰}

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نسل انسانی کی مساوات کا اعلان فرمایا اور نسل و شرف کے تمام امتیازات کو تسلیم کرنے سے انکار فرمایا۔ یہ امتیازات لوگوں نے بنا رکھے تھے اور ان کی وجہ سے انسانی حقوق پامال ہو رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی کے لیے معیار عظمت نسب، نسل، خاندانی وجاہت، شان و شوکت اور مال و منصب کو قرار نہیں دیا بلکہ فرمایا:

اتونی باعمالکم ولا تاتونی بانسابکم۔

یعنی ”میرے پاس اپنے نسب نامے مت لاؤ۔ مجھے اپنے اعمال نامے دکھاؤ۔“

عرب اپنے اسلاف کے کارناموں کا ذکر نہایت بلند آہنگی سے کرنے کے عادی تھے۔ حج کے موقع پر تو اس رسم پر جسے ”مناسرت“ کہا جاتا تھا، خصوصی طور پر عمل کیا جاتا تھا۔ فخر و غرور کے اظہار کا یہ طریقہ اکثر بڑے بڑے نزع پیدا کر دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ^{۲۱}

فَإِذَا قَفَيْتُهُمْ مِّنَّا سِگِّكُمْ ۖ فَادْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَائِكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۖ

”پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو، تو جس طرح پہلے اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتے تھے، اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو اس سے بھی بڑھ کر۔“

اسلام نے اس رسم کو بالکل ہی مٹا دیا لیکن اس کا اثر لوگوں کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ اس کے اظہار کی ایک صورت یہ تھی کہ وہ باپ دادا کے نام کی قسم کھاتے تھے۔ ایک دفعہ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی ایسا ہی کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ باپ دادا کے نام کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے۔ صرف اللہ کی قسم کھانی چاہیے ورنہ خاموشی بہتر ہے۔“^{۲۲}

اسلام نے اس طرح ہر فرد کو اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے حسن عمل کو درجہ آدمیت قرار دیا۔ اس آدم ساز معیار نے بنی آدم کی ہر جھوٹی نمائش اور ہر فانی سروسامانی کو زیور عظمت کے طور پر ساقط الاعتبار کر دیا۔ اسلام نے انسانیت کا اکرام سکھایا۔ قرآن حکیم کی مختلف آیات ملاحظہ ہوں:

۱- وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافَ اللَّسَانِ وَاللُّوَانِ كُمْ ط إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالَمِينَ ۝^{۲۳}

”اور اُس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش، اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمند لوگوں کے لیے۔“

۲- الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ ۝ ج ۲۴

”جو چیز بھی اس نے بنائی خوب ہی بنائی۔ اُس نے انسان کی تخلیق گارے سے کی، پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے۔“

۳- إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ إِخْوَتِكُمْ وَأَتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝ ط ۲۵

”مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو۔ امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔“

۴- يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّن ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ قِبَايِلَ يَتَعَارَفُونَ ط إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقَىٰ ۝ ط ۲۶

”لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔“

بقول اقبال ۔

آدمیت احترام آدمی باخبر شواز مقام آدمی!
فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس کا ایک ایک لفظ انسانی مساوات کا بین ثبوت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”اے گروہ قریش! آج سے اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کی نخوت و برتری ختم کر دی۔ حسب و نسب کا غرور رخصت کر دیا گیا۔ سنو سب انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام کو مٹی سے خلق کیا گیا تھا۔“^{۱۷}

اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اس معیار (قرآن حکیم ۱۳:۴۹) یعنی تقویٰ کے سوا باقی ہر معیار یعنی دولت، عہدہ، رنگ وغیرہ میں حسد و رقابت کے جذبات ہی موجزن نظر آتے ہیں۔ جماعتی گھمنڈ، اسلام اور مساوات و اخوت کے نظریات کے منافی ہے۔ کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کی تمام تر روح اخلاقی اور معنوی محاسن پر مبنی ہے۔ جس جماعت کا نصب العین یہ ہوگا کہ وہ سب سے اچھی اور نیک ہو وہ غرور اور نخوت و برتری کے مفاسد سے آلودہ نہیں ہو سکتی۔ چونکہ اسلام ایک عالمگیر دین ہے اس لیے اس کے پیش نظر صرف اور صرف بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود ہے۔ یہ وحدت پر یقین رکھتا ہے اور قبائل اور اقوام کو محض پہچان کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔ اسلامی کلچر زبان اور ادب، آرٹ اور فن تعمیر، نام اور نام رکھنے کے اصولوں، رواجات اور روایات، عادات اور میلانات کے امتیاز کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرہ رواداری پر یقین رکھتا ہے۔

معلم انسانیت نے اپنے خطبہ حجتہ الوداع، جو انسانیت کا منشور اعظم ہے، میں امت کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:^{۱۸}

”..... اے لوگو! تمہارے خون اور تمہارے مال (باہم دگر) حرام کر دیئے گئے ہیں تا

آنکے تم اپنے رب کے حضور جا کے پیش ہو جاؤ، جیسے کہ تمہارے لینے میں اور تمہارے اس شہر میں تمہارا یہ دن حرام ہے۔“

..... اے لوگو! مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ کسی شخص کے لیے اس کے بھائی کا مال (لینا) اس کی رضا مندی کے بغیر جائز نہیں۔ سو میرے بعد کہیں (اس اخوت کو ترک کر کے) پھر کافرانہ ڈھنگ اختیار کر کے ایک دوسرے کی گردنیں نہ کاٹنے لگنا۔ میں تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ جب تک اس پر کاربند رہو گے۔ کبھی راہ راست سے نہ ہٹو گے۔ وہ ہے اللہ کی کتاب! آگاہ رہو کہ میں نے بات پہنچا دی۔ اے اللہ! تو خود بھی گواہ رہو!

اے لوگو! تمہارا رب ایک ہی ہے اور تمہارا ابوالاباء بھی ایک ہے۔ تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کیے گئے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت مند وہ ہے جو زیادہ تقویٰ دکھانے والا ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی کے مقابلے میں کوئی برتری حاصل نہیں ہے اور نہ کسی عجمی کے لیے عربی کے مقابلے میں برتری ہے۔ کوئی برتری ہے تو تقویٰ کی بنا پر۔“

اسلام کا نظریہ توحید انسانوں کو رنگ و نسل کی بنیاد پر تقسیم کرنے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ وحدت کی بجائے کثرت کا تناظر شرک کی سرحدوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی لیے اس کی قومیت کی اساس رنگ و نسل یا زبان و وطن نہیں ہے بلکہ یہ ان تنگ دامانیوں سے یکسر پاک ہے۔ اس میں کسی قسم کی نسلیت، لسانیت یا وطنیت نہیں ہے۔ البتہ رنگ اور زبان کی تفریق کو وہ ایک الہی نشانی ضرور تسلیم کرتا ہے۔^{۲۹} لیکن اس کو یہ کسی انسانی تفریق و تقسیم کی حد قرار نہیں دیتا۔

ارشادات ربانی اور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مسلمان دریاؤں، پہاڑوں یا صحراؤں کی شمالاً جنوباً یا شرقاً غرباً موجودگی سے اپنے وطن کی حدود قائم نہیں کرتا۔ وہ ان حد بندیوں کی نشاندہی یا ان حدود کا دفاع صرف اس لیے کرتا ہے کہ ان میں اس کے مخصوص نظریے کی آبیاری کا موقع ملتا ہے۔ اسی لیے نسلی تفاخر اور لسانی برتری کے احساس کی نفی کی گئی ہے کیونکہ یہ معاشرے میں نفرت کا باعث بنتے ہیں۔ انسانوں کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصل رشتہ صرف ایک ہے اور یہ وہ ہے جو انسان کو اس کے

خالق سے متصل کرتا ہے۔ خدا کی زمین کو، جو محبت اور باہمی اتحاد کے لیے تھی، ہم نے باہمی اختلاف اور نزاعات کا گھر بنا دیا ہے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض احتساب میں سب سے اہم فرض رفع نزاع تھا۔ چنانچہ جب کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی شر و فساد کی خبر ملتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے جاتے اور اصلاح فرماتے۔ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں باہم کچھ ناچاقی پیدا ہو گئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی معیت میں وہاں تشریف لے گئے اور معاملے کے سلجھانے میں اس قدر دیر لگی کہ نماز کا وقت آ گیا۔ چنانچہ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درخواست کرنے پر ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز پڑھائی۔ ۳۰ اسی طرح عبداللہ بن ابی سلول ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہایت گستاخانہ پیش آیا۔ یہاں تک کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ لڑنے بھڑنے پر تیار ہو گئے۔ اس پر عبداللہ بن ابی سلول کے حامی بھی اٹھے اور فریقین باہم دست و گریبان ہو گئے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو سمجھا بچھا کر الگ کیا اور فرمایا کہ صلح فساد سے بہتر ہے۔ ۳۱ واقعہ افک کے متعلق خود مسلمانوں کے دو قبیلوں اوس اور خزرج میں سخت نزاع قائم ہو گئی اور دونوں فریق آمادہ لڑائی ہو گئے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سمجھا بچھا کر ٹھنڈا کیا۔

اس طرح لوگوں کے درمیان انس و محبت کا وہ رشتہ استوار ہوا جو انسانیت کے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصبیت کی حوصلہ شکنی فرمائی کیونکہ اس کا مطلب اس نظریہ کی دعوت دینا ہے کہ میری قوم چاہے وہ حق پر ہو یا باطل پر، وہ صحیح ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ۳۲

لَيْسَ مِنْنَا مَنْ دَعَا إِلَى عَصَبِيَّةٍ، وَلَيْسَ مِنْنَا مَنْ قَاتَلَ عَصَبِيَّةً، وَ لَيْسَ مِنْنَا مَنْ مَاتَ عَلَى عَصَبِيَّةٍ.

”وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی دعوت دے اور وہ شخص بھی ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی بنیاد پر جنگ کرے، اور ہم میں سے وہ بھی نہیں ہے جو عصبیت کی حالت میں مرے۔“

اسلام کی اساس ہی امن ہے اور اس پیغام کو اسلام کے ایک ہمہ گیر شعار ”السلام علیکم“ کے ذریعے پھیلانے کا حکم دیا گیا ہے۔ السلام علیکم کے معانی ہی تم پر اللہ کی سلامتی کے ہیں۔ اس مختصر سے دعائیہ جملہ میں ایک مستقل سلامتی کی ضمانت موجود ہے۔ اسلام کے معنی امن و سلامتی کے ہیں۔ وہ مسلمان سے اس بات کی توقع کرتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے معاون و مددگار ثابت ہوں گے۔ مسلمان انسانوں کے لیے رحمت، شفقت اور سلامتی کا موجب ہوتا ہے۔ اس رشتہ اخوت کا تقاضا ہے کہ کوئی بھی مسلمان اپنی زبان اور ہاتھوں سے کسی دوسرے مسلمان کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ.

”مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔“

(بخاری، کتاب الایمان، باب موضوع ہذا)

ہمارے لیے باہمی الفت ایک ایسی نعمت ہے جسے خدا تعالیٰ نے اپنا خاص انعام قرار دیا ہے۔ افسوس کہ ہم اس نعمت سے محروم ہو گئے اور آج باہمی الفت کی جگہ باہمی مخالفت ہماری پہچان ہو گئی ہے اور قرآن حکیم کے الفاظ میں يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُمْ بِأَيْدِيهِمْ^{۳۳} ”وہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے۔“ کے مصداق ہم نسلی علاقائی اور گروہی تعصبات کی آگ میں جل رہے ہیں۔ ہم نام کی حد تک اسلامی معاشرہ کے افراد ہیں لیکن ہمارے اندر دور دور تک یکجہتی نظر آتی ہے نہ اسلامی اخوت۔ یہ وہی اخوت ہے جس نے عربی اور عجمی، گورے اور کالے کا امتیاز مٹا دیا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ہی اثر تھا کہ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، خلیفہ ثانی نے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حبشی کے متعلق فرمایا کہ ”بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام اور ہمارے آقا ہیں۔“ اسی طرح سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا تھا کہ ”وہ اہل بیت میں سے ہیں۔“ اسلامی زندگی دراصل جماعتی زندگی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت سے الگ ہو کر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو، جو مربوط نہ ہو اور کسی امیر کے تابع نہ ہو، غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ^{۳۳}

قَالَ صَلَّعَمَ ابْنِي أَمْرَكُمْ بِخَمْسِ اللَّهِ أَعْرَبِي بَهَنَ. الجماعة والسمع

وَالطَّاعَةِ وَالْهَجْرَةَ وَالْجَهَارُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ. إِنَّهُ مَنْ خَرَجَ مِنَ
الْجَمَاعَةِ قِيدَ شَرْفَقٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ إِلَّا أَنْ يَرِاجِعَ
وَمَنْ وَعَابِدَ حَوَى جَاهِلِيَّهِ. فَهُوَ جِثَاءُ جَهَنَّمَ. قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ
وَأَنْ صَامَ وَأَنْ صَلَّى. قَالَ أَنْ صَلَّى وَصَامَ وَزَعَمَ إِنَّهُ مُسْلِمٌ.

”فرمایا: تم کو پانچ باتوں کے لیے حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے مجھے دیا ہے۔
جماعت، سمع طاعت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت
سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا
اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا تو
اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کیا ایسا
شخص جہنمی ہوگا۔ خواہ وہ روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو۔“ فرمایا ہاں۔ اگرچہ نماز
پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور بزعم خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا
ہو۔“

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہم قتال کرنے والوں کے متعلق ارشاد فرمایا: ^{۳۵}
عَنْ أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ يَقُولُ إِذَا التَّقَى الْمُسْلِمَانِ بِسَفِيهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي
النَّارِ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَذَا الْقَاتِلُ فَمَا بَالُ
الْمَقْتُولِ قَالَ إِنَّهُ كَانَ حَرِيصًا عَلَى قَتْلِ صَاحِبِهِ.

”ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ
فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب دو مسلمان اپنی تلواروں کے ساتھ ملاقات کریں
(یعنی قتال کریں) تو قاتل و مقتول دونوں دوزخ میں ہیں۔“ میں نے عرض
کیا: یا رسول اللہ! یہ قاتل (کی نسبت تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ظاہر
ہے) مگر مقتول کا کیا حال (یعنی وہ کیوں دوزخ میں جائے گا)۔ آپ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس لیے کہ وہ حریف کے قتل کا شائق تھا۔“

آپ کی بے شمار احادیث اخوت اور کینہ رکھنے کے بارے میں موجود ہیں۔ ان میں سے

دو ملاحظہ ہوں:

۱۔ تاخو فی اللہ اخوین اخوین۔

”اللہ کی راہ میں دو آدمی بھائی بھائی بن جائیں۔“

۲۔ وَلَا تَغْلُ أَفَاكَ الْمُسْلِمِ.

”اپنے مسلمان بھائیوں سے کینہ نہ رکھے۔“

جب ایک خاص مقصد افراد کی زندگیوں کی یکساں منزل گوہر بن جائے تو وہ ان کا مشترکہ نظریہ حیات بن جاتا ہے، اور اس نظریے کی وجہ سے مشترکہ مقاصد کے حامل افراد ایک نظریاتی رشتے کے بندھنوں میں بندھ کر ایک نظریاتی قوم بن جاتے ہیں۔ اس نظریے کی بدولت دنیا کے اندر ان کے قومی تشخص کی شناخت ہوتی ہے اور اس بندھن کی عدم موجودگی ان کے تعلقات کے ٹوٹنے کا باعث بن جاتی ہے اور بحیثیت ایک قوم ان کا وجود باقی نہیں رہتا۔ پاکستان کی تخلیق میں انفرادیت اور جدت کا پہلو یہ تھا کہ پاکستان زبان، نسل، علاقے یا کسی عصبیت کی بنا پر آزاد نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی اساس دین اسلام پر تھی۔ پاکستان کا قیام استدلال اور جمہوری لائحہ عمل کا نتیجہ تھا۔ پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ صوبہ پرستی اور جاہلانہ گروہی نعرے ہیں۔ قوم کا شیرازہ بکھرنے کے قریب ہے۔ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شجر سے خزاں کے سوکھے اور زرد پتوں کی مانند جھڑ جھڑ کر رہے ہیں۔ کہاں قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا اپنے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہنا..... ”بے شک یہ تیری ایک جماعت ہے“..... کہاں یہ کیفیت کہ ہم لسانی اور گروہی اختلافات میں بٹ کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان اس خون میں ڈوب گیا ہے جو کراچی اور حیدرآباد میں بھائی نے بھائی کا بہایا ہے۔ ماہ و سال آگے بڑھتے جا رہے ہیں لیکن ہم پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں۔ اسلامی روایات، معاشرتی اقدار اور قومی وقار سے ہم ہر سال کئی سال دور ہٹ جاتے ہیں۔

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی

ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

اقبال

پاکستانی پاکستانی کا دشمن کیوں ہوا ہے؟

اس کا مختصر ترین جواب یہ ہے کہ اقتدار کی ہوس نے بھائیوں کے ہاتھوں بھائیوں کا خون کر دیا ہے۔ ہم نے لسانی اور گروہی اختلاف میں پڑ کر خدا کے مقدس رشتے کی عزت کو اپنی بد اعمالیوں کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ قومی تنزل کے معنی یہی ہیں کہ تمام قومی اور دینی اشغال بظاہر قائم رہیں لیکن ان کی روح مفقود ہو جاتی ہے۔ آج ہمارا معاشرہ ظہور اسلام سے قبل والی جاہلیت سے بھی زیادہ ناہموار ہے کیونکہ وہاں صرف جہالت تھی مگر یہاں تو عیار عقل بھی اپنا کردار خوب ادا کر رہی ہے۔ یہ نفرتیں اور تعصبات اسی عقل کی ہی کارستانی ہے۔ اس وقت جس قسم کے واقعات ہمارے ہاں رونما ہو رہے ہیں اگر ان کی شدت اور سنگینی کو محسوس نہ کیا گیا تو پورے ملک کی سالمیت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ جب معاشرے بے جان ہو جاتے ہیں تو سارا معاشرہ خود حفاظتی میں لگ جاتا ہے اور حکومت جیسے مقتدر ادارے سے لے کر ایک ادنیٰ شہری تک اس جذبے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

کیا پاکستان کی تشکیل اس لیے ہوئی تھی کہ سندھی غیر سندھی کا گلا کاٹیں اور غیر سندھی سندھیوں کا جینا اجیرن کر دیں۔ شیعہ سنی ایک دوسرے کے دست و گریبان ہوں اور گھات لگا کر ایک دوسرے کو ختم کرنے کے درپے ہوں۔ مساجد کو بقلعہ نور بنا کر محافل شبینہ منانے کا اہتمام کیا جاتا ہے لیکن ہمارے دل اُجڑ گئے ہیں۔ اور قرآن حکیم کے الفاظ میں فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَ لَكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝ یعنی ”حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔“

ہمیں یہ شرف و عز حاصل ہے کہ ہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہیں جو مقصود کائنات اور نازش کون و مکان ہیں۔ ان کے طفیل اور صدقے میں ہمیں یہ پیارا سا وطن ملا۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں ہی ہمارے لیے سامان حیات ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں حق کا وہ پرچم چھوڑ گئے ہیں کہ جو اس سے آگے بڑھے گا دین سے نکل جائے گا اور مٹ جائے گا۔ جو اس سے چمٹا رہے گا وہ حق کے ساتھ رہے گا۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ کلمہ طیبہ وحدت الوہیت ہی کا پیغام نہیں، وحدت انسانیت کا پیغام بھی ہے۔ اسی ایک کلمے میں انتشار اور بد امنی سے دو چار پاکستان کے لیے امن، سلامتی اور یک جہتی کا راز مضمّن ہے اور اس کے ذریعے آج بھی ہم ہم آہنگی سے معمور ہو سکتے ہیں۔ فیضان حق ہم سب میں برابر

ویکساں ہے۔ زبان اور مزاج کا اختلاف اگر ہے تو کیا ہوا۔ ہمارا خدا ایک ہے، قرآن ایک ہے، رسول ایک ہے اور قبلہ ایک ہے۔ ہر زبان، ہر علاقے اور ہر مزاج سے مقصود خلق کی ہمدردی، عظمت اللہ اور حق کو ترقی۔ اس کے سوا کوئی چیز ہمارا مطمح نظر نہ ہونا چاہیے۔ اس تیرہ بختی کے دور میں قرآن حکیم ہی سے اپنے مسائل کا حل تلاش کریں۔ اس کی تعلیم کی روشنی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو پیش کریں تو ہمیں سامان زیست و ارتقاء مل سکتا ہے۔ ہم حالات کی پیدا کردہ اندھیری راہوں میں قرآن حکیم کو مشعل راہ بنائیں۔ یاد رکھیں کہ اندھیری شب میں شہد کی لکھیاں ان تھک جدوجہد سے جو سرمایہ جمع کرتی ہیں وہ ان کے لیے چاندنی راتوں میں عید شیریں کا خوان نعمت بن جاتا ہے۔ اگر دنیا انسانی مزاجوں، انسانی صلاحیتوں اور استعدادوں کے اختلاف کا نام ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جامع شخصیت کے سوا اس کا کوئی آخری، دائمی اور عالمگیر رہنما نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اعلان فرمایا: ^{۳۷} اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ يَعْنِي "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔" اس پیروی کا فائدہ اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے: ^{۳۸} وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ^{۳۹} یعنی "ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

ایک مغربی مفکر کا خیال ہے کہ "ہم نے ہوا میں پرندوں کی طرح اڑنا اور سمندر میں مچھلیوں کی طرح تیرنا سیکھ لیا ہے لیکن ابھی تک زمین پر انسانوں کی طرح رہنا اور چلنا نہیں آیا۔" پس اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہماری پریشانی کا مداوا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک انسانیت سے مراد شرف انسانیت اور آدمیت سے مراد احترام آدم علیہ السلام ہے۔ بدامنی اور انتشار کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ سیادت و قیادت کا معیار حسب و نسب، رنگ و نسل اور زمین و وطن خیال کیا جاتا ہے اور یہی تصور تمام برائیوں اور فتنوں کی جڑ ہے۔ اس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر کوئی کالا کلوٹا، کان کٹا حبشی غلام بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تم کو اللہ کی کتاب کے مطابق چلائے تو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔"

ہمارے موجودہ گونا گوں مسائل منافقت کی پیداوار ہیں۔ یہ روگ ہماری حیات اخلاق کو اس طرح کھا گیا ہے۔ جیسے لکڑی کو دیمک۔ بسا اوقات ہمارے قول اور فعل میں یکسانیت

نہیں ہوتی۔ ہم نئی نسل کو اخلاق سکھانا چاہتے ہیں لیکن خود معروف اخلاقی ضابطوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ہم اپنی ذات سے بلند ہو کر انداز فکر اختیار نہیں کرتے قانون سب کے لیے یکساں نہیں۔ عدم مساوات نے معاشرے کو ادھ موا کر دیا ہے۔ حقیقی معنوں میں عدل و انصاف نہ ہونے کی وجہ سے معاشرے کی صورت مسخ ہو گئی ہے۔ عوام اور خواص کے طبقے الگ الگ ہیں اور موخر الذکر کا استحصال کر رہے ہیں۔

ارتکاز دولت نے کئی ایک برائیوں کو جنم دیا ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں میں پاکستانی معاشرے نے سیاست، معاشرت، تہذیب اور ثقافت کی دنیا میں جو تماشے دیکھے ہیں اس کی تہہ میں اس طبقاتی تفریق اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے استحصال کا ہاتھ ہے۔ مجموعی طور پر ہمارا معاشرہ دو طبقوں میں منقسم ہے، ایک طبقہ خواص اور ایک طبقہ عوام۔ طبقہ خواص جو آبادی کا کم و بیش ایک فی صد ہے ہمارے اختیار اور ملکی وسائل پر قابض ہے۔ اس کے علی الرغم طبقہ عوام، جو آبادی کا ۹۹ فی صد ہے، بے اختیار اور جبر کا شکار ہے۔ سندھ میں معاشرتی ڈھانچہ ابھی تک جاگیردارانہ زیست کا حامل ہے۔ ہاری مکمل طور پر وڈیروں پر انحصار کرتے ہیں جن کو یہ خدشہ ہے کہ اگر ان کی گرفت ہاریوں پر ڈھیلی ہوئی تو ان کا وقار خاک میں مل جائے گا۔ اس لیے انہوں نے تشدد اور لاقانونیت کی راہ اختیار کر لی ہے، دوسری طرف محرومیوں کے شکار نو جوان طبقے کی ان کے بزرگ لاقانونیت اختیار کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

یہ سب چیزیں وہ ہیں جن کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مخالفت فرمائی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود آغاز شب سے قبل ہی گھر میں رکھی ضرورت کی چیزیں حاجت مندوں میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ جب ہم ایثار، مساوات اور قول و فعل کی ہم آہنگی پیدا نہیں کریں گے تو نسلی امتیازات کا ابھرنا ایک ناگزیر عمل ہے۔ جب انصاف سب کے لیے یکساں نہیں ہوگا تو گروہی تعصبات اور اختلافات جنم لیں گے۔ جب مساوات کا عمل باقی نہ رہے اور معاشرہ زر پرستی اور لوٹ کھسوٹ کا شکار ہو جائے تو پھر معاشرہ میں وحدت اور یکجہتی کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟

اپنے منافقانہ رویے کی وجہ سے ہم سیرت مطہرہ کے متعلق بہت کچھ جاننے کے باوجود صحیح معنوں میں مسلمان نہیں بن سکتے۔ آج ہم ایک تاریکی سے نکلنے کے لیے دوسری تاریکی میں ڈوب جاتے ہیں اور تاریکیوں کا یہ عالم ہے کہ خود اپنا ہاتھ بھائی نہیں دیتا۔ کیا ایسے میں اپنے ہی

جیسے کھوئے ہوؤں کا دامن پکڑنا چاہیے، جہاں طالب بھی در ماندہ ہے اور مطلوب بھی در ماندہ۔ اگر ہمارے فکر و عمل اور ظاہر و باطن میں صداقت کا رشتہ استوار ہو جائے تو ہماری بقا یقینی ہو جائے گی۔ موجودہ نسلی و گروہی تعصبات سے جنم لینے والے بحران کا ایک ہی حل ہے کہ ہم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں تاکہ ہمارے قلوب میں کچھ جنبش ہو، کچھ خلش اور فکر پیدا ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو سچائی تھی اس کو اپنا قیمتی اثاثہ سمجھ کر اختیار کریں۔ حقدار کو اس کا حق دیں اور احساس فرض کو عزیز جانیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلطان عادل کو خدا کا سایہ قرار دیا ہے۔ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو قبیلہ بنی مخزوم کی فاطمہ نامی ایک عورت کی چوری کا مقدمہ پیش ہوا۔ چونکہ اس کا تعلق ایک بااثر قبیلے سے تھا اس لیے اس کی بریت کی سفارش کی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر سفارش مسترد کر دی کہ ”اگر اس کی جگہ میری بیٹی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی اس جرم کی مرتکب ہوئی ہوتی تو میں اُسے بھی یہ سزا ضرور دیتا۔ یاد رکھو کہ تم سے پہلی امتوں پر اس لیے عذاب نازل ہوتے تھے کہ وہ بااثر مجرموں کو چھوڑ دیتے تھے اور عام لوگوں کو سزا دیتے تھے۔“

دنیا عدل و انصاف کے اس اعلیٰ معیار سے آشنا ہوئی جس نے رنگ و نسل اور قوم و وطن کے تمام امتیازات کو مٹا کر رکھ دیا۔ اسوۃ الرسول کی روشنی میں اگر ہم عدالتی نظام اس طرح تشکیل دیں کہ سستا اور فوری انصاف ممکن ہو تو معاشرے میں عدل و مساوات قائم کرنے میں بے حد مدد مل سکتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مساوات اور انسانی برابری کی یہ عملی مثال پیش کی کہ اپنے غلام زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نکاح اپنی پھوپھی کی بیٹی اور قریش زادی زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کروایا کیونکہ! قول اقبال ۔

تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اسلام کا ^{مطمح} نظر چونکہ انسانیت کی فلاح و بہود ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ روحانی، مادی، فکری اور طبعی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا جائے۔ لیکن یہ استعمال عین اسلامی ہدایات کے مطابق کیا جائے کہ مختلف النوع صلاحیتوں کے ارتقاء میں توازن برقرار رہ سکے اور کاروان حیات افراط و تفریط کی کشمکش سے نکل کر صحیح معنوں میں فلاح کی راہ اختیار کر سکے۔ ہمیں نسلی،

انسانی و علاقائی تعصبات پر مبنی لایعنی محاذ آرائیوں کی بجائے اپنی توانائیاں ملک و ملت کی تعمیر و ترقی پر صرف کرنی چاہئیں۔ اسلامی ضوابط کی غرض و غایت یہی ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی ہر قسم کے اختلال سے محفوظ رہے اور معاشرے میں فتنہ و فساد پیدا نہ ہونے پائے جو اجتماعی زندگی کے نظام کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتا ہے۔ قوانین وضع کرتے وقت جائز انفرادی انسانی حقوق کا پورا پورا خیال رکھا جائے اور کسی بھی انفرادی حقوق اور اجتماعی قوانین میں تصادم پیدا نہ ہونے پائے۔ مزید برآں اجتماعی قوانین سے افراد کے درمیان باہم محبت کو فروغ ہو کیونکہ ایک اچھی اور با سلیقہ زندگی کے لیے اتحاد، افہام و تفہیم اور بھائی چارہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی موجودگی میں اجتماعی زندگی کی بنیادیں زیادہ سے زیادہ مستحکم ہو جائیں گی لیکن اس کی عدم موجودگی میں پرامن انسانی زندگی پر منفی اثرات مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی بدولت افراد اجتماعی نظام کے عقیل، فہیم اور حق شناس کارکن بن جائیں گے۔ بردباری اور اخوت اسلامی تعلیمات کی ممتاز خصوصیات ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مسجد، مکتب اور دارالعلوم سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

ان نسلی اور گروہی اختلافات کو دور کرنا کوئی جوئے شیر لانے کے مترادف نہیں ہے۔ اس کے لیے ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے لبرل نکتہ نگاہ اختیار کرنا ہوگا۔ ہمارا معاشرہ ایک روادار معاشرہ ہونا چاہیے۔ صرف اور صرف اسی صورت ہی ہم آزاد اور ایک باعزت قوم کی حیثیت میں زندہ رہ سکتے ہیں۔ وقت ہماری حمایت میں نہیں ہے اس لیے جس قدر جلد ہو سکے ہمیں اس دلدل سے نکلنا ہوگا۔ کچھ اندرونی اور بیرونی قوتیں اس وقت پاکستان میں انتشار و نزاج کی صورت پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ہمیں جمہوری انداز فکر اپنانا چاہیے اور ساتھ ہی چوکنا بھی رہنا ہوگا۔ اسلام اجارہ داری کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے اس لیے عوام اور صوبے آپس میں کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر عمل کریں کیونکہ کسی بھی خطے کے عوام اکیلے اپنے طور پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ صرف وہ ہی محبت وطن اور پاکستان کے محافظ ہیں۔ ہمیں ہر بات کو من حیث القوم سوچنا چاہیے نہ کہ چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں کیونکہ اس طرح شکوک اور بد اعتمادی کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں بغیر کسی تردد اور بغض کے حقدار علاقوں اور لوگوں کی اعانت کرنا ہوگی۔

اب کچھ باتیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اجتہاد کے حوالے سے بھی ہو جائیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو ان سے دریافت کیا کہ کس طرح احکام دیا کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا کہ: ”اللہ کی کتاب کے مطابق۔“ فرمایا: ”اگر تم قرآن حکیم میں مطلوبہ چیز نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟“ عرض کیا کہ: ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق احکام دیا کروں گا۔“ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا کہ: ”اگر سنت میں بھی مطلوبہ چیز نہ ملی تو کیا کرو گے؟“ عرض کیا: ”میں اپنی رائے کے مطابق اجتہاد کروں گا اور کوئی دقیقہ نہیں چھوڑوں گا۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جواب کو نہ صرف پسند فرمایا بلکہ ان کے حق میں دعا بھی فرمائی۔“

اس حدیث مبارک کی روشنی میں ہم لسانی اور گروہی اختلاف کے خاتمے کے لیے کچھ ایسی تجاویز جن کو ہم اجتہاد کے اصولوں پر رکھ سکتے ہیں، پیش کرتے ہیں جیسے:

۱۔ ملک کا مستقبل صرف اس بات میں پایا جاتا ہے کہ باقاعدگی سے تمام انتخابات کا انعقاد عمل میں آئے۔ کوئی بھی ایسا نظام ہمارے لیے موزوں نہیں ہے جس میں عوام کو احساس شرکت حاصل نہ ہو۔ جمہوری عمل کسی نہ کسی طرح جاری رہنا چاہیے۔ سیاسی آزادیاں اور بنیادی حقوق بحال رہیں۔ سیاسی جماعتوں کو بھرپور کام کرنے کا موقع ملے۔ وقت کے ساتھ ساتھ پیشہ ور اور خود غرض سیاستدان خود بخود منظر سے ہٹتے چلے جائیں گے اور ایک نئے دور کا آغاز ہوگا جس میں نفرت اور شک کے بادل چھٹ جائیں گے۔ جس طرح ایک ویران مکان میں بددروہیں ڈیرا جما لیتی ہیں۔ اسی طرح فرقہ واریت اور نسل پرستی کی برائیاں بھی اس ملک کے سیاسی ڈھانچے میں رچ بس جاتی ہیں۔ جہاں جمہوریت نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ صوبائی خود مختاری کا دائرہ وسیع کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے۔

۲۔ ہم کسی ایسی تحریک کو پنپنے نہ دیں جو اسلام کے بنیادی عقائد..... توحید رسالت اور آخرت..... سے منحرف کرنے والی ہو۔ جس طرح بھی ممکن ہو ایسی ہر تحریک کا مقابلہ کرنا پاکستان کی بقا کے لیے ضروری ہے۔

۳۔ ہم آئندہ نسلوں تک انتقال میراث کا اہتمام کریں کیونکہ پاکستان دراصل اس زمین کا

نام نہیں ہے، اس کے بہادروں اور دریاؤں کا نام نہیں بلکہ یہ ان انسانوں کا نام ہے جو اس سرزمین میں رہتے ہیں۔ ہماری تہذیب، ثقافت، تمدن اور نظام زندگی اگر باقی رہ سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں کہ اپنے اسلاف سے حاصل کردہ میراث نہایت دیانتداری سے اگلی نسلوں کو منتقل کریں۔

۴۔ حدیث نبوی ہے کہ ”علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔“

تعلیم کی بدولت فرقہ وارانہ تعصبات ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ ہمدردی، شفقت، تعاون اور یکجہتی کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ یہ انتظامی، معاشرتی اور سیاسی امور میں دلچسپی لینے کا رجحان پیدا کرتی اور انہیں حقوق و فرائض سے آگاہ کرتی ہے۔ اس کو عام کیا جائے اور خصوصاً تعلیم نسواں اور تعلیم بالغاں پر توجہ دی جائے۔

۵۔ قانون کا نفاذ بغیر کسی رو رعایت کے ہونا چاہیے (ہمارے پاس قبیلہ بنی مخزوم کی ایک مجرمہ کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال موجود ہے)۔ اس کے بعد ہی حکومت اپنی خفیہ ایجنسیوں کے ذریعے دہشت گردوں اور تخریب کاروں کی موثر طریقے سے سرکوبی کر سکتی ہے۔

۶۔ سیاسی جماعتوں کو کسی طرح بھی دہشت گردوں کی پشت پناہی نہیں کرنی چاہیے۔ ان پر یہ لازم ہے کہ وہ کارکنوں اور جرائم پیشہ افراد میں تمیز پیدا کریں۔ ان کو طلباء کو اپنی مطلب براری کے لیے اپنا آلہ کار نہیں بنانا چاہیے۔ کتنے ہی نوجوان ایک دوسرے پر فائرنگ سے ہلاک ہو چکے ہیں اور ایک مسلمان کا عداً قتل گویا پوری انسانیت کا قتل ہے (حدیث نبوی)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی رو سے کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور اس کا ٹھکانہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم ہے۔

۷۔ ملکی مفادات اور معاشرے کی، احتیاجات کی خاطر نسلی اور علاقائی امتیازات کو ختم کیا جانا چاہیے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم نے سیاسی، معاشی اور لسانی مفادات کی آڑ میں سیاسی جماعتوں کی تشکیل شروع کر دی ہے۔ مدبر کا تقاضا یہ ہے کہ ہم مختلف نام پیدا کرنے اور

دولت اکٹھی کرنے کے لیے بیرونی آقاؤں کے اشارہ پر نہ ناچیں، یہ راستہ کھلم کھلا تباہی کا راستہ ہے۔

۸۔ حکومت کا یہ فرض اولین ہے کہ وہ ملک کو اس کے اساسی نظریات کے مطابق چلائے۔ معاشرے کی اصلاح کی ابتداء حکمران کی ذات اور ایوان حکومت سے ہونی چاہیے کیونکہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ رعایا اپنے حکمرانوں کی تقلید کرتی ہے۔ حکومت چاہے تو اپنے تمام وسائل بروئے کار لا کر معاشرے کے کسی بھی طبقے کے ساتھ ہونے والے استحصال کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

۹۔ موجودہ جمہوری نظام میں کامیابی کے ضامن روپیہ، غنڈے، انتظامیہ کورسوت اور جعلی ووٹ جیسے عناصر ہیں۔ اس طرح فرقہ وارانہ تعصبات اور جوڑ توڑ کی سیاست جیسے فتنے پر روش پاتے ہیں۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ یعنی قتل بڑی چیز ہے مگر اس سے زیادہ بری چیز فتنہ فساد ہے۔

رائے دہی کے موجودہ نظام کی جگہ مناسب نمائندگی کے طریقے کو رواج دیا جائے تاکہ مختلف گروہوں کے درمیان تعصب نہ پھیلے اور ووٹ بھی ضائع نہ ہوں۔ اس طریقے سے چھوٹی چھوٹی جماعتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں اور جعلی ووٹنگ کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ دین اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کا اہتمام کیا جائے تاکہ مذہبی اور اسلامی اخوت کے جذبات کے تحت فرقہ واریت کی حوصلہ شکنی ہو۔ برادری، ذات پات اور قبائلی نظام قوم میں باہمی منافرت کے بیج بوتے ہیں، اس لیے ان کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔ ہماری تربیت کا عمل جاری رہنا چاہیے۔ حقیقی تربیت یہ ہے کہ تربیت یافتہ فرد اپنے مربی کے اوصاف اور صفات کا آئینہ دار بن جائے۔ ہمارے مربی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

ہمارے سادہ لوح پاکستانی مسلمان خود کو مسلمان کہلوانے کی بجائے شیعہ، سنی، بریلوی، دیوبندی وغیرہ کہلوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان فقہی اختلافات کو کم کرنے میں علماء کرام ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ اس لیے ان کو اپنے صحیح وارث ہونے کا ثبوت دینا چاہیے۔

۱۱۔ قومی زبان اردو کی اہمیت اپنی جگہ لیکن ہم علاقائی زبانوں اور تہذیبوں کی اہمیت سے بھی چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ ملک کی تمام ادبیات چاہے وہ اس ملک کی کسی بھی زبان میں کیوں نہ ہوں کو قومی ادب قرار دینا چاہیے۔ ادب چاہے چترالی، کشمیری، بلتی یا ارمری زبان کا ہو یا پنجابی، سیدھی، پشتو، بلوچی اور براہوی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کا ہو لیکن جو پاکستان کی جغرافیائی حدود کے اندر تخلیق کیا گیا ہو وہ سب ہمارا قومی ورثہ ہے۔ زبانوں کی ترقی اور باہمی قرب و یگانگت کی فضا بھی وجود میں آئے گی۔

۱۲۔ ذرائع آمد و رفت و مواصلات کو ترقی دی جائے۔ کم ترقی یافتہ علاقوں کی ترقی کی طرف خصوصی توجہ دی جائے تاکہ معاشرتی تفاوت معاشرتی منافرت کی وجہ نہ بنے۔ کھیلوں، ثقافت اور ذرائع ابلاغ کو ترقی دی جائے۔

۱۳۔ بین الصوبائی سطح پر طلباء اساتذہ اور صحافیوں کا تبادلہ کیا جائے۔ یہ امر ذہن نشین رہے کہ مشرقی پاکستان کی ۸۸ فی صد مسلم آبادی کے تعلیمی اداروں میں اساتذہ کی بیشتر تعداد ہندوؤں پر مشتمل تھی، جنہوں نے طالب علموں کے دلوں میں اسلام اور ملک سے نفرت کے جذبات کی آبیاری کی اور صوبائی، لسانی اور ثقافتی عصبیت کو ابھارا۔ انجام ہمارے سامنے ہے۔

اب سندھ میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے جہاں ہندو اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے جو ہماری نئی نسل کے ذہنوں کو زہر آلود کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم کا واضح حکم سورۃ الکافرون کی صورت میں موجود ہے کہ کافر تمہارے دوست نہیں ہو سکتے۔ ان ہندو اساتذہ پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں حکومت، مسلمان اساتذہ اور سیاستدان نہایت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

مختصر نسلی اور گروہی اختلافات کے خاتمے کے لیے ہمیں ان تاریخی غلطیوں کا ازالہ کرنا ہوگا جو ماضی میں ہم سے سرزد ہوئیں۔ اس کے لیے دو پیشگی تقاضے ضروری ہیں:

اولاً: معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے با معنی مستقبل کے لیے بصیرت کی تشکیل جس کی قوت بصارت سے زیادہ ہوتی ہے۔

ثانیاً: اس بصیرت کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سیاسی پابندی۔

اگر ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں اجتہاد کرتے ہوئے اپنی اصلاح کر لیں تو تائید ایزدی بھی ہمیں حاصل ہوگی، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ^{۴۲}

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ ۝

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جمادے گا۔“

بصورت دیگر:

ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا
بِأَنْفُسِهِمْ. ^{۴۳}

”یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔“

یہاں یہ بات ذہن میں کھٹکتی ہے کہ بہتر سے بہتر ارادے ہمارے اذہان میں پروان پا رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ تعلیمات بھی ہمارے پاس ہیں لیکن پھر بھی ہم روبہ زوال کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اپنے دلوں میں وہ گرمی موجود نہیں ہے؟ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے پیدا ہونی چاہیے تھی۔ وہ تپش مفقود ہے جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کو گرماگئی تھی۔ حالانکہ ہم بھی مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

وہ زمانہ کیا ہوا جب مری آہ میں اثر تھا

یہی چشم خوں فشاں تھی یہی دل یہی جگر تھا

دل آشیانہ محبت ہے اور مومن اس کی آرائش سے غافل نہیں ہوتا۔ اگر ہم اپنے وطن کے چمن کو سجانا اور اسے ہر طرح کی بادِ سموم سے بچانا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ یہاں سے اٹھنے والی ہوائیں محبت و رفاقت کے پیغام لے کر ابھریں:

جز محبت ہر چہ بُردم، سود در محشر نداشت

دین و دانش عرضہ کردم، کس بہ چیزے برداشت

(نظیری)

حوالہ جات

- ۱ قرآن حکیم ۸: ۶۳
- ۲ قرآن حکیم ۳: ۱۱۰
- ۳ قرآن حکیم ۲۹: ۵۱
- ۴ مسلم کتاب الحج باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
- ۵ قرآن حکیم ۸: ۳۶
- ۶ قرآن حکیم ۸: ۷۳
- ۷ قرآن حکیم ۳۳: ۲۱
- ۸ قرآن حکیم ۳: ۳۱
- ۹ قرآن حکیم ۳۳: ۷۱
- ۱۰ قرآن حکیم ۴: ۸۰
- ۱۱ قرآن حکیم ۳۰: ۲۲
- ۱۲ مستدرک حاکم ج ۲، ص ۹۳
- ۱۳ قرآن حکیم ۳: ۱۰۳
- ۱۴ بخاری کتاب الادب، باب تعاون المومنین بعضهم بعضاً، مسلم کتاب البر والصلۃ باب تراحم المومنین و تعاطفهم و تعاضدهم (الفاظ بخاری کے ہیں)۔
- ۱۵ رسول رحمت ص ۶۸۷ مولانا ابوالکلام
- ۱۶ بحوالہ ایضاً
- ۱۷ بخاری کتاب الادب رحمة الناس و البهائم
- ۱۸ موطا امام مالک کتاب الشر باب ما جاء فی المتحابین فی
- ۱۹ ابوداؤد، کتاب الادب، باب اخبار الرجل بحبته اباہ
- ۲۰ ترمذی کتاب الزهد باب ما جاء فی الحب فی اللہ
- ۲۱ قرآن حکیم ۲: ۲۰۰
- ۲۲ سنن ابن ماجہ ص ۳۹۷
- ۲۳ قرآن حکیم ۳۰: ۲۲
- ۲۴ قرآن حکیم ۳۲: ۷-۸

- ۲۵ قرآن حکیم ۱۰:۳۹
- ۲۶ قرآن حکیم ۱۳:۳۹
- ۲۷ ابن ہشام حصہ دوم ص ۴۷۸
- ۲۸ بخاری، مسلم باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
- ۲۹ قرآن حکیم ۲۲:۳۰
- ۳۰ ابوداؤد ج ۲، ص ۲۱۸
- ۳۱ ابوداؤد، ج ۲ ص ۲۱۱، سیرت ابن ہشام حصہ دوم ص ۳۳۵-۳۳۶
- ۳۲ ابوداؤد کتاب الادب، باب فی العصبیہ عن جبیر بن مطعم
- ۳۳ قرآن حکیم ۲:۵۹
- ۳۴ مسند احمد ج ۵، ص ۳۳۳
- ۳۵ بخاری کتاب الایمان، باب وان طائفتان من المؤمنین اقلوا فاصلحوا بینہما
- ۳۶ قرآن حکیم ۴۶:۲۴
- ۳۷ قرآن حکیم ۳۱:۳
- ۳۸ قرآن حکیم ۲:۶۲
- ۳۹ مسلم جلد ۵، ص ۱۲۶، کتاب الامارت
- ۴۰ بخاری، مسلم، ابوداؤد، کتاب الحدود وکتاب بدء الخلق
- ۴۱ ابوداؤد کتاب الاقضية، باب اجتهاد امران فی القضاء
- ۴۲ قرآن حکیم ۷:۴۷
- ۴۳ قرآن حکیم ۵۳:۸

اسلامی فلاحی ریاست اور اس کے تقاضے

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ اس کا تعلق صرف دنیاوی امور سے ہی نہیں بلکہ اخروی زندگی سے بھی ہے۔ اسلامی ریاست کا قیام ان اعلیٰ اقدار کے حصول کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے پسند فرمائی ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رہنما، حاکم اور معلم بھی تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے قانون الہی کی تشریح کرنا اور اس کی منشاء کے مطابق افراد کی تربیت کرنا تھا۔ پھر ان تربیت یافتہ افراد کو ایک منظم جماعت کی شکل دے کر معاشرے کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرنا بھی تھا۔ پھر اس اصلاح شدہ معاشرے کو ایک صالح و مصلح ریاست کی صورت دے کر یہ دکھانا بھی مقصود تھا کہ اسلام کے اصولوں پر ایک مکمل تہذیب کا نظام کس طرح قائم ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ برس تک شب و روز محنت کر کے ایک عظیم الشان تحریک برپا کی اور اپنی قیادت و رہنمائی میں ایک نیا معاشرہ اور ایک نئی ریاست قائم کی۔ اس معاشرے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہر وقت ایک مستقل نمونہ ہدایت بنی رہی۔ اسلام نے انسان کی زندگی کے تمام شعبوں میں توازن پیدا کر کے اسے کامل زندگی بسر کرنے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہو جب طرز حکومت اس سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ دین کا جزو بھی ہوئی۔ اسلام کے نزدیک ریاست کا مقصد محض دفاع اور امن و امان برقرار رکھنا ہی نہیں بلکہ اس کے اعلیٰ مقاصد میں اجتماعی عدل اور معاشرتی فلاح بھی داخل ہیں۔ بالفاظ دیگر ریاست کو صحیح معنوں میں فلاحی اور خادم خلق ہونا چاہیے۔ اسلام نے ریاست کے فلاحی ہونے کو نہ صرف نظریاتی طور پر تسلیم کیا ہے بلکہ اس کے لیے عملی بنیادیں بھی فراہم کی ہیں۔

اسلام میں ریاست کے فلاحی تصور کی بنیاد اس عقیدہ پر قائم ہے کہ مقتدر اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور انسان روئے زمین پر اس کا نائب ہے۔ اس کا اولین فرض اپنے آقا کی منشاء کی تکمیل ہے۔ اس لیے ریاست کو نظریاتی طور پر اللہ کے دین کا عکاس ہونا چاہیے کیونکہ اگر

ریاست کی اساس اسلامی اقدار پر ہوگی تو فلاح کا تصور بھی انہیں اقدار سے جنم لے گا۔ قدرتی امر ہے کہ یہ تصور بھی احکام ربانی کے تابع ہوگا۔ ریاست افراد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے گئے حقوق نہ تو منسوخ کر سکتی ہے نہ معطل، محض انسانی عقل معاشرہ کی فلاح کی ضامن نہیں ہو سکتی کیونکہ انسانی فلاح کے پیمانے ہر لحظہ تبدیل ہوتے رہیں گے۔

اسلامی عقائد میں دنیا اور آخرت لازم و ملزوم ہیں جیسا کہ اس قرآنی دعا سے معلوم ہوتا ہے:

رَبَّنَا اِنَّا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةٌ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝
 ”اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی،
 اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔“

اسلام دنیاوی فلاح کو بھی آخرت کی فلاح کے تابع رکھنے کا خواہاں ہے۔ مادی ترقی اور خوشحالی نہ مقصود بالذات ہے اور نہ ناپسندیدہ شے۔ ہماری کاوشوں کا منتہائے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ ایسے انفرادی اور اجتماعی حالات و اسباب پیدا ہو جائیں اور ایسا ماحول قائم ہو جائے جو انسان کی اخلاقی طاقت کی ترقی میں معاون ثابت ہو۔ اس اصول کے مطابق اسلام ہر مسلمان کے دل میں ہر چھوٹے بڑے کام کے موقع پر اخلاق ذمہ داری کا احساس جاگزیں کرنا چاہتا ہے۔ فلاحی ریاست کا اسلامی تصور بنیادی طور پر ریاست کو اس امر کا پابند بناتا ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی نہ صرف جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے بلکہ اس کے عقائد و عبادات، اخلاق اور مادی و روحانی ارتقاء کی صورت گری کا فریضہ بھی اُس کا ہی ہے۔ اسلام نے ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے۔^۱

اِنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَانَ مِثْلَ قَتْلِ النَّاسِ
 جَمِيْعًا.^ط

”جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔“

اسلامی فلاحی ریاست میں ہر فرد ایک دوسرے کی زندگی کے بقاد تحفظ میں مددگار بننے کا جذبہ رکھتا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان و مال کے ساتھ حرمت و

آبرو کا بھی حکم دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”بدترین زیادتی کسی مسلمان کی عزت پر حملہ کرنا ہے۔“

نیز فرمایا: ”لوگو! تمہارے مال اور خون ایک دوسرے پر ایسے حرام ہیں جیسے آج کے دن، اس شہر اور اس ماہ کی حرمت ہے تا آنکہ تم اپنے رب سے جا ملو۔“

انفرادی کردار، خانگی معاشرت، تمدنی زندگی، سیاست، کاروبار، عدالت، میدان کارزار، بین الاقوامی امور غرض زندگی کے ہر پہلو کا اخلاقی اقدار نے احاطہ کیا ہوا ہے اور ان تمام کا مقصد اخوت پر مبنی ایک فلاحی معاشرے کی تشکیل ہے۔ اگر ریاست کا کوئی قانون یا اقدام مخرب الاخلاق ہو یا اس سے دین زاری پیدا ہوتی ہو، تو وہ ریاست دیگر فلاحی کام ہی کیوں نہ کر رہی ہو، فلاحی ریاست کے اسلامی تصور پر ہرگز پوری نہیں اتر سکتی۔ اسی طرح اگر وہ اپنے ہاں لادین نظام تعلیم نافذ کرتی ہے تو وہ زندگی کے بعض دوسرے دوائر میں کئی ایک مفید امور کی انجام دہی کے باوصف فلاحی ریاست کے اسلامی تصور کی ہرگز نمائندگی نہیں کرتی۔ بالفاظ دیگر ریاست صرف اور صرف اسی صورت میں ہی اسلامی فلاحی ریاست کہلانے کی مستحق ہوگی جب اس کی اجتماعی قوت اسلام کے زیر نگیں ہو۔ اس کی حکمت عملی اور ہر اقدام اسلام کے نفاذ کے لیے ہو۔ محض زبانی دعوے کافی نہیں ہوں گے۔ چونکہ اسلام دین کامل ہے اور مکمل ضابطہ حیات ہے اس لیے اسلامی ریاست کا فلاحی تصور نظم حکومت، دیوانی اور فوجداری قانون، ضابطہ اخلاق و اعمال اور نظام تعلقات خارجہ سب پر حاوی ہے۔

فلاحی ریاست کے اسلامی تصور کی اس تمہید کے بعد اس کی جزئیات پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا درجہ عدل و انصاف کا ہے۔ اسلامی نظام عدل کی مثال آج بھی کسی جدید ترین نظام حکومت میں بھی تلاش نہیں کی جاسکتی۔ اسلام قومی تنظیم کی بنیاد ایک متوازن عدل اجتماعی پر رکھتا ہے وہ معاشرے کو **Haves and have not** میں تقسیم نہیں کرتا۔ وہ چند ہاتھوں ارتکاز دولت کا مخالف ہے تاکہ ملت کی اکثریت نان و نفقہ کی محتاج نہ رہے۔ اسلام کے نزدیک عدل سے مراد زندگی کے معاملات کی صحیح عقائد و نظریات پر بالکل توازن سے استوار کرنا، افراط و تفریط کے درمیان اعتدال کی راہ پر گامزن ہونا حرام کی جگہ حرام اور حلال کو حلال کی جگہ رکھنا، زیادہ اہم کو زیادہ اہم اور کم اہم کو کم اہم سمجھنا، جو اس کے حقوق ہیں

وہی اس کے حقوق قرار دینا، نہ ان کو گھٹانا اور نہ بڑھانا ہے۔ عدل کے بارے میں ارشادات ربانی ملاحظہ ہوں:

۱- اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاكَ اللّٰهُ ۗ وَلَا تَكُنْ لِلْخَاِءِ نِيْنٍ خَصِيْمًا ۝^۵

”اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔“ تم بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو۔“

۲- وَاْمُرْتُ لَاعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۗ^{ط۶}

”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔“

۳- اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُوْلٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۙ^ك

”ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف لائے جائیں تاکہ رسول ان کے مقدمے کا فیصلہ کریں تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“

۴- فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحْكَمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝^۹

”اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں، بلکہ سربسرت تسلیم کر لیں۔“

۵- وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۗ^{ط۹}

”اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔“

۶- وَاِنْ طَآئِفَتٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْ بَغَتْ اِحْدَاهُمَا عَلَى الْاٰخَرٰى فِقَاتِلُوْا تَبَعِيْ حَتّٰى تَفِیْءَ اِلَى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ قَاءَتْ فَاَصْلِحُوْا

بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسَطُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝

”اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کراؤ اور انصاف کرو اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

ایک مقام پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”حکومت اُس کی سرپرست ہے جس کا کوئی سرپرست نہ ہو۔“

اسلام نے ذمہ داریوں کے تعین کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم کیا ہے تاکہ ہر کوئی عدل اجتماعی کے قیام میں اپنا کردار ادا کرے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کی حیثیت گڈریا کی سی ہے۔“

عدل تمام محاسن اعمال کی اصل ہے۔ اسلامی فلاحی ریاست کا یہ فریضہ ہے کہ وہ انسان کو غیر فطری رجحانات سے ہٹا کر فطرۃ اللہ یا نقطہ عدل پر کھڑا کرے۔ عدل کا مفہوم اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔ اس میں حقوق اللہ بھی آجاتے ہیں اور حقوق العباد بھی کہ ہر صاحب حق کا پورا پورا حق ادا کیا جائے، کوئی کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرے۔ اگر کوئی ظلم کرتا ہے تو اس کو ظلم سے روکا جائے اور مظلوم کی حمایت کی جائے۔ اگر ظلم کو سزا دینے کے لیے گواہی کی ضرورت پڑے تو اس سے گریز نہ کیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عن ابی بکر انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان الناس اذا راؤ الظالم فلم یأخذوا علی ایدیہ او شک ان یعمہم اللہ بعداب منہ۔

”ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کو ظلم سے منع نہ کریں تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو عذاب میں مبتلا کر دے۔“

اسلام میں عدل کا قیام تمام بنی نوع انسان کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اسلامی فلاحی

ریاست کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ کتاب الہی و سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں لوگوں کے درمیان بلا امتیاز رنگ و نسل، زبان و ثقافت سے کام لے اور اپنی قاہرانہ قوت کا ناجائز استعمال نہ کرے، کسی کو کسی کی حق تلفی نہ کرنے دے۔ عدل اجتماعی کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ حکومت کی پوری انتظامی مشینری اس کام کے لیے وقف ہو جائے۔ شہریوں میں رضا کارانہ تعاون کے جذبات پیدا کرنے کے لیے نظام تعلیم اور ذرائع ابلاغ سے کام لیا جاسکتا ہے تاکہ لوگوں کے اذہان میں تبدیلی پیدا کی جاسکے، اس طرح ہر شہری حقوق کے حصول اور فرائض کی ادائیگی میں قرآنی عدل کے تقاضوں کا مکمل احترام کرے گا اور قدرتی طور پر ہر شہری آزادی، امن، عافیت اور خوشحالی کی دولت سے بہرہ ور ہوگا۔ یہ عدل کے تقاضوں کے پیش نظر ہی ہے کہ اسلام نے عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ تھلگ اور ممتاز درجہ دے کر ہر دباؤ سے بے نیاز کر دیا ہے۔ ایسی ان گنت مثالیں موجود ہیں کہ خلیفہ کو قاضی کی عدالت میں مدعی، مدعا علیہ یا گواہ کے طور پر پیش ہونا پڑا۔

عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ امیر المومنین تھے تو قاضی کے سامنے پیش ہوئے۔ مقدمہ ابی بن کعب کے خلاف تھا۔ قاضی زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جنہوں نے امیر المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قسم لینے میں تامل کیا تو انہوں نے خود قسم کھائی اور کہا: ”زید قاضی نہیں ہو سکتے جب تک کہ عمر اور ایک عام مسلمان ان کے نزدیک برابر نہ ہوں۔“ اسی طرح علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ امیر المومنین تھے۔ ایک مرتبہ کسی ذمی کے خلاف ایک فریق کے طور پر پیش ہوئے۔ قاضی نے اٹھ کر آپ کا استقبال کیا تو آپ نے کہا: ”یہ آپ کی پہلی ناانصافی ہے۔“ یہ دو مثالیں اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ جب قانون کی عمل داری پوری طرح رائج ہو تو وہ فلاحی مملکت کے قیام میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔

فلاحی ریاست کے اسلامی تصور میں ریاست کے ذمہ یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کی نہ صرف ضمانت دے بلکہ اپنے تمام ذرائع بروئے کار لا کر دکھی انسانیت کے مداوے کا باعث بنے۔ اپنے شہریوں کے لیے روزگار اور ترقی کے یکساں مواقع فراہم کرنا اس کا اولین فرض ہے۔ اسلامی فلاحی ریاست میں ہر شہری کو روٹی، کپڑا، مکان، بچوں کی تعلیم و تربیت اور علاج معالجہ وغیرہ کے غم سے نجات ملتی ہے۔ آدم علیہ السلام کو

عَطَاۓ جَنَّتِ كَے وقت یہی کہا گیا تھا کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاِنَّكَ لَا تَظْمُوْا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝

”یہاں تو تمہیں یہ آسائشیں حاصل ہیں کہ نہ بھوکے ننگے رہتے ہو، نہ پیاس اور دھوپ تمہیں ستاتی ہے۔“

چونکہ اِنْسٰی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةٌ^ط (یعنی میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں) کے مصداق انسان کے ذمہ ارضی خلافت ہوئی ہے اس لیے اسے زمین کو اپنے لیے اس طرح جنت بنانا ہے اور یہاں خوراک، لباس اور مکان کے ذرائع انسانوں کے لیے پیدا اور مہیا کرنے ہیں۔ یہاں ایسا تصور کرنا بھی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے کہ ایک طبقہ خوشحال زندگی بسر کرے اور دوسرا لمحہ لمحہ روٹی، کپڑے اور مکان کو ترستا رہے۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جب بحرین کا رئیس مسلمان ہوا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک خط کے ذریعہ یہ ہدایت فرمائی: ^{۱۵}

”بعض لوگوں کے پاس زمین نہیں ہے ان میں سے ہر ایک کو خزانہ عامرہ میں سے چار درہم اور لباس گزارے کے لیے دیا جایا کرے۔“

اس کے برعکس ہندوؤں کی مذہبی کتاب ”سام وید“ میں یہ ہدایت درج ہے:

”اے ویدک دھرمی راجاؤ! اور دوسرے ویدک دھرمیو! تم شیر بن کر رعیتوں کو کھاؤ اور چیتے جیسے بن کر اپنے دشمنوں کو باندھ کر جکڑ لو۔ پھر اس کے بعد اپنی مخالفت کرنے والوں کے سامنے سے ان کے کھانے تک اٹھالو۔“

لیکن اسلام نے ہر فرد کو ایسے تمام کام کرنے کی آزادی دی ہے جن سے اجتماعی مفاد کو نقصان نہ پہنچتا ہو کیونکہ حقوق العباد کو اسلامی تعلیمات میں خاص مقام حاصل ہے۔ اسلام محنت اور کسب حلال کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے اسی لیے اجارہ داری، منشیات کا کاروبار، چور بازاری اور سود وغیرہ کی اسلامی احکام کی رو سے ممانعت ہے۔ دولت اور حسب و نسب کے امتیاز کو ختم کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں معاشی، معاشرتی، روحانی اور اخلاقی شعبوں میں کسی قسم کی درجہ بندی نہیں ہوتی۔

لیکن اس کے لیے فرد کو بھی اپنی اصلاح کرنا پڑتی ہے کیونکہ اگر وہ اپنی خواہشات کے

بت کا پجاری بنے گا تو اس سے معاشرے میں معاشی بگاڑ پیدا ہوگا۔ اس طرح معاشرتی کردار بگڑتا ہے اور یہ سلسلہ فروغ پاتے پاتے مکمل تباہی کا باعث بنتا ہے۔ اسی لیے فرمان الہی ہے: ^{۱۷} اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ط یعنی ”حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف نہیں بدل دیتی۔“ اگر اسلام ایک طرف اہل ثروت کو یہ کہتا ہے: ^{۱۸}

وَ اَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرُ.

”اور سائل کو نہ جھڑکو۔“

تو دوسری طرف خوددار اور بے نیاز نوا کی طرح اس لاتا ہے۔ ^{۱۸}

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسْمِهِمْ ج لَا يَسْئَلُوْنَ
النَّاسَ الْحَافَا ط

”ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں۔ تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو۔ مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں۔“

اگر اہل ثروت کو حسن اخلاق کا مظاہرہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو خالی مت لوٹاؤ: ولو بشفق ثمرة ”اگرچہ چھوہارے کی ایک پھانک ہی کیوں نہ ہو“ تو دوسری طرف حاجتمندوں کو فرمایا کہ تمہاری خودداری یہی ہونی چاہیے کہ کسی کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلاؤ کہ اَلْيَدِ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ اسْفَلٰى ۱۹ ”اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی فلاحی ریاست میں اسلام کا یہ مقصد قطعاً نہیں کہ حاجت مندوں کی بھیڑ لگالی جائے بلکہ اسلام ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے والوں کی مذمت کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی معاشرہ کے ضرورت مند اور محتاج و نادار اور معذور لوگوں کی کفایت کو ریاست کا فریضہ قرار دیتا ہے۔ طبقاتی تقسیم کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب ضرورت مندوں کی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں اور ان کے دلوں میں امیروں کے لیے منافرت، بغض اور حسد کے جذبات پروان پانے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے اقتصادی نظام کو محض انفرادی کوششوں کے حوالے نہیں کیا بلکہ اس کے لیے حکومت کو کفیل قرار دیا ہے۔ اس ضرورت کے لیے

بیت المال قائم کیا جاتا ہے جس میں مختلف جائز ذرائع سے مال جمع ہوتا ہے اور ضرورت مندوں کی جائز ضرورت پر صرف ہوتا ہے۔ ان ذرائع آمدنی میں زکوٰۃ، اموال غنائم، اموال فتنے، خمس، صدقات، جزیہ، خراج، عشر، عشور (کشم ڈیوٹی)، سرکاری زمینوں کا لگان، وقف اور خراب (امراء پر جبری ٹیکس) اور اموال زائدہ شامل ہیں۔

اسلام نے بیت المال کو حکمرانوں کی ملکیت قرار دینے کی بجائے اسے تمام رعایا کی اجتماعی ملکیت قرار دیا۔ یہ محتاجوں، غریبوں، غلاموں، مسافروں، مصیبت زدہ انسانوں، یتیموں، بیواؤں کے لیے ابر بہار تھا، اس سے فقر و افلاس اور فاقہ و غربت کی بیخ کنی کی جاتی تھی۔ غریب افراد کی اولاد کی شادی کے موقع پر مالی امداد، بیماری کی صورت میں مالی اعانت اور ہنگامی حالات میں عوام کی دستگیری یہ سب اسلامی مملکت میں حکومت کی ذمہ داری ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر بنیادی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ بنیادی سہولتیں اور مناسب معاشرتی تحفظ قائم ہو تو اس سے بہتر فلاحی نظام اور کیا ہو سکتا ہے؟ اسلامی ریاست میں حکمران بیت المال سے اتنا ہی وصول کر سکتے تھے جتنا رعایا ان کے لیے مقرر کرتی تھی۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیت المال سے صرف اتنی ہی رقم لیتے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے گزارہ کے لیے کافی ہو سکے۔ بعض دفعہ ناگزیر حالات کے تحت اگر وہ وظیفہ نا کافی ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرض بھی لینا پڑتا تھا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زرہ ایک مقدار جو کے بدلے رہن رکھی ہوئی تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بیت کے لیے خریدے تھے۔^{۲۰}

مسند امام احمد میں مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا اس بستی سے خدا کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔“

اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی کو محسوس نہ ہونے دے کہ وہ تنہا یا لا وارث اور یتیم ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس کا کوئی سر پرست نہ ہو اس کا سر پرست اللہ اور اس کا رسول یعنی اسلامی نظام حکومت ہے۔“^{۲۱} یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک یتیم کے پرورش کے لیے کئی کئی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تیار رہتے تھے۔ عبداللہ بن عمر

رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہ حال تھا کہ وہ کسی یتیم بچہ کو ساتھ لیے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے۔^{۲۲} اگر کوئی شخص مقروض ہو کر مرے اور اس نے ترک نہ چھوڑا ہو کہ جس سے اس کا قرضہ ادا ہو سکے تو اس کے قرض کی ادائیگی بھی ریاست کے ذمہ ہوگی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا تھا: ”میں مسلمانوں سے ان کے اپنے افراد خاندان کی نسبت زیادہ قریب ہوں۔ سو ان میں سے جو وفات پا جائے تو اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمے ہے۔“^{۲۳}

دیگر روایات میں ہے (مسلم، ترمذی وغیرہ) کہ ایسے شخص کے قرض کی ادائیگی تو حکومت کے ذمے ہوگی لیکن جو کچھ وہ ترک چھوڑ جائے وہ اس کے ورثا کا حق ہوگا۔ اسی سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ”جس شخص کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنا دے اور وہ لوگوں کی ضروریات کی طرف سے لاپرواہی برتے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور اختیارات کی طرف سے لاپرواہی برتے گا۔“^{۲۴}

یہی روایت ترمذی میں ان الفاظ میں آئی ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو امام ضرورت مندوں، محتاجوں اور مسکینوں پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کے لیے آسمان کے دروازے بند کر دیتا ہے۔“ امام کی ذمہ داریوں میں متوفی کے قرضوں کی ادائیگی بھی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اوقات نماز جنازہ پڑھانے سے قبل دریافت فرمالتے تھے کہ میت پر کوئی قرض تو نہیں؟ مراد یہ تھی کہ اگر ہے تو فوراً ادا کر دیا جائے۔ اسی رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا۔^{۲۵} طبری نے ۲۳ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ ہند بنت عتبہ نے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تجارت کے لیے چار ہزار درہم قرض مانگے جو بیت المال سے دیا گیا۔^{۲۶}

منجملہ دیگر مقاصد کے اس مقصد کے لیے زکوٰۃ کا نظام رائج کیا گیا اور اس کے لیے اہل کار مقرر کیے گئے، اسلام نے یہ انتظام کیا ہے کہ اندوختہ پر ڈھائی فی صد سال کے حساب سے زکوٰۃ عائد کی گئی ہے۔ جو شخص اپنے اندوختہ کو نفع آور کام میں نہیں لگائے گا زکوٰۃ اُس کے مال کو آہستہ آہستہ کھا جائے گی۔ پس زکوٰۃ میں اس کے لیے یہ تحریک موجود ہے کہ وہ اپنے سرمایہ کو نفع آور کاموں میں لگائے اور کنز (خزانہ) کر کے نہ رکھے۔ گویا اُس کا ایک بڑا فائدہ گھوڑے کے بھاگ جانے کے بعد اصطلبل کا دروازہ بند کر کے خطرے سے بچنا ہے۔ یہ حقیقی معاشی بہبود کا

معاشرتی سرچشمہ ہے۔ اس لیے اسے بیک وقت اخلاقی اور روحانی مقصد بنایا گیا ہے۔ زکوٰۃ کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ جب کسی معاشرے میں ایسے افراد ہوں جن کو اپنی کوششوں کے باوجود کافی ذرائع حاصل نہ ہوتے ہوں پھر اس معاشرے کا مجموعی اعتبار سے یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ان کو ضروریات زندگی بہم پہنچائے۔ زکوٰۃ باہمی بغض و عناد کو دور کرنے اور محبت و تعلق کو بڑھانے کا بہترین سامان ہے۔ تنگدستی اور غربت وہ بری بلا ہے کہ جس سے انسان ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور قتل و خون ریزی سے بھی نہیں چوکتا۔ ایسے معاشرے میں جہاں زکوٰۃ کا خدائی قانون رائج ہے محض ناداری کی وجہ سے جرائم کا ارتکاب محال ہے۔ نظام زکوٰۃ کا ایک اور بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ عالم اسلام کی تمام کڑیاں مربوط اور منظم رہیں۔ ایک ایسی جمہوریت تشکیل پائے جس کو انفرادیت کا منتشر تخیل درہم برہم نہ کر سکے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منکرین زکوٰۃ سے باقاعدہ جہاد کیا۔

کسی بھی فلاحی معاشرہ کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں دولت کی منصفانہ تقسیم ہو اور سرمایہ چند ہاتھوں میں مرتکز نہ ہونے پائے۔ اسلامی مملکت اس تقسیم کو عادلانہ بنیادوں پر کرنے کا پورا پورا بندوبست کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظام سرمایہ داروں کی عیش پرستی اور ان کی خوشحالی کے خلاف ایک اصلاحی اور تردیدی صدائے احتجاج ہے جو اسلام نے چودہ سو برس قبل بلند کی تھی۔

زکوٰۃ کے علاوہ اسلام نے اختیاری صدقہ پر بھی ترغیب دی ہے۔ صدقہ سے مراد خیرات نہیں ہے۔ خیرات کے لفظ میں ”محبت“ اور ”ہمدردی“ کا مفہوم پایا جاتا ہے جب کہ صدقہ لینے والے کی تالیف قلوب مدعا ہوتی ہے نہ کہ اس کے احساسات کو ہمدردی سے ٹھیس پہنچانا۔ جو لوگ ہجرت کر کے مدینہ آتے ان کے لیے روزگار کی کوئی سبیل نہ تھی۔ علاوہ بریں اس وقت اسلامی ریاست ابھی تکوینی مراحل سے گذر رہی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے افراد کو مسجد میں ٹھہرنے کا حکم فرماتے چنانچہ ان کی تعداد چار سو تک پہنچ گئی۔

یہ غزوات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب ہوتے اور بعد میں پھر مسجد میں چلے جاتے۔ لوگ ان کے اخراجات برداشت کرتے تھے۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت

کے دوران میں جب اسلامی ریاست کی حدود وسیع ہوئیں تو ان کے لیے روزگار کے بے شمار راستے کھل گئے اس لیے ان کو وہاں سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

صدقہ معاشی توازن برقرار رکھنے کے لیے ہے جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے۔^{۲۷} اِنَّ اللّٰهَ قَدْ فَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةٌ تُوْخَذُ مِنْ اَغْنِيَاءِ هُمْ فِتْرَدُ عَلٰى فُقَرَاءِ هُمْ۔
”بے شک اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے مالدار لوگوں سے لیا جائے گا اور اسے ان کے ضرورت مندوں کو لوٹایا جائے گا۔“

صدقہ اللہ تعالیٰ کے لیے دیا جاتا ہے۔ اسے چھپا کر دیا جائے تاکہ لینے والے کی غیرت پر حرف نہ آئے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ^{۲۸} ”بہتر صدقہ وہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔“

لیکن اگر دوسروں کو بھی ترغیب دلانا مقصد ہو یا خود سائل دوسروں کے سامنے مانگ لے

تو فرمایا: ^{۲۹}

اِنْ تُبْدُوْا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا مَعِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُوْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ط

”اگر اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔“

اسی طرح زکوٰۃ کے مصارف کے متعلق قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے: ^{۳۰}

اِنَّمَا الصَّدَقَتُ لِلْفُقَرَاءِ وَ الْمَسْكِيْنَ وَ الْعَمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمَوْلٰٓفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغُرَمِيْنَ وَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ط
فَرِيْضَةٌ مِّنَ اللّٰهِ ط وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

”یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں، اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو۔ نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرضہ داروں کی مدد کرنے میں راہ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا بینا ہے۔“

جہاں تک ابن سبیل کی صراحت کا تعلق ہے وہ تمام کام جو نیکی اور خیرات کے ہوں اس میں داخل ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج کے باب الصدقات کے حوالہ سے رقمطراز ہیں:

”اور ابن السبیل میں مسلمانوں کی ذاتی مدد کے علاوہ مسافروں کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری مثلاً راستوں کی درستی، پلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر بھی داخل ہو سکتی ہے۔“ اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا قعر مذلت میں گری ہوئی تھی۔ انسان کی قدر و منزلت مال و دولت اقتدار و اختیار اور جاہ و مرتبہ کی بنا پر کی جاتی تھی۔ لیکن یہ ایک چراغ سحری تھا جو طلوع اسلام کے ساتھ ہی گل ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا بھرپور احساس تھا کہ معاشرے کی اٹھان معاشی، ثقافتی اور مذہبی کردار پر ہوتی ہے اور اقتصادیات اس میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے اور اس کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کر کے ہی ہم اس کی نعمتوں سے فیض یاب ہو سکتے ہیں اور یہی صراط مستقیم ہے۔ اسی طرح ہم سماجی انصاف کے ذریعہ مسرتوں کی راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ ہمارے استعمال کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک امانت ہے حتیٰ کہ ہمارے اعضاء بھی مطیع ہونے کے لیے ایک امانت کے طور پر دیئے گئے ہیں۔ اس طرح کوئی بھی فرد بیک وقت مالک اور امین نہیں ہو سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات کے پیش نظر مسلمانوں کی طبیعتوں میں جو زبردست انقلاب برپا ہوا وہ انسانی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہے۔ مسلمان انصاف کے علمبردار بن گئے۔ وہ تجسیم فقر بن گئے جن میں بگاڑ اور تخریب کا وہم بھی نہ تھا۔ ان کے سینوں میں صرف آخرت میں جو ابد ہی کا خوف جاگزیں ہو گیا۔

اسلام بنی نوع انسان کی برابری اور برادری کا داعی ہے۔ یہ ایک ایسے معاشی نظام کا خواہاں ہے جس میں دولت کی منصفانہ تقسیم ہو۔ اس کی بھرپور سعی ہے کہ ارتکاز دولت نہ ہونے پائے۔ قرآن حکیم میں اس کی واضح طور پر ممانعت آئی ہے: ۳۲

مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَ لِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كُنْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ۗ وَمَا اتَّكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ ۗ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ۗ

وَ اتَّقُوا اللَّهَ ۗ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

”جو کچھ بھی اللہ ان بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسول کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسول اور رشتہ داروں اور یتیمی اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ۔

اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔“

جماعتی خوشحالی سے بڑھ کر کوئی مبارک چیز نہیں ہے، اس میں برکت پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ اس وقت فتنہ بن جاتی ہے جب یہ چند افراد میں سمٹی ہوئی ہو۔ کیونکہ جب دولت چند افراد کے قبضے میں آگئی اور باقی افراد محروم رہ گئے تو قدرتی طور پر ہر طرح کا غلبہ و تسلط چند افراد کے ہاتھ میں آ جائے گا۔ ایسے غلبہ و تسلط کا نتیجہ غرور باطل اور استکبار عن الحق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم انفرادی حالت میں اسے فتنہ بھی کہتا ہے اور عذاب الہی کی نوید سناتا ہے: ^{۳۳} وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ ”درد ناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ”دو خونی بھیڑیوں کا کسی زخم کو چاٹنا انسان کے لیے اتنا خطرناک نہیں جتنا کہ ایک مسلمان کے لیے اس کا دولت سے محبت (ابن عمر کی روایت)۔ ایک اور حدیث میں کعب بن عیاض رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہر قوم کے لیے ایک آزمائش ہوتی ہے اور میری امت کے لیے یہ آزمائش دولت ہے۔“ ^{۳۴}

ان احکام کی روشنی میں ہر مسلمان پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنی عام ضروریات سے زیادہ نہ رکھے بلکہ غربا میں تقسیم کر دے۔ قرآن حکیم نے اکتساب کا معاملہ انفاق مال کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے کوئی کمائی جائز تسلیم نہیں کی جاسکتی اگر انفاق سے انکار کرتی ہو۔ ہر وہ کمائی جو محض اکتفا کے لیے ہو اور انفاق کے لیے دروازہ کھلا نہ رکھے تو قرآن کے نزدیک ناجائز، ناپاک اور مستحق عقوبت ہے۔ لہذا انفاق فی سبیل اللہ کو اللہ نے صرف دین کی حمایت تک محدود نہیں رکھا بلکہ ہر اس کام کو جو خدا کی رضا جوئی کے لیے کیا جائے اس میں شامل فرمایا اور ساتھ ان باتوں سے پرہیز

کرنے کی ہدایت فرمادی جن سے فی سبیل اللہ کی شرط پوری نہیں ہوتی۔ ارشاد خداوندی ہے:

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلٍ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٌ ۗ وَاللَّهُ يُضْعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝

”جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے۔ افزونی عطا کرتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔“

از روئے تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم معاشی تخلیق کی جدوجہد میں تعطل کو دور کرنے کا عمل اسلامی معیشت ہے اور جن لوگوں کی زندگی میں تعطل موجود ہے ان کو وسائل تخلیق مہیا کرنا ہی اسلامی نظام معیشت ہے۔ زندگی کی ضروریات سے محروم افراد کی ضروریات پوری نہ کرنا تکذیب دین ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے: ^{۳۶} لَنْ تَسْأَلُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تَحِبُّونَ ۝ ”تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو۔“ انفاق کرنے والے کی نیکی اور اس انفاق سے استفادہ کرنے والے کی معیشت باہمی طور پر مربوط ہیں۔ اس لیے صرف فرائض کو بجالانے سے ہی ایسا معاشرہ وجود میں آسکتا ہے جو حقوق کے تصادم سے محفوظ ہو۔ آدمی مدنی الطبع بھی ہے اور معاشرتی وجود بھی وہ اپنے کمال کو معاشرتی زندگی کے بغیر نہیں پہنچتا۔ بہترین معاشرتی زندگی وہی ہے جس میں سب افراد ایک دوسرے کے معین و مددگار ہوں۔ اسی لیے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: خَيْرُ النَّاسِ اَنْفُسُهُمْ لِلنَّاسِ ۗ لَوْ كُنُوْا فِيْ سَبِيْلِ رَحْمَةٍ لَّوَجَدُوْا عِنْدَ كُلِّ بَابٍ ۗ ”لوگوں میں بہترین وہ فرد ہے جو لوگوں کے حق میں سب سے زیادہ نفع رساں ہے۔“ ایک اور مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تو“ مسلمانوں کو باہم رحم، محبت اور مہربانی میں ایک جسم کی طرح دیکھے گا۔ جب ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو اس کے لیے پورا جسم بے خوابی اور بخار کے ساتھ پکارتا ہے۔“

اسلام انسانوں میں محبت و ہمدردی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے خیرات کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ ہر انسان دوسرے کی احتیاج کو اپنی احتیاج سمجھے۔ سود خور کی ذہنیت بالکل اس کی

ضد ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دوسرے کی احتیاج سے خود انتہائی فائدہ اٹھائے اور محتاج کو دولت جمع کرنے کا ذریعہ بنائے۔ گویا اس میں ہمدردی و اخوت کے جذبات مفقود ہوتے ہیں۔ چونکہ سود انسانوں کا معاشی قتل ہے اس لیے اسلام نے اس سے اجتناب کرنے کا حکم دیا ہے۔ ساتھ ہی اسلام نے اسراف سے پرہیز کرنے کی ہدایت فرمائی ہے کیونکہ اس طرح اس کے ہر قول و فعل کی جزا و سزا ملے گی۔ اس کے ساتھ ہی ریاست پر یہ پابندی عائد کی گئی ہے کہ وہ ہر فرد کی ضروریات کو پورا کرے۔ قرآن حکیم میں معاشی تحفظ کی ضمانت کے ذیل میں افلاس و ناداری کی روک تھام کے لیے واضح نصوص موجود ہیں:

۱۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝^{۳۸}

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔“

۲۔ وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ۝^{۳۹}

”پوچھتے ہیں ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو: جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے۔ شاید کہ تم دنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو۔“

۳۔ وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝^{۴۰}

”اور ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لیے۔“

۴۔ مَا آفَاءَ اللَّهِ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِللَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۚ لَا يَكُونُ دَوْلَةً ۚ بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ۖ ط

”جو کچھ بھی اللہ ان بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسول کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسول اور رشتہ داروں اور یتیمی اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے

تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ جو کچھ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ۔“

اس کے ساتھ ساتھ معاشی تحفظ اور خوشحالی کے لیے عملی تدابیر بھی بیان کی گئی ہیں:

وَأَنْ لِّسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۝۴۲

”اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے۔“

جس معاشرے میں اہل ایمان اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں وہاں کوئی آدمی محتاج نہیں رہ سکتا، بلکہ وہ معاشرہ فی الواقع معاشی اعتبار سے بہتر اور خوشحال ہو جاتا ہے کیونکہ جذبہ ایثار و قربانی ہی حقیقی کامیابی کی ضمانت دیتا ہے جب کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے: ۴۳

لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أَخْرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ
فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ
الصَّادِقُونَ ۝

” (نیز وہ مال) ان غریب مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور جائیدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی حمایت پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ یہی راستباز لوگ ہیں۔“

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ریاست کی نیوڈالی تو حکومت کے ذرائع نہایت محدود تھے۔ اسی لیے اکثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لبوں پر یہ دعا رہتی تھی ”پروردگار! یہ بھوکے ہیں تو انہیں پیٹ بھر کر کھلا، یہ ننگے ہیں تو انہیں کپڑے پہنا۔ یہ پیدل سفر کرتے ہیں تو انہیں سواری عطا فرما۔“ ظاہر ہے کہ ان دعاؤں کا مقصد یہ تھا کہ ریاست کے ذرائع اتنے کثیر ہو جائیں کہ وہ ان ناداروں کی تمام ضروریات پوری کر سکے۔ اس پروگرام کا پہلا انفرادی طور پر خوشحال لوگوں کے صدقات کی رو سے ضروریات کا پورا کرنا تھا۔ چنانچہ اس نظام پر عمل کرنے سے ایک وقت ایسا آیا جو فلاح و بہبود کی مثالی تصویر نظر آتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایک دور ایسا آیا کہ مسلمان

زکوٰۃ کی رقم ہاتھ میں لیے گلیوں اور بازاروں میں پھرتے تھے لیکن لینے والا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ غربت، بھیک اور حاجت مندی ختم ہو گئی تھی اور ہر کوئی باعزت انداز میں زندگی گزارنے کے مواقع حاصل کر چکا تھا۔

قرآن حکیم معاشرے پر مجموعی اعتبار سے ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ ضرورت مند افراد کی ضروریات خاص طور پر یتیم بچوں کے مفاد کی حفاظت کرے۔ وہ معاشرے پر زیرتولیت افراد کا دفاع کرنے کا فرض بھی عائد کرتا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ
وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ
الظَّالِمِ أَهْلِهَا ۗ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وِلْيَاءً ۗ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ
نَصِيرًا ۝

”آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔“

خود حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی ایک ارشادات بھی ہمارے لیے رشد و ہدایت کا سامان بہم پہنچاتے ہیں:

۱۔ جو کہ محتاج یا غریب کی طرف سے جدوجہد کرتا ہے وہ جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لینے کی مثل سے یا اس کی مثال شب میں عبادت اور دن کو روزہ رکھنے والے کی طرح ہے۔“^{۴۵}

۲۔ ”جو کہ جانتے ہوئے بھی برداشت کرتا ہے کہ ان میں کوئی شخص بھوکا ہے ان پر سے اللہ کی حفاظت اٹھالی جاتی ہے۔“^{۴۶}

۳۔ جس کسی کے پاس بہت سی دولت ہے وہ اس میں سے محروم افراد کو شامل کرے۔“^{۴۷}

۴۔ ”جس کے پاس دو افراد کے لیے کھانا ہے وہ تیسرے کو بھی اس میں شامل کرے اور

جس کے پاس تین افراد کے لیے کھانا ہے وہ اس میں چوتھے کو بھی شامل کرے۔“

۵۔ اس کا مجھ پر ایمان نہیں ہے جو اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی کہ اس کا پڑوسی بھوکا ہے بھر پور نیند سوتا ہے۔“

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم انفرادی خیرات و صدقات سے پیدا ہونے والے نفسیاتی اثرات سے بھی بخوبی واقف تھے، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی کا اپنی پشت پر بوجھ لا دینا بہتر ہے اس سے کہ وہ دوسروں سے سوال کرے۔“^{۲۸} ایسے بے شمار واقعات ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرورت مندوں کو مستقل روزگار پر لگنے کا مشورہ دیا۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد چاہی تو آپ نے فرمایا کہ ”تمہارے پاس کچھ ہے؟“ عرض کیا ”ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منگوا کر نیلام کیا اور ان کی قیمت سے اسے ایک کلہاڑی خریدنے کا فرمایا۔ پھر اسے جنگل کی راہ سجھائی۔ اس طرح ایک بیکار آدمی معاشرے کا نہایت فعال رکن بن گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ اچھا ہے یا یہ کہ اپنے چہرے پر گدائی کا داغ لگا کر روز قیامت حاضر ہوتے؟“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انفرادی خیرات و صدقات سے پیدا ہونے والے نفسیاتی اثرات سے معاشرے کو بچانے کے لیے وظائف کا سلسلہ شروع فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دولت مندوں اور غریبوں کو برابر نہیں دیتے تھے، نہ ہی میراث کے قاعدے کے مطابق تقسیم فرماتے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضرورت کے مطابق عطا فرماتے تھے۔ یعنی کنواروں کی شادی کرتے تھے۔ مقرضوں کے قرض ادا کرتے تھے اور غریبوں کو بقدر حاجت دیتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرتی مسائل کے حل کے لیے ایک ایسا علاج اختیار فرمایا جس سے جسم کے تمام فاسد مادے کی اصلاح ہو جاتی ہے اور تمام پھوڑے خود بخود اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ.

”تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے متعلق جواب طلبی ہوگی۔“

سربراہ ریاست حاکم نہیں بلکہ خادم قوم کہلاتا ہے۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر خلفاء نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر مکمل طور پر عمل کیا۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے

راتوں کو گلیوں کے چکر لگائے تاکہ عوام کی پریشانیوں اور تکالیف کا خود جائزہ لے سکیں۔ انہوں نے اپنی پیٹھ پر غلہ کی بوری لاد کر ضرورت مند کے گھر تک پہنچائی اور ملک بھر کے ضرورت مندوں، یتیموں، بوڑھوں اور حاجت مندوں کے رجسٹریار کروائے۔ انہوں نے وفات سے کچھ عرصہ قبل فرمایا: ”اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے موقع دیا تو ایسا نظام قائم کروں گا کہ صفا کی پہاڑیوں میں رہنے والا گڈریا بھی اجتماعی دولت سے اپنا حصہ وصول کرے۔“

یہ معاشی تحفظ صرف مسلمانوں ہی کے لیے مخصوص نہیں تھا بلکہ تالیف قلب اور غیر مسلموں کی اعانت کے لیے یکساں طور پر اقدامات کیے گئے۔ جہاں تک غیر مسلموں کے مذہبی، معاشرتی اور شہری حقوق کا تعلق ہے اسیو لیبان کا یہ قول کفایت کرتا ہے کہ اسلامی حکومت کے ماتحت غیر مسلموں (ذمیوں) کو وہ سب کچھ حاصل تھا جو کسی قوم کو حاصل ہو سکتا ہے۔ البتہ صرف ایک بات کا حق نہ تھا یعنی وہ خلیفہ نہیں ہو سکتے تھے۔“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ”ذمی کے خون کی قیمت مسلمانوں کے خون کے برابر ہے اور یہ کہ جو ہمارا ذمی ہو اس کا خون ہمارے خون کی طرح اور دیت ہماری دیت کی طرح ہے۔“

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ہی اثر تھا کہ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں انہوں نے جب ایک بوڑھے یہودی کو بھیک مانگتے دیکھا تو اسے گھر لے گئے۔ پہلے اپنے گھر سے کچھ دیا پھر بیت المال کے خزانچی کو بلا کر ہدایت کی کہ اس کا اور اس جیسے دوسرے افراد کا روزینہ مقرر کیا جائے۔ پھر فرمایا: ”خدا کی قسم! یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ہم ان کی جوانی میں ان سے فدیہ لے کر کھائیں اور بڑھاپے میں انہیں بے سہارا چھوڑ دیں۔“^{۴۹}

اسلامی فلاحی ریاست کی تعمیر عقیدے نے کی۔ یہ عقیدہ بخشنے والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے اس عمارت کی ٹھوس بنیاد رکھی۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روزینہ مقرر کیے تو شروع دور میں شیر خوار بچوں کو نہ ان کا روزینہ ملتا تھا اور نہ خوراک، جب تک کہ وہ دودھ چھوڑ نہ دیتے۔ اس طرح کئی ایک ماؤں نے وقت سے پہلے اپنے بچوں کا دودھ چھڑانا شروع کر دیا تاکہ ان کا روزینہ مقرر ہو سکے۔ جب آپ کو اس کا علم ہوا تو اعلان کیا کہ بچوں کا دودھ چھڑانے میں مائیں جلدی نہ کریں ہم نے ہر مولود فی الاسلام کا روزینہ مقرر کر دیا ہے۔^{۵۰} وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ اولاد کی خاطر

لوگ غلط کام کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے بیت المال پر ہر شخص کی ابتدائی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ اس کے بچوں اور بیوی کے ابتدائی اخراجات کی کفایت بھی ڈالی۔ ان تنخواہوں کے علاوہ ہر فرد کو (بچہ، بڑا، آزاد یا غلام) کو دو جریب ماہانہ گندم، دو سیر سرکہ اور چار سیر زیتون فی کس اس کے علاوہ دیا جاتا۔^{۵۱}

مال کی تقسیم کے لیے جب دیوان مرتب کیا جانے لگا تو خلیفہ ہونے کے باوجود عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا نام سرفہرست نہ آنے دیا اور اس کا آغاز بنی ہاشم سے کروایا۔ اس طرح علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک استفسار پر بڑے غصے کے ساتھ لکھا: ^{۵۲}

فان العجب کل العجب منک اذا تری لنفسک فی بیت مال
اللہ اکثر مما لرجل من المسلمین.

”تمہارے اس خیال پر مجھے حد درجہ حیرت ہوئی ہے کہ تم سمجھتے ہو بیت المال میں تمہارا حق، مسلمانوں کے عام آدمی کی نسبت زائد ہے۔“

ان دونوں حضرات کے پیش نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یقیناً یہ ارشاد تھا کہ ”سربراہ ریاست کی حیثیت محض ایک خزانچی کی ہوتی ہے۔ اس کے پاس ڈھیروں مال جمع رہتا ہے لیکن سب اس لیے کہ جہاں تقسیم کرنے کا اسے حکم دیا جائے وہاں تقسیم کر دے۔“^{۵۳}

فلاحی ریاست کے اسلامی تصور میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ریاست اپنے شہریوں کی تعلیم کا مناسب بندوبست کرے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں ساری دنیا کے لیے معلم بنا کر مبعوث کیا گیا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا روحانی نظام قائم کیا جس کی بنیاد میں توحید، رسالت، خلافت، آخرت، عالمگیر اخوت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر جیسے عقائد شامل ہیں۔

ان عقائد کی اساس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا تعلیمی انقلاب برپا کیا جو سراسر عوامی علمی تحریک بن کر ابھرا۔ تعلیم کے نظام میں اولیت دینی علوم کو دی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ان تمام علوم کی تدریس بھی شامل ہے جو دین اور دنیا دونوں کے لیے ضروری ہیں۔ اس نظام نے تعلیم کے استحصال کے سارے طلسم توڑ ڈالے اور انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ علم کی فضیلت،

اہمیت اور اس کی عمومیت کی ایسی داغ بیل ڈالی کہ علم کا حصول بلا امتیاز رنگ و نسل یا جنس ہر ایک کی بنیادی ضرورت اور حق بن کر سامنے آیا۔ واضح رہے کہ اسلام کے ہر اچھے اور برے دور میں تعلیم بالکل مفت رہی اور اس کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے رہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمی تحریک کا مخاطب ہر دور کا انسان ہے لہذا اس تحریک کے مقاصد بھی نہایت وسیع اور جامع تھے۔ ان مقاصد کا حصول دنیوی زندگی کی بہبود کا باعث بنتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اخروی اصلاح کا خالق بھی۔ ان مقاصد میں رضا الہی کا حصول، ملت کی تربیت اور پوری انسانیت کی تعمیر و ترقی شامل ہے۔ اسلام میں علم کو ”فرض“ کی حیثیت حاصل ہے اور اس کا سیکھنا ہر مسلم مرد اور عورت پر فرض ہے اور فرض کی حیثیت کلی و دائمی ہے (الْعِلْمُ فَرِيضَةٌ عَلَىٰ كُلِّ مُسْلِمٍ وَ مُسْلِمَةٍ)۔ چنانچہ ہر مسلمان مہد سے لحد تک علم حاصل کرنے کا مکلف ہے (أَطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ إِلَى اللَّحْدِ)۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ ”تعلیم حاصل کرو خواہ تمہیں اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ علم کا نور ہی جہالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا دور کر سکتا ہے۔ غزوہ بدر میں جو کفار قید ہوئے تھے ان کی رہائی کے لیے بطور تاوان مسلمان بچوں کو تعلیم دینے کی شرط مقرر کی گئی تھی۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صوبائی عمال کو اسلامی تعلیمات کی درس و تدریس کا فریضہ سونپ رکھا تھا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ہی اثر تھا کہ مدینہ فی الواقعہ مدنیۃ العلم بن گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی تعمیر کی جو بیک وقت سجدہ گاہ بھی تھی اور درس گاہ بھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے معلم اول اور تلامذہ اصحاب صفہ تھے۔ وہ عرب جو لکھنے پڑھنے کو ایک عیب خیال کرتے تھے ان کا ایک ایک گھر فقہ، حدیث اور تفسیر کے دارالعلم میں تبدیل ہو گیا۔

فلاحی ریاست کے اسلامی تصور میں مفت طبی امداد کی سہولت بھی داخل ہے۔ یہ امر ایک فلاحی ریاست کے لیے نہایت اہم ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی اصلاحی اور روحانی تربیت کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت کی طرف بھی توجہ دیتی ہے کیونکہ بیمار جسم بیمار ذہن پیدا کرتا ہے۔ بیماریوں کی روک تھام کے لیے حفاظتی تدابیر اختیار کرنا، ہسپتالوں اور طبی تعلیم کے اداروں کا قیام اور ان کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانا، حفظان صحت کے اصولوں کا نفاذ اور اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کی روک تھام یہ سب معاملات اسلامی حکومت اپنے فرائض میں شامل خیال کرتی

تھی۔ عوام کو علاج معالجہ کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے یہ لازم ہے کہ مارکیٹ میں اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول ہو، دھوکہ دہی کی وارداتیں نہ ہوں، مال کے لین دین میں دیانتداری کے تمام تقاضے پورے کیے جائیں۔ اس امر کا سارا انتظام حکومت کی ذمہ داری ہے ہمیں خلاف راشدہ اور عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ادوار میں اس کی عملی مثالیں ملتی ہیں کہ کس طرح انہوں نے اشیاء کی قیمتوں کو بڑھنے سے روکنے کے لیے کامیاب اقدامات کیے اور معاشرہ میں توازن قائم کیا۔

اسلامی ریاست اگر یہ محسوس کرے کہ ملی مقاصد کے لیے انفرادی ذرائع اور وسائل کو اجتماعی ملکیت میں لینا ضروری ہے تو وہ ایسا کر سکتی ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ متاثر افراد کو مناسب اور فوری معاوضہ ادا کرے۔ علاوہ بریں وہ اجتماعی مفادات کی خاطر قومیا نے کی پالیسی بھی رائج کر سکتی ہے لیکن ایسا اقدام صرف اس صورت میں ہونا چاہیے جب اس میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کا بھلا ہو۔ دراصل زمین کا مالک خود اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کا نظام اس کی منشا کے مطابق چلایا جانا چاہیے اور اسلامی ریاست میں زمین کا بہترین استعمال یہی ہو سکتا ہے کہ اس سے زیادہ انسانوں کو فائدہ پہنچے۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شام اور عراق کی فتح کے بعد زیر کاشت اراضی غیر مسلم کاشتکاروں کے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا۔ جس کا مقصد جاگیر دارانہ نظام کی حوصلہ شکنی تھا۔ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شاہی خاندان کی ساری ناجائز املاک اور خزانہ بیت المال میں جمع کرادیا اور اسے اجتماعی ملکیت قرار دیا۔

اب اسلامی فلاحی ریاست کے حکمران کا کردار ملاحظہ ہو۔ ریاست کے ذرہ ذرہ کی اس کو فکر ہونی چاہیے کہ یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق کار تھا۔ وہ حاکم اعلیٰ بننے کی کوشش نہ کرے بلکہ عدل کے دائرہ میں رہ کر ملی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے قوانین وضع کرے، ان پر خود بھی عمل کرے اور ان پر عوام سے بھی عمل کروائے۔ امور ریاست میں عوام کو شریک کرے اور باہمی مشاورت کے اصول پر عمل کرے کہ یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شعار تھا۔ پیغمبر ہونے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کو کبھی بھی قانون سے بالاتر خیال نہیں کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی ایک مواقع پر خود کو دیت کے لیے پیش کیا۔ ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔ ابن اسحاق ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔

میرے پاؤں میں بھاری جوتے تھے اور غلطی سے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹانگ پر سے گذر گیا جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک تازیانہ رسید کیا۔ اگلے روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے طلب کیا اور اسی بکریاں بطور دیت عنایت فرمائیں اور فرمایا کہ اب تمہارا اور میرا حساب بے باق ہے۔

احساب ایک سنہری زنجیر ہے جس میں تمدن، اخلاق، مذہب اور معاشرت کی تمام جزئیات جکڑی ہوئی تھیں۔ اگر اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے تو دفعۃً نظام عالم کی ایک ایک کڑی درہم برہم ہو جائے۔ احساب سے ایک ایسا معاشرہ قائم ہو جاتا ہے جہاں کسی فرد کے ساتھ کوئی بڑی سے بڑی طاقت اور کوئی بڑے سے بڑا حاکم اور عامل بے انصافی نہ کر پائے۔ ہمارے پاس عہد فاروقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی احساب کی مثالیں موجود نہیں۔ وہ اپنے عمال اور اپنا احساب ایک ہی طرح کرتے تھے اور اس کا مقصد محض اصلاح احوال اور عوامی فلاح و بہبود تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر عمال ذاتی تعیش میں پڑ جائیں گے تو وہ عوامی فلاح کو یکسر فراموش کر بیٹھیں گے۔ اسلامی فلاحی ریاست صرف وہی ہو سکتی ہے جو عدل اور احساب ذات کے ہر معیار پر پوری اترے، جو عوام کو ہر طرح کی آسودگی و خوشحالی بہم پہنچائے اور جس کے کارکن اپنے نفس امارہ پر پوری طرح قابو پالیں۔ اسلام نے رنگ و نسل کو جس طرح یکسر ختم کیا اور احساب کو رواج دیا، وہ اپنی جگہ ایک منفرد واقعہ ہے۔ کل کے غلام بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حبشی اتنے باہمت ہو گئے کہ خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے جرنیل کے سر سے ان کا عمامہ اتار کر ان کے دونوں ہاتھ ان کی پشت سے باندھ دیتے ہیں۔ اس واقعہ کا پس منظر ملاحظہ ہو:

• عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلوم ہوا کہ خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک نامور شاعر الاضعت کو دس ہزار درہم ایک قصیدہ پڑھنے پر انعام میں دیئے ہیں تو انہوں نے شام کے گورنر ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذریعے ایک فرمان بھیجا کہ خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لوگوں کی موجودگی میں استفسار کیا جائے کہ یہ رقم انہوں نے کہاں سے لی ہے؟ اگر بیت المال سے دی ہے تو خیانت کی ہے اور اگر اپنی جیب سے دی ہے تو اسراف کیا ہے۔ دونوں حالتوں میں انہیں معزول کر دو۔ ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا البتہ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مندرجہ بالا طریقہ اختیار کیا اور جب خالد

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ وہ رقم انہوں نے اپنے مال سے دی ہے تو بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے ہاتھ کھول دیئے۔ ان کی ٹوپی ان کے سر پر رکھی اور ان کی پگڑی اس کے گرد لپیٹی اور بلند آواز سے اعلان کیا: ^{۵۴}

فسمع ونطیع لولاتنا ونظم و نخدم موالینا
 ”ہم اپنے حکام کی بات سنتے اور ان کی اطاعت کرتے ہیں اور اپنے موالی کے خادم ہیں۔“

اسلام اس بات کا خواہاں ہے کہ سمع و طاعت کے ایسے نظم میں انسانی معاشرہ ڈھل جائے جس میں اصل اطاعت خدا کی ہو۔ اس کی اطاعت کے لیے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی جائے اور اس سے نچلے درجے پر جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت میں نظام زندگی کو چلانے والے ہوں ان کی اطاعت ”معروف“ کی حد تک جائے۔ ان تینوں لڑیوں کا باہم رابطہ قرآنی نظام کے قیام کے لیے از حد ضروری ہے ورنہ اسلامی فلاحی ریاست کا قیام عمل میں نہیں آسکتا۔ قرآن حکیم ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جو نوع انسان کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو جیسا کہ اس آیت مبارکہ سے واضح ہوتا ہے۔ ^{۵۵}

یہ معاشرہ اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے ^{۵۶}

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ
 الْمُنْكَرِ تُوْمِنُونَ بِاللَّهِ ط

”اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

یہ ایسے افراد ہوں کہ جن کی جدوجہد کا رخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رہیں۔ اسلام نے ان نظریوں کی صرف تعلیم ہی نہیں دی بلکہ اس نے مسلمانوں کو عمل پر ابھارا ہے۔ مسلمانوں نے اس اخوت کو آزما کر دیکھا اور اس مساوات کو اچھی طرح چھو کر دیکھا ہے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ہی فیضان تھا کہ ایک مومن نے عمر فاروق رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کو برملا کہا تھا کہ ”اگر ہم نے تم میں کوئی کمی دیکھی تو ہم تمہیں تلوار سے سیدھا کر دیں گے۔“ اسی طرح جب فائقے سے آپ کو بھوک ستاتی تو آپ فرماتے:

”اے میرے پیٹ! تم اس وقت تک خوراک کے بغیر رہو گے جب تک کہ تمام لوگ سیر ہو کر نہ کھائیں۔“

اسلامی حکومت پر خوراک کی فراہمی کی ذمہ داری کس طرح عقائد ہوتی ہے، اسے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ ہی نے ایک فقرے میں جامعیت سے سمودیا ہے کہ اس سے زیادہ بلیغ انداز ذہن میں نہیں آسکتا۔ فرمایا:

”اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو قیامت کے دن عمر سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔“

اسلامی فلاحی ریاست میں نظام اقتدار نہیں بلکہ نظام اطاعت الہی ہے۔ یہاں حاکم احکام الہی کو پہلے اپنی ذات پر نافذ کرتا ہے پھر دوسروں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں راعی اور رعیت کے درمیان نفرت کی بجائے اخوت، ہمدردی اور مساوات جیسے ارفع جذبات فروغ پاتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کے پیش نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہوتا ہے کہ ”خبردار رہو۔ تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے اور مسلمانوں کا سب سے بڑا سردار جو سب پر حکمران ہو وہ بھی راعی ہے اور اپنی رعیت کے معاملے میں جوابدہ ہے۔“

اسلامی فلاحی ریاست میں شہریوں کے حقوق کے پیمانے بھی دوسرے نظام ہائے حکومت سے الگ ہوتے ہیں۔ یہ حقوق اسلام نے انسان کو بحیثیت انسان عطا کیے ہیں اور اسلامی ریاست کے دستور میں انہیں بنیادی جگہ حاصل ہے۔ اسی طرح اسلامی فلاحی ریاست کی ذمہ داریاں بھی دوسری ریاستوں سے بہت زیادہ ہیں۔ یہاں قانون کی بجائے اخلاقی اقدار پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے کیونکہ اخلاق سے ماورا ہو کر اچھی سے اچھی حکومت بھی مثبت نتائج برآمد نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ انسانوں سے پیار کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ بہتر ماحول میں رہ سکیں۔ اسلامی فلاحی ریاست اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق انسانوں کی بھلائی کا بھرپور خیال رکھتی ہے۔ یہ ان کی بنیادی ضروریات چاہے وہ معاشی ہوں یا معاشرتی، اخلاقی ہوں یا سیاسی،

بدرجہ اتم پورا کرتی ہے۔ یہ ان کو وقار اور عزت سے جینے کا ڈھنگ سکھاتی ہے۔
 حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے پورے معاشرے میں ذمہ داری کا
 احساس پیدا ہو گیا۔ ہر کسی نے رضائے الہی کے لیے جینے کا ڈھنگ سیکھا۔ سربراہ ریاست کی
 مثال یتیم کے سرپرست کی سی ہوگی۔ اگر وہ صاحب استطاعت ہوتا تو قومی دولت صرف کرنے
 میں احتیاط کرتا اور اگر حاجت مند ہوتا تو بقدر ضرورت لے لیتا۔ یہ انقلاب انقلاب فرانس سے
 بہت اعلیٰ و ارفع ہے کیونکہ اہل فرانس کا انقلاب ان کے مابین مساوات نہ لاسکا لیکن اسلامی
 انقلاب نے ان کو یہ اصول نشین کرایا کہ جو جس کا حقدار ہو اسے وہ چیز ملنی چاہیے اس طرح
 خاندانی، طبقاتی، اور مادی بالاتری ختم ہو کر رہ گئی۔

حوالہ جات

- ۱ قرآن حکیم ۲: ۲۰۱
- ۲ قرآن حکیم ۵: ۳۲
- ۳ ابوداؤد
- ۴ بخاری، مسلم، باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
- ۵ قرآن حکیم ۴: ۱۰۵
- ۶ قرآن حکیم ۴۲: ۵۱
- ۷ قرآن حکیم ۲۳: ۵۱
- ۸ قرآن حکیم ۴: ۶۵
- ۹ قرآن حکیم ۴: ۵۸
- ۱۰ قرآن حکیم ۴۹: ۹
- ۱۱ ابوداؤد، ترمذی
- ۱۲ ترمذی، سیرۃ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، محمد فاروق، ص ۳۰۴
- ۱۳ قرآن حکیم ۲۰: ۱۱۸-۱۱۹
- ۱۴ قرآن حکیم ۲: ۳۰
- ۱۵ حاشیہ سیرت جلیہ ج ۳، ص ۶۹
- ۱۶ قرآن حکیم ۱۳: ۱۱
- ۱۷ قرآن حکیم ۹۳: ۱۰
- ۱۸ قرآن حکیم ۲: ۲۷۳
- ۱۹ بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب اتقوا النار وبتشق نمرۃ
- ۲۰ بخاری، کتاب البیوع، باب شراء النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالیسینۃ
- ۲۱ ترمذی
- ۲۲ تذکرہ الحفاظ ذہنی ذکر مسروق بن اجدع تابعی او مسند ج ۲، ص ۳۲، بحوالہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج ۶، ص ۱۵۰ شبلی نعمانی
- ۲۳ ابوعبید، کتاب الاموال
- ۲۴ ابوداؤد

- ۲۵ تفسیر کبیر ج ۴، ص ۶۸۱، بحوالہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج ۵، ص ۱۵۱، شبلی نعمانی
- ۲۶ بحوالہ چند معاشی مسائل اور اسلام ص ۱۸۵، سید یعقوب شاہ
- ۲۷ متفق علیہ
- ۲۸ مسلم کتاب الزکوٰۃ باب فضل اخفاء الصدقہ
- ۲۹ قرآن حکیم ۲: ۲۷۱
- ۳۰ قرآن حکیم ۹: ۶۰
- ۳۱ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج ۵، ص ۲۳۷
- ۳۲ قرآن حکیم ۵۹: ۷
- ۳۳ قرآن حکیم ۹: ۳۴
- ۳۴ ترمذی
- ۳۵ قرآن حکیم ۲: ۲۶۱
- ۳۶ قرآن حکیم ۳: ۹۲
- ۳۷ بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ للناس
- ۳۸ قرآن حکیم ۲: ۱۷۲
- ۳۹ قرآن حکیم ۲: ۲۱۹
- ۴۰ قرآن حکیم ۵۱: ۱۹
- ۴۱ قرآن حکیم ۵۹: ۷
- ۴۲ قرآن حکیم ۵۳: ۳۹
- ۴۳ قرآن حکیم ۵۹: ۸
- ۴۴ قرآن حکیم ۴: ۷۵
- ۴۵ بخاری، ترمذی، نسائی
- ۴۶ احمد بن حنبل
- ۴۷ مسلم، ابوداؤد
- ۴۸ بخاری، کتاب الزکوٰۃ
- ۴۹ کتاب الخراج، فصل من تجب علیہ الجزیۃ، ص ۷۲، قاضی ابویوسف
- ۵۰ طبقات، ج ۳، ص ۳۱۷، ابن سعد
- ۵۱ بحوالہ اسلام میں مرکزی حکومت کا تصور اور اس کی معاشی اور اقتصادی ذمہ داریاں، ص ۲۴۶، رشید اختر ندوی

- ۲ عقد الفرید، ج ۳، ص ۱۲۲
۵۳ زاد المعاد، ج ۲ حافظ ابن قیم
۵۴ طبری ج ۲، ص ۲۰۵
۵۵ قرآن حکیم ۱:۳
۵۶ ۱۱۰:۳

اسلام کا معاشی نظام

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد فوری طور پر ارد گرد کے قبائل کے ساتھ میثاق مدینہ طے فرمایا جس کی رو سے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے الفاظ میں ایک اجتماعی انشورنس کا انتظام کیا گیا۔^۱ اس سے پیشتر اگر کوئی شخص غلطی سے کسی کو قتل کر دیتا تو اسے ایک سواونٹ خون بہا ادا کرنا پڑتا۔ اس ذاتی ذمہ داری سے نکال کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ادائیگی اجتماعی طور پر فرمادی۔ اسی طرح دشمن کے ہاتھوں پکڑے جانے والے فرد کی رہائی کے لیے ایک سواونٹ فدیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ غریب رہائی پانے کے بجائے دشمن کے غلام بن کر رہ جاتے۔ اس کی رہائی کی ذمہ داری ہر قبیلے میں قائم کیے گئے انشورنس یونٹ پر ڈال دی گئی۔ اگر اس یونٹ کے وسائل محدود ہوتے تو اس کو قریبی آبادی اس کی اعانت کرتی۔ ممکن ہے کہ ساری آبادی کی انشورنس یونٹیں بھی یہ بار نہ اٹھا سکیں تو ایسی صورت میں مرکزی حکومت پر مدد دینا فرض قرار دیا گیا۔^۲

۹ھ کے بعد حصول دولت کے پر امن طریقوں کے دروازے کھل چکے تھے۔ اسی بنا پر فرضیت زکوٰۃ کا حکم نازل ہوا۔ اس سے قبل خیرات، صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کا عام حکم ہی نافذ تھا۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ ”سارے مومن بھائی بھائی ہیں۔“^۳ اس لیے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ انفاق محبت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

تاسیس ریاست کے بعد تو نادار افراد کی کفالت کی ذمہ داری ریاست کی ٹھہری ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو آغاز سے ہی یتیموں اور فقراء کی خبر گیری کرتے آئے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ”فترت“ کے تین سال بعد یہ نہ فرماتا کہ ”لہذا یتیم پر سختی نہ کرو اور سائل کو نہ جھڑکو۔“^۴ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اجتماعی اور اقتصادی پہلو میں بھی ہمہ گیر تھی۔ اس اعتبار سے معاشی طور پر جو پروگرام پیش کیا گیا اس کے آگے محض نصف صدی میں دنیا کی تین بڑی سلطنتیں (ایران، مصر اور شام) سرنگوں ہو گئیں۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے قوانین کو

مذہب تک ہی محدود رکھتے تو اسلام اتنی سرعت سے نہیں پھیل سکتا تھا۔

اس نظام کی اساس ربوبیت ہے کیونکہ آسمانوں اور زمین کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور وہی رزاق ہے۔ اس نے انسان کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ کسب حلال کے حصول کے لیے ان کا بھرپور استعمال از حد ضروری ہے تاکہ وہ قومی پیداوار یا دولت میں اپنا کردار ادا کر سکے۔ اس حقیقت سے سب آشنا ہیں کہ معاشرہ میں معاشی عدم توازن انتشار اور افتراق کو جنم دیتا ہے۔ اس طرح مجرمانہ اقدار فروغ پاتی ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حل مواخاۃ کی شکل میں نکالا۔ مہاجرین مکہ سے مدینہ آئے تو تہی دست بھی تھے اور غریب الدیار بھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے معاشی مسائل کا حل مواخاۃ میں تلاش کیا۔ ہم اس عظیم نظام کو کفالت قومی کا معاشی نظام بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے نسبتاً خوشحال انصار اور مکی مہاجرین کے نمائندوں کا اجلاس طلب فرمایا اور انصار سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ”یہ تمہارے بھائی ہیں، تمہارے ہی دین والے ہیں اور اس دین ہی کی خاطر اپنے وطن، اپنے ملک اور اپنی ہر چیز کو چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔ اس لیے تمہارا یہ فریضہ ہے کہ ان کی مدد کرو۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز پیش کی کہ ہر ایک مدنی مسلمان ایک مکی مسلمان سے عہد اخوت باندھے اور اس کو اپنے گھر میں جگہ دے۔ وہ اکٹھے حصول معاش کے لیے کوشش کریں تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکیں۔“ یاد رہے کہ مواخات کا مقصد کسی کو مفت خور یا طفیلی بنانا ہرگز نہ تھا بلکہ معاشی وسائل کو بڑھانا تھا۔ جہاں یہ بھائی چارہ ایک حکیمانہ سیاست اور مسلمانوں کو درپیش بہت سے مسائل کا بہترین حل تھا وہاں اس بھائی چارہ نے مسلمانوں میں اخوت، ہمدردی اور الفت و محبت کی جو فضا پیدا کی وہ حقیقی بھائیوں سے بھی بڑھ کر تھی۔ مواخاۃ کی تجویز منظور کر لینے پر مدنی مسلمان انصار کہلائے۔ ان کے متعلق ارشاد باری ہے: ۵

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَا

وَنَصَرُوا أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝

”جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور

جدوجہد کی اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے

خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے۔“

مواخات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ”کئی سو خاندان ایک لمحے میں گزر بسر کے انتظامات حاصل کرنے کے قابل ہو گئے اور پھر اس کے بعد کبھی یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوا کہ کون خوشحال ہے، کون بے روزگار ہے، کون پناہ دہندہ ہے اور کون باہر سے آیا ہوا مہاجر ہے۔“ اس نے طرفہ العین مہاجرین کی ساری مشکلات کو ختم کر دیا۔

انسان کی معاشی زندگی سے متعلق دولت کی تقسیم ایک اہم ترین اور نہایت ہی متنازعہ مسئلہ رہا ہے۔ اس نے عصر حاضر کی دنیا میں عالمی انقلابات کو بھی جنم دیا ہے۔ علاوہ بریں اس نے فرد کی نجی زندگی سے لے کر عالمی سیاست تک انسانی سرگرمیوں کے ہر شعبہ کو متاثر کیا ہے۔ اس پر نہ صرف زبانی اور تحریری بیان بازی ہوتی رہی ہے بلکہ مسلح تصادم تک کی بھی نوبت آتی رہی ہے۔ اسلام میں اگر توحید الوہیت شجر حیات کی اصل ہے تو معاشیات اس کا ثمر ہے کیونکہ روزی زندگی کے قیام کے لیے ناگزیر ہے۔ زندگی ہوگی تو انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کر سکتا ہے۔ اسلام فرد کے ذرائع معاش کو جائز اور قانونی ہونے کے ساتھ ساتھ لازمی بھی قرار دیتا ہے۔ یہ کسب حلال پر بہت زور دیتا ہے لیکن یہ معاش اور معاشی ترقی کو انسانی زندگی کا منہج مقصود قرار نہیں دیتا۔ رزق کمانے کا ایک ذریعہ تجارت ہے جس کے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ دس میں سے نو حصے رزق تجارت میں ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ.

”یعنی اللہ کا فضل تلاش کرو۔“

مال سے محبت خیر کے لیے ہو تو درست ہے۔ جیسے فرمایا:

فَقَالَ إِنِّي أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّي.

”یعنی میں نے اس مال کی محبت اپنے رب کی یاد کی وجہ سے اختیار کی ہے۔“

ورنہ:

وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ۝

یعنی ”اور وہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے۔“

جائز طریقے سے زیادہ سے زیادہ دولت کمانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ بغیر محنت کے

حصول زر کے ہر طریقے کی ممانعت کی گئی ہے۔ قمار کو تو قرآن حکیم میں ”میسر“ یعنی آسانی سے ہاتھ آنے والی دولت سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسے رجس من عمل الشیطان کہا ہے۔ محض دنیاوی مقاصد کے حصول کو ناپسند کیا گیا ہے۔^{۱۰}

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝

”رہی یہ دنیا، تو یہ محض ایک ظاہر فریب چیز ہے۔“

ایسی شکل میں مال اور اولاد کو فتنہ قرار دیا گیا ہے۔^{۱۱}

وَاعْلَمُوْا اَنَّ مَا اَمْوَالِكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ.

”اور جان رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد حقیقت میں سامان آزمائش ہیں۔“

اگر ذرائع معاش کو اخروی زندگی کو سامنے رکھ کر اختیار کیا جائے گا تو یہ فضل اللہ ہیں ورنہ ارشاد ربانی ہے:^{۱۲}

وَابْتَغِ فِيمَا ءَاتَكَ اللّٰهُ الدّٰرَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا
وَاحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ. ^ط

”جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر۔“

دولت کی کوئی بھی قسم ہو وہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ ارشادات ربانی ملاحظہ ہوں:

۱- وَآتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِى اتَّكُم. ^{ط ۱۳}

”اور ان کو اس مال میں سے دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔“

۲- اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَا اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَلِكُوْنَ ۝ ^{۱۴}

”کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہم نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے

ان کے لیے مویشی پیدا کیے اور اب یہ ان کے مالک ہیں۔“

۳- اَفَرَاۤءَ يَتَمَّمُ مَا تَحَرُّوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَہٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ ^{۱۵}

”کبھی تم نے سوچا، یہ بیج جو تم بوتے ہو ان سے کھیتیاں تم اگاتے ہو یا ان کے

اگانے والے ہم ہیں۔“

لیکن اللہ تعالیٰ نے دولت کی ہر قسم کا خود مالک ہونے کے باوجود انسانوں کو اپنے قوانین کے مطابق استعمال کا حق دیا ہے چنانچہ حق جائیداد بعض قیود کے ساتھ عطا کیا گیا ہے۔ ہمیں اس کے استعمال کی اجازت ہے لیکن جہاں وہ کہتا ہے۔^{۱۶} یہ آیت ہمارے لیے درج ذیل رہنما اصول وضع کرتی ہے:

- ۱۔ دولت اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔
- ۲۔ انسان کو اس کے استعمال کرتے وقت آخرت کو مد نظر رکھنا چاہیے۔
- ۳۔ اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے احکام کے تحت ہونا چاہیے۔
- ۴۔ دولت کا ایک مخصوص حصہ دوسروں کو دینا چاہیے۔
- ۵۔ اس کے استعمال سے اجتماعی برائیاں پیدا نہیں ہونی چاہئیں نہ ہی انسان زمین میں فساد برپا کرے۔

یہی چیز اسلامی نکتہ نظر کو سرمایہ دارانہ اور اشتراکی فلسفہ ہائے حیات سے امتیاز کرتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام فرد کو مطلق اور غیر مشروط حق جائیداد دیتا ہے۔ وہ اس کا جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ اسلام کا معاشی نظام ہم آہنگی کے اس تصور پر قائم ہے جو سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کی انتہاؤں کے درمیان ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اعتدال والی راہ ہے اسلام نجی املاک کا مخالف ہے نہیں ہے لیکن اس کے مطلق اور غیر مشروط استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔^{۱۷}

أَصْلُوْتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ تَتْرَكَ مَا يَعْْبُدُ آبَاءُ نَا أَوْ أَنْ نَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ.^ط

”کیا تمہاری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنی منشاء کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو۔“

اسلام نے مال اللہ^{۱۸} کہہ کر سرمایہ دارانہ نظریہ پر ضرب کاری لگائی ہے اور یہ کہہ کر کہ جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا کیا ہے اس نے اشتراکی فکر کی جڑیں کاٹ دی ہیں جس کا آغاز فرد کے نجی جائیداد کے انکار سے ہی ہوتا ہے۔ سورۃ یٰسین کی ایک آیت^{۱۹} سنہایت ہی واضح طور پر نجی

جائیداد کے حق کو اللہ کا ایک تحفہ قرار دیتی ہے۔ عملی معاشیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا اہتمام کیا کہ دولت چند ہاتھوں میں جمع ہونے کی بجائے زیادہ سے زیادہ افراد کے درمیان گردش کرتی ہے اور اس کی روح کو برقرار رکھنے کے لیے صاحب امر کو یہ اختیار دیا کہ وہ ارتکاز دولت کو روکنے کے لیے اقدامات کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر بنی نضیر کی فتنے کو تمام تر فقراء اور مہاجرین میں تقسیم کر دیا تھا تا کہ معاشی توازن برقرار رہے۔ اور یہی قرآن حکیم کا بھی حکم ہے یعنی ”تا کہ دولت صرف تم میں سے مالداروں کے درمیان ہی گردش نہ کرتی رہے۔“

اسلام دولت کی تقسیم کے لیے تین مقاصد قرار دیتا ہے۔

(۱) معیشت کے قابل عمل نظام کا قیام جو فطری ہو۔ اس میں فرد کو اپنی صلاحیتوں اور پسند

کے مطابق کام کرنے کی اجازت ہے۔ یہ آجر اور اجیر کے درمیان صحت مند تعلقات اور

رسد اور طلب کی فطری قوت کے مناسب استعمال کے بغیر ناممکن ہے۔ اسلام ان عوامل

کو تسلیم کرتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں اس اصول کا جامع اشارہ موجود ہے:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ

بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سَخِرِيًّا.^ط

”دنیا کی زندگی میں ان کے گزر بسر کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم

کیے ہیں اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا

فوقیت دی ہے تا کہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں۔“

(ب) ہر کسی کو اس قابل بنانا کہ وہ لے سکے جس کا وہ حقدار ہے۔ دوسرے نظام صرف اسی کو

ہی اس کا حقدار بناتے ہیں جنہوں نے براہ راست دولت کی پیدائش میں حصہ لیا ہو لیکن

اسلام دولت کا مالک صرف اللہ تعالیٰ کو قرار دیتا ہے، اس لیے اس کے استعمال کے لیے

اسی کے احکام کی پیروی کرنا ہوگی۔ اسلام ضرورت مندوں، مساکین اور محتاجوں کو بھی

اس میں شریک ٹھہراتا ہے اور اہل ثروت پر یہ لازم ہے کہ وہ انہیں حصہ دار بنائیں۔

ارشاد ربانی ہے:

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۖ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝

”جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے۔“
 بعض آیات میں اس حق کو اللہ تعالیٰ کا حق قرار دیا گیا ہے جیسے فرمایا: ^{۱۳}
 وَأَنْتُمْ حَقُّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ.

”اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو۔“

پس اسلام دولت کی تقسیم اس طرح چاہتا ہے کہ وہ تمام افراد جنہوں نے دولت کی پیدائش میں حصہ لیا ہے ان کو اس کا اجر ضرور ملنا چاہیے۔

(ج) ارتکاز دولت کے انسداد کے لیے یہ ضروری ہے کہ دولت کی گردش ہونی چاہیے تاکہ امیر اور غریب کے درمیان امتیاز فطری اور قابل عمل حد تک کم کیا جاسکے۔ اس لیے اسلام نے کسی فرد یا گروہ کو دولت کے بنیادی ذرائع پر اجارہ داری نہیں دی اور معاشرے کے ہر فرد کو اس سے استفادہ کرنے کا مساوی حق عطا کیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ من احتكر فهو خاطي.

”اجارہ داری کرنے والا گناہگار ہے۔“

۲۔ الجالب مرزوق والمستكر ملعون.

”وہ شخص جو اشیاء ضرورت کو روکتا نہیں بلکہ وقت پر بازار لاتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے رزق دیتا ہے اور احتکار کرنے والا لعنت کا مستحق ہے۔“

۳۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جو شخص مسلمانوں کے لیے اشیاء کے نرخ گراں کرنے کی غرض سے ذخیرہ کرے وہ غلط کار ہے۔“

۴۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

”جو شخص مسلمانوں کے بازار کے نرخ میں اس لیے دخل دے کہ اسے گراں کر دے تو اللہ تبارک و تعالیٰ پر ضروری ہو جاتا ہے کہ قیامت کے دن اسے زبردست آگ میں جھونک دے۔“

کانیں، جنگلات، غیر ملکیتی، بنجر زمینیں، شکار اور مچھلی پکڑنا، خود رو گھاس، دریا، سمندر،

مزدور کے کام لیا تو پورا پورا انگریز سے اس کی اجرت ادا نہ کی۔“
 امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تو اجیر کو آجر کے ساتھ منافع میں برابر کے حصہ کا حقدار سمجھتے ہیں
 کیونکہ منافع کمانے میں جتنا آجر کے سرمایہ کا حصہ ہے اتنا ہی محنت کش کی محنت شاقہ کو بھی دخل
 ہے۔ لہذا ان کے خیال میں دونوں کا منافع میں مساوی حصہ ہونا چاہیے۔ اس طرح اسلام نے
 پرامن بقائے باہمی کی دعوت دی ہے۔ کیونکہ وہ تو طبقاتی کشمکش کی نوبت ہی نہیں آنے دیتا۔
 حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم سرمایہ دارانہ نظام کے لیے موت ہے۔

قرآن حکیم معاشی نا انصافی کو خسار سے تعبیر کرتا ہے کیونکہ اس سے معاشرے کا توازن
 درہم برہم ہو جاتا ہے اور نتیجہ افتراق کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ دولت جمع کرنے والوں کو
 اس طرح تنبیہ کی گئی ہے:

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ
 فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا
 جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وظُهُورُهُمْ ۗ هَذَا مَا كَنْزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا
 كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ۝

”دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور
 انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی
 پر جہنم کی آگ ڈھرائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی سانسوں اور
 لہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا..... یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا
 تھا، لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔“

زکوٰۃ:

اسلام صلوٰۃ اور زکوٰۃ کو نظام کی دو بنیادیں قرار دیتا ہے یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر
 ان میں سے ایک بھی موجود نہ ہو تو نظام کا حسن بھی برقرار نہ رہے۔ اگر صلوٰۃ انسان کی جمالیاتی
 اور اخلاقی اقدار کا نظام ہے تو زکوٰۃ اس کی معاشی اقدار کا نظام ہے۔ فتح مکہ (رمضان ۸ھ)
 کے بعد زکوٰۃ فرض ہوئی اور محرم ۹ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے

ملک بھر میں مخلصین مقرر فرمائے۔^{۲۸} صلوٰۃ کی اساس تو حید الوہیت ہے جب کہ زکوٰۃ کی بنیاد تو حیدر بو بیت ہے۔

پہلے زکوٰۃ ان اصناف پر مقرر ہوئی جو کچھ عرصہ تک محفوظ رہ سکتی ہیں (جیسے زمین، جانوں سونا چاندی یا ان کے سکے اور تجارتی مال) تاکہ ان سے خانگی اور تجارتی فوائد حاصل کیے جا سکیں۔ اس کے برعکس ضائع ہو جانے والی اشیاء (Perishable goods) پر زکوٰۃ عائد نہیں کی گئی۔ جن اشیاء میں نشوونما اور ترقی کی صلاحیت موجود نہیں مثلاً آلات، مکان، سامان، اسباب سواری اور قیمتی پتھر وغیرہ ان پر بھی زکوٰۃ عائد نہیں کی گئی۔ (زکوٰۃ کے مصارف سورۃ توبہ رکوع ۸ میں مذکور ہیں) صرف آٹھ مصارف کی شرح مقدار ۱/۵ کا ۱/۸ حصہ یعنی ۱/۴۰ مقرر ہوا۔ یعنی سونا چاندی کی زکوٰۃ ان آٹھ مصرفوں کے لیے مجموعی رقم کا چالیسواں حصہ رکھی گئی۔ جہاں تک جانوروں کا تعلق ہے بے نسل یا کم نسل کے جانوروں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ غرباء، نادار، مقروضوں اور ان غلاموں کو جو سرمایہ نہیں رکھتے یا اپنی آزادی کے لیے رقم جمع کر رہے ہیں پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔ اسی طرح کم سرمائے والوں پر بھی کوئی باقاعدہ زکوٰۃ عائد نہیں کی گئی۔

زکوٰۃ کے نظام کے قیام و انصرام کی ذمہ داری ریاست کی ہے البتہ اگر کسی جگہ حکومت کفالت اجتماعی کے نظام کے اہتمام سے قاصر رہتی ہے یا ان کی اپنی ریاست ہی نہ ہو تو مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ وہ زکوٰۃ کا نظام خود سنبھال لیں۔

زکوٰۃ کے نظام کو رواج دینے سے درج ذیل ثمرات حاصل ہوں گے:

نادار افراد کی کفالت کرنے سے افراد کا افراد کے ہاتھوں استحصال ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے معاشرے میں اخوت و مساوات اور یگانگت و یکجہتی کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ جب ضرورت مندوں کو معاشی تحفظ حاصل ہو جائے گا تو دفاعی صلاحیتوں میں بے پناہ اضافہ پیدا ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے باقی دوائر میں بھی ہمہ گیر ترقی کے امکانات روشن ہوں گے۔ جب ہر فرد کسی نہ کسی اعتبار سے مصروف کار ہوگا تو معاشرہ فتنہ و فساد سے محفوظ ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں معاشی نظام کی کارکردگی بہتر ہونے کے امکانات پیدا ہوں گے کیونکہ دولت کی گردش متوازن رہنے سے معیشت کے احیاء میں متوازن یکسانیت پیدا ہوگی۔ رعایا کی کفالت کرنا

ریاست کی ذمہ داری ہے اور یہ زکوٰۃ کے نظام کو ہی رواج دینے سے ممکن ہے۔

۸ھ میں اسلام نے سود کی ممانعت فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں ارشادات ربانی ملاحظہ

ہوں:

۱۔ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبْوَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبْوَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبْوَا ۗ فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ ۗ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ ۗ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبْوَا وَيُجْزِي الصَّدَقَاتِ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ۝^{۲۹}

”مگر جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھوڑ کر باؤلا کر دیا ہو اور اس حالت میں ان کے بتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں تجارت بھی آخرت سود ہی جیسی چیز ہے۔ حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ لہذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لیے وہ سود خواری سے باز آ جائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا ہو کھا چکا اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو اس حکم کے بعد پھر اس حرکت کا اعادہ کرے، وہ جہنمی ہے۔ جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اللہ سود کا لٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔ اور اللہ کسی ناشکرے بد عمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔“

۲۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبْوَا إِن كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۗ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ ۖ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝^{۳۰}

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو خدا سے ڈرو اور کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کر لو (اور سود چھوڑ دو) تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حقدار ہو،

نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔“

۳۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝^{۳۳}

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے

ڈرو امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔“

۱۔ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود خور اور سود دینے والے پر نیز بنشی اور گواہ پر لعنت فرمائی ہے۔^{۳۲}

۲۔ عبد اللہ بن حنظلہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”سود کا ایک درہم جس کو آدمی جانتے بوجھتے کھائے چھتیس بار زنا کرنے سے زیادہ گناہ ہے۔“^{۳۳} لیہتی نے شعب الایمان میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی روایت نقل کی ہے اور یہ الفاظ بھی روایت کیے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو گوشت مال حرام سے پیدا ہو وہ النار یا دوزخ کے لائق ہے۔“^{۳۴}

۳۔ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”سود کے ستر اجزا ہیں۔ ان میں سے ایک معمول سا جز بلحاظ گناہ ایسا ہے جیسے کوئی اپنی ماں سے جماع کرے۔“

۴۔ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ معراج کی شب میرا گزر ایک ایسی قوم پر سے ہوا جن کے پیٹ گھڑوں کے مانند تھے اور ان کے بڑے بڑے پیٹوں میں سانپ تھے جو باہر سے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے جبریل سے پوچھا: ”یہ کون لوگ ہیں؟“ اس نے کہا: ”یہ سود خور لوگ ہیں۔“^{۳۵}

۵۔ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب کوئی شخص کسی کو قرض دے تو اس سے ہدیہ قبول نہ کرے (اس لیے کہ یہ سود کا حکم رکھتا ہے)۔“^{۳۷}

۶۔ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ایک ایسا زمانہ لوگوں پر آئے گا کہ سود خوروں کے سوا کوئی باقی نہ رہے گا۔“ اگر کوئی شخص ہوگا بھی تو اس کو سود کے بخارات یا اثرات پہنچیں گے۔ ایک روایت ہے کہ اس کو سود کا غبار پہنچے

سود حسن دولت کے لیے غارت گر ہے۔ سرمایہ کاری کا موجودہ نظام بھی محنت کشوں اور مزاروں کی معاشی مجبوری سے ناجائز فائدہ ہی تو ہے جس کا نام استحصال ہے۔ عصر حاضر کی سرمایہ کاری کی ہر شکل سود کاری ہے جو دراصل ”استحصال بالمال“ ہے۔ مزارعت، مضاربت، دستارگیری (پگڑی لینا) اور معاوضہ نام و شہرت (good will) سود ہی کی اقسام ہیں۔

اسلام نے سود کی ممانعت فرمائی ہے کیونکہ اس میں اصلاحی معاشی انقلاب مستور ہے۔ اس طرح ایک فرد میں محنت کی لگن پیدا ہوتی ہے اور ساتھ ہی وہ کفایت شعاری پر بھی آمادہ ہوتا ہے۔ اگر ممانعت کے اس حکم کو مد نظر رکھا جائے تو اسلامی ریاستیں عالمی سطح پر قرضے نہیں لیں گی اور اپنے ہاں کے بے مصرف سرمایہ کو صنعتوں کے قیام میں صرف کر سکیں گی۔

عشر:

باران زمین پر حاصل ہونے والی آمدنی پر عشر عائد کیا گیا اور نہری زمین پر بیسواں حصہ مقرر ہوا۔ تاجروں کے مقابلے میں کاشتکاری پر قانونی خیرات کی شرح کم رکھی گئی کیونکہ ان دونوں کے حالات میں یکسر فرق ہے۔ کاشتکاروں کو دیہاتوں سے منڈیوں تک اپنی اجناس لانے میں بڑی تگ و دو کرنی پڑتی ہے جب کہ تاجر اس سے مبرا ہوتے ہیں۔

خمس میں چونکہ حکومت کے تمام ذاتی و قومی مصارف شامل ہوتے ہیں اس لیے وہ ”کل“ کا (خمس) یعنی ۱/۵ حصہ مقرر ہوا۔

متمول افراد کے مال و دولت میں مفلوک الحال، حاجت مند اور محروم افراد کا حق یا حصہ قانوناً رکھا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انفاق بالعفو (ضرورت سے زائد مال و دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) کا درس دیا۔ اگر کوئی شخص انفاق سے انکار کرتا ہو تو اس کی کمائی جائز نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر انفاق بالعفو کے اصول پر عمل کیا حتیٰ کہ وفات سے قبل کی ساعات میں بھی ایسا ہی کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تحویل میں اس کے ضرورت سے زائد دینار خیرات کر دیئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیمارداری کی مشغولیت کی وجہ سے وہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذہن سے محو ہو گئے تھے۔ یہی وجہ

ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی صاحب نصاب نہ ہوئے۔ بحیثیت سربراہ ریاست آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو کچھ مال و دولت آتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے معاشرے کی تعمیر و ترقی، فلاح و بہبود، نیز دفاعی امور اور اسلام کی تبلیغ پر خرچ کر ڈالتے تھے اور خود انتہائی سادگی اور عسرت سے زندگی بسر کرتے تھے۔

ارتکاز دولت کو روکنے کے باقی طریقوں میں کفارات، صدقہ الفطر، نفقات، وراثت اور خراج جزیہ شامل ہیں۔ کفارات میں جیسے روزہ باقلم توڑنے کا کفارہ، صدقہ الفطر پونے دو سیر گندم ہر فرد پر نقصانات میں ضرورت مند عزیز و اقربا کی امداد، وراثت میں لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کا بھی حصہ^{۳۹} اور خراج و جزیہ وہ اہم مذاات ہیں جو اس مقصد کے حصول میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ خراج زمین پر ٹیکس ہے جس کو حکومت کیونٹی پر خرچ کر سکتی ہے۔

قرآن حکیم میں زر کے لین دین کے متعلق فرمایا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَانَيْتُمْ بِدِينِ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ^ط
وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ
اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ^ج وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ
مِنْهُ شَيْئًا^ط فَإِنْ كَانَ الَّذِينَ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ
أَنْ يُمْلِئَ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيَّهُ بِالْعَدْلِ^ط وَالشَّاهِدُونَ شَاهِدِينَ مِنْ رِجَالِكُمْ^ج
فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ
تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكَّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى^ط وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا
دُعُوا^ط وَلَا تَسْنَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ^ط ذَلِكَمُ
أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ
تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ إِلَّا تَكْتُبُوهَا^ط
وَأَشْهَدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ^ط وَإِنْ تَفَعَّلُوا فَإِنَّهُ
فَسُوقٌ بِكُمْ^ط وَاتَّقُوا اللَّهَ^ط وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ^ط وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب کسی مقرر مدت کے لیے تم آپس میں قرض

کالین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔ فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے۔ جسے اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت بخشی ہو، اسے لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہیے۔ وہ لکھے اور املا وہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے۔ (یعنی قرض لینے والا) اور اسے اللہ، اپنے رب سے ڈرنا چاہیے کہ جو معاملہ طے ہوا ہو اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ لیکن اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو یا املا نہ کرا سکتا ہو تو اس کا دلی انصاف کے ساتھ املا کرائے۔ پھر اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرا لو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ یہ گواہ ایسے لوگوں سے ہونے چاہیے جن کی گواہی تمہارے درمیان مقبول ہو۔ گواہوں کو جب گواہ بننے کے لیے کہا جائے تو انہیں انکار نہ کرنا چاہیے۔ معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا میعاد کی تعیین کے ساتھ اس کی دستاویز لکھوا لینے میں تساہل نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ تمہارے لیے زیادہ مہنی برانصاف ہے اس سے شہادت قائم ہونے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے اور تمہارے لیے شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے کا امکان کم رہ جاتا ہے۔ ہاں جو تجارتی لین دین دست بدست تم لوگ آپس میں کرتے ہو اس کو نہ لکھا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ مگر تجارتی معاملے طے کرتے وقت گواہ کر لیا کرو۔ کاتب اور گواہ کو سنایا جائے۔ ایسا کرو گے تو گناہ کا ارتکاب کرو گے۔ اللہ کے غضب سے بچو۔ وہ تم کو صحیح طریق عمل کی دعوت دیتا ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔“

قرضہ کی ادائیگی کی تاکید کے سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”خدا تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے لیکن قرضے معاف نہیں کرتا۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقروض اشخاص کی نماز جنازہ پڑھنے سے بھی احتراز فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع و شری کے قوانین واضح طور پر وضع کیے۔ ملامت (کپڑے

کو چھو لینا) اور منابذت (کپڑے پر اپنا کپڑا پھینک دینا) کی شکل میں بیع کو حرام قرار دیا۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (باغ کے تازہ پھل کو خشک پھلوں کے بدلے اس طرح فروخت کرنا کہ خشک پھل کا پیمانہ مقرر کیا جائے اور تازہ پھلوں کا اندازہ کیا جائے) سے بھی منع فرمایا۔ محافلہ یعنی کھڑی فصل کے بدلے غلہ کی مقرر مقدار کی فروخت سے بھی منع فرمایا۔ مزید برآں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی ایسی بنجر زمین کو جو کسی کی ملکیت نہ ہو قابل کاشت بنائے وہ اس کی ہے اور ناحق کسی کی زمین پر قبضہ کرنے پر سخت وعید فرمائی۔ ہمسائے اور شریک ملکیت کو شفع کا حق دیا گیا ہے تاکہ ہمسایوں میں منافرت پیدا نہ ہو۔

اسلامی ریاست معاشی عدل کے حصول کے لیے درج ذیل اقدامات کرے گی:

- ۱۔ معاشی بدعنوانیوں کا کاتمہ
- ۲۔ ہر قسم کے استحصال کا استیصال
- ۳۔ محنت و سرمایہ کی باہمی آویزش کا خاتمہ
- ۴۔ دولت کی منصفانہ تقسیم
- ۵۔ روزگار کے مواقع فراہم کرنا
- ۶۔ محتاجوں کی کفالت کرنا۔

ریاست کو نجی املاک کی تنظیم کی خاطر قانون سازی کا حق حاصل ہے جس کی رو سے وہ معاشرتی بہبود کے لیے ان میں حسب ضرورت تبدیلی کرنے یا لانے کا مکمل اختیار رکھتی ہے۔ اسلام نے دولت میں اسراف اور تبذیر سے منع کیا ہے۔ حصول دولت میں ناکام اور پیچھے رہ جانے والوں کے لیے اہل ثروت کے اموال میں حق رکھا۔ وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ^{۲۲} اور ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لیے۔ اس کی عملی صورتوں

میں زکوٰۃ، صدقات واجبہ، نفقات، کفالات، وصیت اور وراثت شامل ہیں۔ معاشرتی عدم مساوات کے اثرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح زائل کیے کہ زکوٰۃ، صدقات اور حقوق العباد کی ادائیگی کا ہمہ گیر نظام قائم کیا جس کے نتیجے میں ایک دن وہ بھی آیا کہ زکوٰۃ اور خیرات لینے والے مشکل سے ملتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی عوامی رویے نے معاشرے کے متمول طبقے کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ قرآن حکیم کی زبان میں یہ سوال خود پوچھیں کہ: مَاذَا يُنْفِقُونَ؟ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مستضعفین اور غریب طبقہ کے لوگوں پر کیا خرچ کریں؟ اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ ان سے کہہ دیں کہ ”الْعَفْوُ“ (البقرہ) یعنی اتنا تو ضرور دیا جائے جو خود انہیں تکلیف میں مبتلا نہ کر دے اور ان پر بار نہ ہو۔

حوالہ جات

- ۱- خطبات بہاول پور، ص ۵۵
- ۲- ایضاً
- ۳- قرآن حکیم ۱۰:۴۹
- ۴- قرآن حکیم ۹:۹۳-۱۰
- ۵- قرآن حکیم ۸:۷۴
- ۶- خطبات بہاول پور، ص ۵۳، ڈاکٹر محمد حمید اللہ
- ۷- قرآن حکیم ۱۰:۶۲
- ۸- قرآن حکیم ۳۲:۳۸
- ۹- قرآن حکیم ۸:۱۰۰
- ۱۰- قرآن حکیم ۱۸۵:۳
- ۱۱- قرآن حکیم ۲۸:۸
- ۱۲- قرآن حکیم ۷۷:۲۸
- ۱۳- قرآن حکیم ۳۳:۲۴
- ۱۴- قرآن حکیم ۷۱:۳۶
- ۱۵- قرآن حکیم ۶۳:۵۶-۶۴
- ۱۶- قرآن حکیم ۷۷:۲۸
- ۱۷- قرآن حکیم ۸۷:۱۱
- ۱۸- قرآن حکیم ۳۳:۲۴
- ۱۹- قرآن حکیم ۷۱:۳۶
- ۲۰- قرآن حکیم ۳۲:۴۳
- ۲۱- قرآن حکیم ۲۴:۷۰-۲۵
- ۲۲- قرآن حکیم ۱۴۱:۶
- ۲۳- قرآن حکیم ۷:۵۹
- ۲۴- قرآن حکیم ۳۲:۴۳
- ۲۵- قرآن حکیم ۲۶:۲۸

- ۲۶ امام بیہقی، السنن الکبریٰ
- ۲۷ قرآن حکیم ۹: ۳۳-۳۵
- ۲۸ طبری، ج ۴، ص ۱۷۲۲، مطبوعہ یورپ، ابن سعد جز مغازی، ص ۱۱۵، بحوالہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج ۲، ص ۷۶، شبلی نعمانی
- ۲۹ قرآن حکیم ۲: ۲۷۵-۲۷۶
- ۳۰ قرآن حکیم ۲: ۲۷۸-۲۷۹
- ۳۱ قرآن حکیم ۳: ۱۳۰
- ۳۲ مسلم، دارالمشکوٰۃ، کتاب البیوع، باب الربوا، ج ۱
- ۳۳ احمد، دارقطنی
- ۳۴ دارالمشکوٰۃ، باب الربوا، ص ۱۹۲
- ۳۵ ابن ماجہ و بیہقی دارالمشکوٰۃ، باب الربوا، ج ۲۰
- ۳۶ احمد، ابن ماجہ، دارالمشکوٰۃ، موضوع مذکور، ج ۲۳
- ۳۷ بخاری دارالمشکوٰۃ، موضوع مذکور، ج ۲۶
- ۳۸ احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارالمشکوٰۃ، موضوع مذکور، ج ۱۲
- ۳۹ اس سلسلہ میں ارشاد ربانی ملاحظہ ہو (قرآن حکیم: ۷: ۷۰)
- لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، خواہ تھوڑا ہو یا بہت، اور ہر حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔
- ۴۰ قرآن حکیم ۲: ۲۸۲
- ۴۱ طبقات ابن سعد: موطا بالمشور اہل الذمہ
- ۴۲ قرآن حکیم ۵۱: ۱۹

محسن نسواں

عورت بھی مرد کی طرح انسان، اشرف المخلوقات اور صاحب ارادہ و اختیار ہے۔ اسے بھی خاطر ہستی نے بے پناہ حسی و قلبی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اس کی ذات کی تکمیل اسی صورت میں ممکن ہے کہ اسے ان صلاحیتوں کے بھرپور استعمال کا موقع دیا جائے۔ شرط یہ ہے کہ یہ آزادی صالح ہو۔ لیکن ظہور اسلام سے قبل عورت کے ساتھ نہایت ہی ناروا سلوک کیا جاتا تھا۔ منو عورت کو مرد کے لیے اولاد کی پیدائش کا ذریعہ خیال کرتا تھا۔ وہ خود کو مرد کی خدمت میں فنا کر دے اور اس کی موت کے ساتھ ہی خود بھی سستی ہو جائے۔ قدیم ہندوستانی عورتوں کو محکومیت و غلامی کا درجہ حاصل تھا۔ عورتیں جو دواں میں ہاری جاتی تھیں۔ ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے تھے۔ راجاؤں کی بیویوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی اور وہ باقاعدہ فروخت ہوتی تھیں۔ یہودی عورت کو مرد کی ملکیت خیال کرتے تھے۔ ان کے ہاں بیوہ عورت ایک بھائی کی وفات کے بعد اس کے دوسرے بھائی (یا متونی کے وارثوں) کی ملکیت ہو جاتی تھی۔ وہ جس طرح چاہتا اس کے ساتھ معاملہ کر سکتا تھا۔ چاہتا تو اس سے وہ نکاح پڑھا لیتا، چاہتا تو کسی اور سے نکاح پڑھا دیتا، اور چاہتا تو اس کو یوں ہی رکھتا۔ عورت کے وارثوں کا کچھ حق نہ ہوتا تھا۔ مسیحیت بھی عورت اور مرد کو یکساں خیال نہیں کرتی تھی۔ انسان صرف مرد ہے اور عورت میں انسانی روح کی بجائے کوئی دوسری روح ہے۔ رومی قانون مغربی قانون کا ماخذ خیال کیا جاتا ہے۔ یہ بھی مرد کو عورت کے مقابلے میں نہایت ہی اعلیٰ مقام عطا کرتا ہے۔ یہ محض اسلام ہی ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ عورتوں کے بھی مردوں پر ایسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر، البتہ مردوں کو ایک درجہ فضیلت حاصل ہے۔

ظہور اسلام سے قبل بعض قبائل کے ہاں دختر کشی عام تھی۔ ان معصوم جانوں کے قتل کا نہ تو خون بہا کا کوئی خدشہ تھا اور نہ ان کا کوئی پرسان حال تھا۔ اس ظالمانہ رسم کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ اس کو ختم کرنے کے لیے زبردست مجاہدے اور بے پناہ سوز یقین کی ضرورت تھی۔ تاکہ

خون ریزی کی اس سنگدلانہ رسم کو ختم کرنے کی لیے ان کے دلوں میں شفقت اور محبت کے جذبات پیدا کیے جاسکیں۔ عرب معاشرے میں شادی کی تعداد مقرر نہ تھی۔ آسودہ حال لوگ گھروں میں کثرت سے بیویاں بھر لیتے اور اسے شان امارت کی ایک ادا گردانتے۔ قبول اسلام سے پہلے وہب اسدی اور غیلان بن سلمہ ثقفی کے گھر میں دس دس بیویاں تھیں۔^۱ جنسی تسکین کے چار طریقے ہیں:^۲

(۱) باقاعدہ نکاح

(ب) لوگ اپنی بیویوں کو نامور لوگوں سے ہم بستری کی اجازت دے دیتے (جیسے مزدک کے عقائد کی رو سے ایک شخص کی بیوی ہر شخص کے ساتھ ہم بستر ہو سکتی تھی)^۳

(ج) آٹھ نو آدمی (دس سے کم) ایک عورت سے تعلق قائم کر لیتے۔ اس سے جو اولاد ہوتی اس کا فیصلہ عورت پر چھوڑ دیا جاتا۔ چنانچہ جس کی طرف وہ بچے کو منسوب کر دیتی وہی شخص اس کا باپ سمجھا جاتا۔

(د) باقاعدہ بیسوائیں، جن سے ہر آدمی کو تمتع کرنے کی اجازت تھی۔

بعض مرد بیک وقت دو دو سگی بہنوں سے شادی کر لیتے۔ نیز سوتیلی ماؤں سے باپ کے مرنے کے بعد حقیقی والدہ کے سوا باقی سے بلا روک ٹوک تمتع ہوتے۔ علاوہ ازیں وقتی اور ہنگامی نکاحوں کا عام رواج تھا۔ سفر ہو یا حضر ایسی بیویاں بکثرت مل جاتی تھیں جنہیں اپنی رنگینیوں کو قائم کرنے کے لیے ساتھ لیے پھرتے۔ یہاں یہ چیز قابل ذکر ہے کہ بعض ایسی عورتیں بھی تھیں جن کے بیک وقت کثیر شوہر ہوتے تھے۔ اس کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ ان کا حسن و جمال یا عورتوں کی کمی، جنگوں میں مفتوح خواتین کی عصمت دری کے بعد ان کے پیٹ چاک کر دیئے جاتے یا بچوں اور عورتوں کو فروخت کر دیتے۔ فجبہ گری عام تھی۔ لوگ اپنی لونڈیوں پر بھاری رقم عائد کر دیتے تھے۔ جو وہ بدکاری کرا کر ادا کرتیں۔ بعض لوگوں نے باقاعدہ چکلے کھول رکھے تھے۔ جنہیں مواخیر کہتے تھے اور ان عورتوں کو قلیقات کہتے تھے۔ عبداللہ بن ابی کے چکلے میں جو لونڈیاں تھیں ان میں سے ایک معازہ بھی تھی جس نے اسلام قبول کر لیا۔ فجبہ گری کا قلع قمع کرنے کے لیے اللہ نے فرمایا:^۴

وَلَا تَكْرِهُوا فَتِيحِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوا عَرَضَ

الْحَيَوَةُ الدُّنْيَا ۖ وَمَنْ يُكْرِهْنَهُنَّ فَإِنَّ اللَّهَ مِنْ بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُورٌ
رَحِيمٌ ۝

”اور اپنی لونڈیوں کو اپنے دنیوی فائدوں کی خاطر قبحہ گری پر مجبور نہ کرو جب کہ وہ خود پاکدامن رہنا چاہتی ہوں اور جو کوئی ان کو مجبور کرے تو اس جبر کے بعد اللہ ان کے لیے غفور و رحیم ہے۔“

اس حکم کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الامساعة في الاسلام.

”اسلام میں قبحہ گری کی کوئی گنجائش نہیں۔“

اسی طرح مہر البغی یعنی زنا کی آمدنی کو خبیث اور شرالمکاسب قرار دیا۔ نیز فرمایا کہ لونڈی سے صرف ہاتھ پاؤں کی خدمت لینا جائز ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن عورتوں کے ساتھ متع کرنے اور گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔^۵

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ میں پہلی مرتبہ عورت کو وہ مقام دیا جو اس سے پہلے اسے حاصل نہ تھا۔ اس کو مناکحت بالرضا، عقد ثانی، طلاق و خلع اور ترکہ جیسے حقوق سے نوازا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیوہ کا نکاح نہ کیا جائے جب تک اس سے صاف صاف زبان سے اجازت نہ لے لی جائے۔ اور کنواری لڑکی کا نکاح نہ کیا جائے جب تک اس کی مرضی دریافت نہ کر لی جائے۔ ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت^۶ کے مطابق اگر کنواری عورت انکار کر دے تو اس پر جبر جائز نہیں۔ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ”یا رسول اللہ! وہ اذن کیونکر دے؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کا اذن یہی ہے کہ وہ سن کر چپ ہو جائے۔“^۷ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شعاع (کسی شخص کا اپنی بیٹی کا نکاح دوسرے شخص سے اس شرط پر کرنا کہ وہ بھی بدلے میں اپنی بیٹی کا نکاح بغیر مہر کے اس سے کر دے) سے منع فرمایا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس میں لڑکیوں کی رضامندی شامل نہیں ہوگی اور لڑکیوں کی رضامندی کا حق متاثر ہوتا ہے۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیٹی کا نکاح اس کی رضامندی حاصل کیے بغیر کسی سے کر دیا۔ لڑکی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس استغاثہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلا کر نکاح فسخ کرانا چاہا۔

لڑکی نے عرض کیا: ”یا رسول الہ! میں اب اس نکاح کو قبول کر لیتی ہوں۔ میرا مقصد یہ تھا کہ ہماری بہنوں کے ذاتی حقوق کی توضیح کی جائے۔“^۷

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو غیر موزوں شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے خلع کا حق عطا فرمایا۔ خنساء بنت خذام کا نکاح ان کے والد نے کر دیا۔ وہ شیبہ تھیں نکاح کر چکی تھیں اور اس دوسرے نکاح سے ناراض تھیں۔ آخر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح جو والد نے کر دیا تھا، فسخ کر ڈالا۔^۸ اسلام نے ایک بیوہ عورت کا سوگ (عدت) چار ماہ دس روز مقرر کیا تاکہ اس کو اپنا غم فراموش کرنے کا موقع بھی مل سکے اور یہ بھی معلوم ہو سکے کہ وہ حمل سے تو نہیں۔ اگر مرحوم خاوند نے اسے حق مہر ادا نہیں کیا تھا تو اس کے ترکہ میں سے اس کی ادائیگی سب سے اول ضروری قرار دی ہے۔ اگر شوہر کی اولاد ہو تو عورت کو آٹھواں حصہ اور نہ ہو تو چوتھا حصہ دینے کا حکم ہے۔ اگر وہ دوسری شادی کرنا چاہتی ہے تو اسے مکمل اختیار حاصل ہے۔ اس طرح اسلام نے اسے اپنے لیے مہر و عنایت کا سایہ دوبارہ حاصل کرنے کی مکمل آزادی عطا کی ہے۔ ارشادِ باری ہے:^۹

وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ.^ط

”تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح

ہوں، ان کے نکاح کر دو۔“

صنف نازک پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنا احسان کیا اس کا اندازہ اور کس بات سے ہو سکتا ہے کہ اپنی حیات کے آخری خطبہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر عورتوں کے حقوق کے بارے میں احکام اور وصیت فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ میں پہلی مرتبہ عورت کو وہ مقام دیا جو اس سے پہلے اسے حاصل نہ تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انسانی تمدن میں عورت کی اہمیت اور افادیت سے بخوبی آگاہ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو قدر و منزلت سے نکالا اور اور اس کی پیدائش کو موجب رحمت بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹی کی پرورش، اس کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کا وسیلہ قرار دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:^{۱۰}

”جب کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہاں فرشتے بھیجتا

ہے۔ جو کہتے ہیں: اے اہل خانہ! تم پر سلامتی ہو۔ وہ لڑکی کو اپنے پروں کے سائے میں لے لیتے ہیں اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے ہیں: یہ ایک ناتواں جان سے پیدا ہوئی ہے۔ جو اس بچی کی پرورش کرے گا قیامت تک اللہ کی مدد اس کے شامل حال رہے گی۔“

ایک اور موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ^{۱۲}

فاتقوا اللہ فی النساء.

”عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو۔“

خاندان معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر خاندان کی تاسیس کے لیے نکاح کا طریقہ مقرر فرمایا۔ اس بندھن کے لیے عورت کی رضا مندی کا حصول لازمی قرار دیا گیا ہے بلکہ وہ خود بھی شاری کا پیغام دے سکتی ہے۔ یہ معاہدہ مرد و زن کی باہمی محبت اور دائمی رفاقت کا اقرار نامہ ہے۔ تاکہ عائلی و قومی زندگی کی تعمیر ہو سکے۔ اس طرح صالح تمدن و معاشرت کے استحکام کا اہتمام ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس رشتے کی لطافتوں اور نزاکتوں کو اس طرح بیان کیا ہے: ^{۱۳}

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ. ^ط

”وہ (عورتیں) تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے۔“

اسلام یہ یقین رکھتا ہے کہ عورتوں کے مردوں پر وہی حقوق ہیں جو ان پر مردوں کے ہیں۔ البتہ مردوں کی عورتوں پر فوقیت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا: ^{۱۴} اے لوگو! تمہارے لیے تمہاری بیویوں پر حق ہے اور ان کو تم پر وہی حق ہے جو تمہیں ان پر۔“

دو جو رزن سے ہے کائنات میں رنگ کے مصداق قرآن حکیم نے عورت کو مزرع یا کھیتی سے تشبیہ دی ہے۔ ^{۱۵} (نِسَاءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ. یعنی تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں)۔ شادی بقائے نسل انسانی کا ذریعہ ہے نہ کہ یہ محض جنسی تلبذذ کی خاطر کی جاتی ہے۔ اسی لیے اسلام کے نزدیک کنیرداری اور بردہ فروشی کی طرح نکاح باطل (جو مندرجہ بالا نیت سے نہ کیا جائے) قانوناً ممنوع اور قابل تعزیر ہوتا ہے۔ اسلام نے نکاح کو مہر سے مشروط کیا ہے۔ اس طرح مرد پر

اپنی منکوحہ کے لیے ایثار با کمال کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے: ^{۱۶}

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَتَبْتُوْا ط وَّلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَتَبْنَ ۝

”جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں

نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ۔“

اس حکم کے تحت عورتوں کو آزاد ہونا قرار پایا ورنہ اس سے قبل تو وہ خود ایک موروثی شے تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے معاشی حقوق کا تعین فرمایا کیونکہ معاشی استقامت ہی کسی بھی تمدن میں کسی کی منزلت کا باعث بنتی ہے۔ ان حقوق میں وراثت اور حق مہر کی وصولی شامل ہے۔ بیوی چاہے کتنی ہی مالدار کیوں نہ ہو اس کا نفقہ بہر حال شوہر پر ہی فرض ہے۔ یاد رہے کہ برصغیر پاک و ہند میں جہیز استحصال بالرواج کی ایک بھیانک شکل ہے۔ جس نے عورت کو نا انصافی اور حق تلفی کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ اس طرح اس کی جمالیاتی حیثیت اور معاشرتی مرتبت کم ہو کر رہ گئی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور اس کی بڑی نعمت قرار دیا ہے۔ وہ قابل احترام ماں ہے اس کے پاؤں کے نیچے جنت قرار دی گئی ہے۔ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی ماں) کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں تشریف لائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا بے حد احترام فرماتے اور ان کے بیٹھنے کے لیے اپنی چادر بچھا کر دیتے اور رخصتی کے وقت ان کو تحائف بھی پیش فرماتے:

عورت وفادار بیوی ہے جس کی عصمت و عفت کا رکھوالا خاوند کو قرار دیا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ^{۱۷} ”کسی مسلمان عورت کے لیے حلال نہیں ہے کہ اکیلے رات کا سفر کرے تا وقتیکہ اس کے ساتھ ایک محرم نہ ہو۔“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر کے کام کاج میں ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ہاتھ بٹاتے۔ عورت ایک شفیق بہن ہے جس کے احترام کی ایک واضح مثال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بنو ہوازن کی شکست کے بعد رضاعی ہم شیرہ شیماء کے بے حد احترام کی شکل میں موجود ہے۔ عورت عزیز بیٹی بھی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی بنات مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے انس مثال ہے۔ عام معاشرہ میں جذباتی طور پر بھی والدین کا جھکاؤ بیٹوں کی طرف زیادہ ہوتا ہے اور جائیداد کے بھی تقریباً وہی وارث ہوتے

ہیں۔ لیکن ارشادِ ربانی اس کے برعکس ہے۔^{۱۸}

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثِيَيْنِ.

”تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو

عورتوں کے برابر ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جگہ جگہ بیٹیوں کو بیٹوں پر ترجیح دینے کی تلقین فرمائی۔ چنانچہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ”جو شخص بازار سے کوئی نئی عمدہ چیز خرید کر اپنے بچوں کے لیے لائے تو اسے چاہیے بیٹوں سے پہلے بیٹیوں سے شروع کرے۔“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ اگر عورت کو معاشرے میں صحیح مقام ملے تو انسانی تہذیب و تمدن اعتدال کی راہ پر گامزن ہو سکے گا۔ قرآن حکیم کی نظر میں مرد اور عورت میں کوئی تفریق بلحاظ فضائل و خصائل نہیں ہے۔ دونوں میں فضیلت رکھنے والے موجود ہوتے ہیں اور اللہ کا خوف رکھنے والے بھی۔ مردوں کے لیے قرآن حکیم فرماتا ہے:^{۱۹}

التَّائِبُونَ الْعَبَدُونَ الْحَمِيدُونَ
السَّائِحُونَ الرَّكَعُونَ السَّجِدُونَ
الْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ
اللَّهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝

”اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے، اس کی بندگی بجالانے والے، اس کی تعریف کے گن گانے والے، اس کی خاطر زمین گردش کرنے والے، اس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے (اس شان کے ہوتے ہیں وہ مومن جو اللہ سے خرید و فروخت کا یہ معاملہ طے کرتے ہیں) اور اے نبی ان مومنوں کو خوشخبری دے دو۔“

عورتوں کے لیے فرمایا:^{۲۰}

عَسَى رَبَّةٌ إِنْ طَلَّقَكُنْ أَنْ يُبَدِّلَهُ أَزْوَاجًا خَيْرًا مِنْكَ مِمَّنْ مُسَلِمَاتٍ مُّؤْمِنَاتٍ
قَاتِبَاتٍ تَلْبِسْنَ عِلْبَاتٍ مَّتَّسِحَاتٍ تَتَذَكَّرْنَ ۗ وَأَبْكَارًا ۝

”بعید نہیں کہ اگر نبی تم سب بیویوں کو طلاق دے دے تو اللہ اسے ایسی بیویاں

تمہارے بدلے میں عطا فرمادے جو تم سے بہترین ہوں مسلمان، باایمان، اطاعت گزار، توبہ گزار، عبادت گزار اور روزہ دار، خواہ شوہر دیدہ ہوں یا باکرہ۔“

منافقوں کا ذکر کیا تو دو جنسوں کا کیا: ^{۲۱}

الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ
عَنِ الْمَعْرُوفِ أَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ ^ط إِنَّ الْمُنْفِقِينَ هُمُ
الْفٰسِقُونَ ۝

”منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں۔ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ خیر سے روکے رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا۔ یقیناً یہ منافق ہی فاسق ہیں۔“

پھر فرمایا: ^{۲۲}

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَنِينَ
وَالْقَنَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَشِيعِينَ
وَالْخَشِيعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ
وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ
أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ۝

”بالیقین جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں، مومن ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہر وقت اسلامی تعلیمات حاصل کرنے والے مردوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اس طرح عورتوں کو وعظ وپند سننے اور مسائل دریافت کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

کچھ خواتین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر ایک خاص دن اپنے لیے مقرر کر لینے کی درخواست کی جسے آپ نے شرف قبولیت بخشی۔^{۲۳} خواتین آتیں اور نہایت دلیری کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے محابا مسائل دریافت کرتی تھیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو ان کی اس جرأت پر حیرت ہوتی تھی لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر کوئی شکن تک نمودار نہیں ہوتی تھی۔^{۲۴}

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کی جسمانی ساخت اور فطری صلاحیتوں کے مطابق اس کا دائرہ کار متعین فرمایا۔ ایک بار ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہم سفر تھیں۔ انجشہ نام ایک حبشی غلام حدی خواں تھے یعنی اونٹ کے آگے حدی پڑھتے جاتے تھے۔ اس طرح اونٹ دوڑنے لگے۔ معا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواتین کا خیال آیا تو فرمایا: ”ذرا دیکھ کر! یہ آگینے (خواتین) بھی ساتھ ہیں، ٹوٹنے نہ پائیں“۔^{۲۵} حقیقت یہ ہے کہ آپ نے زندگی بھر ان آگینوں کی نزاکت کا پورا پورا خیال رکھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ ماں کی گود بچے کا اولین مکتب ہوتا ہے اس لیے عورت کو بھی مرد کی طرح ہی علم کے حصول کا حق حاصل ہے۔ حتیٰ کہ باندیوں کے متعلق بھی حکم دیا۔^{۲۶} ”جس شخص کے پاس کوئی لونڈی ہو وہ اس کو خوب تعلیم دے اور عمدہ تہذیب و شائستگی سکھائے۔ پھر اس کو آزاد کر کے اس سے شادی کرے، اس کے لیے دو ہرا اجر ہوگا۔“ اس طرح عورت علم کے زیور سے آراستہ ہو کر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے روحانیت اور اخلاقیات کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج حاصل کر سکتی ہے۔ جب کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن حکیم کی کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے اسے مردوں کی جماعت میں تلاوت فرماتے پھر اس کے بعد اس عبارت کو عورتوں کی مخصوص محفل میں بھی سناتے۔^{۲۷}

آپ نے بیوی اور شوہر کے حقوق میں..... (دیکھیے پشت صفحہ ۸۵)

عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا سیاست میں آنا اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام نے خواتین کے حقوق کا دائرہ جنگ نہیں کیا ہے۔ ایک دفعہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں شرکت کی اجازت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کا جہاد حج ہے۔^{۲۸}

پردے کے حکم سے پیشتر عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضائی خالہ) غزوہ احد میں زخمیوں کو پانی پلاتی رہی ہیں۔^{۲۹} اسی طرح غزوہ احزاب میں وہ زنانہ قلعہ سے نکل کر لڑائی کی حالت دیکھتی تھیں۔^{۳۰} اسی طرح ام سلیطہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ربیع بنت معوذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی غزوات میں حصہ لیتی رہی ہیں۔ وہ مجاہدین کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں، مردوں اور زخمیوں کو مدینہ تک لے کر جاتیں۔^{۳۱}

یہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ہی اثر تھا کہ معاشرے میں عورت کو تحفظ اور توقیر ملی۔ ایسا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی ہوا کہ صنعا سے مدینہ منورہ تک ایک عورت اکیلے سفر کرنے لگی اور کسی کو اس کی طرف نظر بد سے دیکھنے کی جسارت نہیں ہوتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کثیر شوہری نظام کی قطعاً ممانعت فرمائی۔ ۷ھ میں غزوہ خیبر کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقتی تمتع کو بھی ناجائز اور حرام قرار دیا۔ سوتیلی اور رضاعی ماؤں کا احترام بحال کیا۔ بیک وقت دو سگی بہنوں سے شادی کی ممانعت فرمائی۔ بیوی کو طلاق دینے اور پھر غصہ سرد ہو جانے کے بعد دوبارہ نکاح کر لینے کا عام رواج تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تماشہ پر اس طرح پابندی لگائی کہ حلالہ کی راہ تجویز فرمائی تاکہ مرد اس معاملے میں محتاط ہوں۔ زوجین میں ناچاقی کی صورت میں اگرچہ طلاق جائز ہے تاہم یہ اللہ کے ہاں سخت ناپسندیدہ چیز ہے۔^{۳۲} اگر کسی عورت کے ساتھ نباہ نہ ہو سکے تو خوبی کے ساتھ اس کو الگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے:^{۳۳}

الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ ۖ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ ۗ ط

”طلاق دوبارہ ہے۔ پھر یا تو سیدھی عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے

اس کو رخصت کر دیا جائے۔“

اگر کسی منکوحہ کے ساتھ خلوت کے بغیر طلاق کو نوبت آگئی ہو تو شوہر پر نصف مہر ادا کرنا

واجب ہے۔ طلاق رجعی کے بارے میں ہدایت کی گئی: **وَأَشْهِدُوا ذَوَىٰ عَدْلٍ مِّنكُمْ**^{۳۴}

”اور ایسے آدمیوں کو گواہ بنا لو جو تم میں سے صاحب عدل ہوں۔“ گواہی کی ہدایت دی گئی:^{۳۵}

وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ^ط ”اور (اے گواہ بننے والو) گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے لیے ادا کرو۔“

قذف یعنی پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے کی سزا ۵۰ھ میں نازل ہوئی (واقعہ انک

اسی سال رونما ہوا تھا اور یہ اسی تعلق سے نازل ہوئی تھی۔ ارشادِ بانی ملاحظہ ہو: ^{۳۶}

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ
ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا. ^ج

”اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو اسی
کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو۔“

عربوں کے ہاں دختر کشی عام تھی۔ کسی کے ہاں لڑکی کی پیدائش کی قرآن حکیم نے اس
طرح تصویر کشی کی ہے: ^{۳۷}

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝ بَتَّوَارِي
مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَبِهِ ^ط أَيَمْسِكُ عَلَيْ هُونِ أَمْ يَدُسُّهُ فِي
التُّرَابِ. ^ط

”جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس
کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے،
لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا
ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے۔“

اسلام نے مرد کو چار بیویوں کی اجازت دے کر اسے بہ احساس دلایا کہ بچیاں قتل ہوتی
رہیں تو بیویاں کہاں سے آئیں گی۔ قرآن حکیم میں ارشادِ بانی ہے: ^{۳۸}

فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبْعًا. ^ج

”جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر
لو۔“

لیکن ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا: ^{۳۹}

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً.

”لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی
کرو۔“

پھر یہ بھی فرمایا: ^{۴۰}

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىَٰ أَنْ تَعْدِلُوا. ۳

”لہذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔“

اور پھر ذَوٰی عَدْلِ مِنْكُمْ کہہ کر معتبر اور ثقہ افراد یعنی صاحبان عدل کی طرف اشارہ کیا

۳۱۔

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو بیویوں کا وہ شوہر جو ایک کا حق ادا کرتا اور دوسری سے غفلت برتتا تھا، قیامت میں اس طرح آئے گا کہ اس کا ایک پہلو گویا یا مفلوج ہو کر جھک گیا ہو۔ ۳۲

یہاں یہ نکتہ ملحوظ خاطر رہے کہ کثرت ازدواج کی اجازت میں ان عورتوں کی کفالت بھی مقصود تھی جن کے شوہر جنگوں میں مارے جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ جنسی بے زاہ روی کو نابود کرنے کا بھی ایک تیر بہدف علاج ہے۔ صرف اسے عدل کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے۔ اس ذیل میں مشہور مستشرق پروفیسر منگمری واٹ رقمطراز ہے: ۳۳

”کثرت ازدواج سے بعض ایسی اخلاقی خرابیاں جو رجحان انفرادیت کی پیداوار تھیں، ختم ہو گئیں اور زائد عورتوں کی کھپت کا قابل احترام بندوبست ہو گیا اور بے وسیلہ عورتیں وارثوں کے ناجائز دباؤ سے بچ گئیں۔ علاوہ ازیں وقتی شادی (متعہ) کا جس کا عرب میں عام رواج تھا، انسداد ہو گیا۔ عرب میں جو اخلاقی خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں ان کے پیش نظر یہ قابل تعریف اقدام تھا۔“

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی شادیاں بھی کیں ان کی کوئی نہ کوئی خاص وجہ تھی۔ پروفیسر موصوف اس ضمن میں رقمطراز ہے: ۳۴

”محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام شادیوں کی حیثیت سیاسی تھی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے شادی کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فکر معاش سے آزاد ہو گئے۔ نیز چونکہ ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مکے میں اثر و رسوخ تھا اس لیے اس رشتے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکے کے معزز اور ذی اثر لوگوں میں شامل ہو گئے۔ دوسرے نمبر پر حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آئیں۔ وہ ایک مخلص صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوہ تھیں اور ان کا بھائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت مخالف تھا (اس تعلق سے دونوں مقاصد کی تکمیل ہو گئی)۔ تیسری بیوی کا نام زینب بنت

خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھا جن کا شوہر خاندان عبدالمطلب سے تھا۔ اس لحاظ سے ان کی خبر گیری آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر لازم تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادیاں تھیں، جن پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا بھروسہ تھا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مخزومی تھیں جو قریش کا بااثر خاندان تھا۔ حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنو مصطلق سے تھیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت مخالف تھے۔

حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت جحش رشتے کی بہن تھیں جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مرضی کے خلاف حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیاہا تھا۔ جب نباہ نہ ہو سکا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ناکام شادی کی تلافی کرنا چاہی۔ نیز عربوں کے اس فاسد خیال کی عملی تردید منظور تھی کہ متبہنی اور حقیقی بیٹے میں کوئی فرق نہیں۔ ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی تھیں۔ حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خواہر نسبتی تھیں۔ اس شادی سے وہ رشتہ استوار ہو گیا۔ اس طرح حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت ریحانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آنے سے یہود کی وحشت کو کم کرنا منظور نظر تھا۔“

پروفیسر مننگمری واٹ مزید لکھتا ہے: ^{۲۵}

”شادی اور خاندانی تعلقات کو سنوارنے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحات پر دور رس نتائج مرتب ہوئے۔ بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہی عرب میں قبائلی نظام کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن عرب معاشرے پر اس کے اثرات غیر مفید نوعیت کے تھے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سوسائٹی کا جو عائلی ڈھانچہ تیار کیا وہ کئی لحاظ سے جاذب نظر اور مفید ثابت ہوا۔ چنانچہ اس طریق کار کی کامیابی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت اور پیش بینی کی ممنون ہے۔“

مغربی دنیا حقوق نسواں پر بہت زیادہ اتراتی ہے لیکن حقیقت میں عورت کی اپنی پہچان ہی نہیں ہے۔ وہ یا تو مس لڑ ہے یا مسز تھا مہسن۔ اس کے علی الرغم اسلام میں عورت خواہ وہ بیٹی ہو یا بیوی، ہمیشہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حیثیت سے اپنی الگ پہچان رکھتی ہے۔

حوالہ جات

- ۱- تفسیر ابن کثیر، جلد چہارم، ص ۴۷۸، ابوداؤد کتاب النکاح
- ۲- بخاری، کتاب النکاح، روایت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا
- ۳- انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، طبع یازدہم، ج ۲۱، ص ۲۲۳
- ۴- قرآن حکیم ۲۲: ۳۳
- ۵- بخاری، کتاب المغازی
- ۶- ابوداؤد، ترمذی، نسائی، دارمی
- ۷- بخاری کتاب النکاح
- ۸- سنن نسائی، باب البکر یزدجہا ابوبہادی کارہتہ و سنن دارقطنی، کتاب النکاح و مسند احمد
- ۹- بخاری، کتاب النکاح
- ۱۰- قرآن حکیم ۲۲: ۳۲
- ۱۱- طبرانی
- ۱۲- ابوداؤد، مسلم
- ۱۳- قرآن حکیم ۲: ۱۸۷
- ۱۴- طبری ابن ہشام وغیرہ
- ۱۵- قرآن حکیم ۲: ۲۲۳
- ۱۶- قرآن حکیم ۴: ۳۲
- ۱۷- ابوداؤد
- ۱۸- قرآن حکیم ۴: ۱۱
- ۱۹- قرآن حکیم ۹: ۱۱
- ۲۰- قرآن حکیم ۶۶: ۵
- ۲۱- قرآن حکیم ۹: ۶۷
- ۲۲- قرآن حکیم ۳۳: ۳۵
- ۲۳- بخاری کتاب العلم
- ۲۴- سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج دوم، ص ۲۳۰، شبلی نعمانی
- ۲۵- ایضاً

- ۲۶ بخاری
- ۲۷ خطبات، بہاول پور، ص ۱۱، ڈاکٹر محمد حمید اللہ
- ۲۸ بخاری کتاب الجہاد والسير، باب حج النساء
- ۲۹ بخاری کتاب الجہاد والسير باب غزوة احد
- ۳۰ مسند ابن جنبل، ج ۶، ص ۱۳۱
- ۳۱ بخاری کتاب الجہاد والسير کتاب المغازی
- ۳۲ ابوداؤد، کتاب الطلاق
- ۳۳ قرآن حکیم ۲: ۲۲۹
- ۳۴ قرآن حکیم ۲: ۶۵
- ۳۵ قرآن حکیم ۲: ۶۵
- ۳۶ قرآن حکیم ۴: ۲۴
- ۳۷ قرآن حکیم ۱۶: ۵۸-۵۹
- ۳۸ قرآن حکیم ۳: ۴
- ۳۹ قرآن حکیم ۳: ۴
- ۴۰ قرآن حکیم ۴: ۱۵۳
- ۴۱ قرآن حکیم ۲: ۶۵
- ۴۲ ترمذی
- ۴۳ Muhammad at Madina, P.277
- ۴۴ Ibid, PP.287-288
- ۴۵ Ibid, P.289

عصر حاضر کے مسائل اور تعلیمات نبویؐ

اسلام ہی وہ دین ہے جس نے تمام وقتوں کے تمام مسائل پر بحث کی ہے اور اس نے وہ قوانین اور ضوابط متعارف کرائے ہیں جو انسانی زندگی اور اس کے معاشرے اور دنیا کے ساتھ باہمی تعلقات کو منظم کر سکتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن اصولوں کی دعوت دی وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر گوشے پر محیط تھے۔ یہ پیغام اس وقت آیا جب نسل انسانی فکری اعتبار سے پختہ ہو چکی تھی۔ تمام مکاتب فلسفہ اور تمام مذاہب ظہور پذیر ہو چکے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ مادی علوم نے بھی خاطر خواہ ترقی کر لی تھی۔ گویا انسان کا اجتماعی شعور بھی خط پختگی کو پہنچ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کی تو کسی قسم کی مصلحتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سدراہ نہ بنیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصولوں کی خاطر کبھی سودے بازی نہ کی بلکہ ہر طرح کے خطرات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ۲۳ برس میں ایک مکمل ترین نظام حیات کھڑا کر دیا اور ایک وسیع و عریض خطے پر دین حق کو اپنے معاشرتی، معاشی اور سیاسی ڈھانچے سمیت بالفعل قائم و نافذ کر دیا۔ یہ اس کی بدولت ہی ممکن ہوا کہ یہ قوم شتربانی کے مقام سے نہ صرف جہاں بانی کے مقام پر فائز ہو گئی بلکہ اس نے بلا استثناء دنیا کی ساری ہی اقوام کو سیاست اور جہاں بانی کا درس بھی دیا۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کو صرف ایک اللہ کے آگے سر بسجود ہونے کی تعلیم دے کر اسے آزاد و محررِ کامل بنا دیا۔ اس سیاسی نظام کی اساس انفرادی و اجتماعی ایمان داری اور سچائی تھی۔ اس میں دنیوی کروفر کی بجائے خلافت الہی کا جلال اور ظاہری شان و شوکت کی جگہ خدمت اور محبت کا جمال تھا لیکن اس سادگی اور فقر کے باوجود اس کے دبدبے کا یہ عالم تھا کہ قیصر و کسریٰ اس کے تصور پر ہی لرزہ بر اندام ہو جاتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قسم کے سیاسی اور معاشی معاہدے کیے لیکن کبھی کوئی جھوٹا معاہدہ نہیں کیا اور نہ ہی کسی معاہدے کی کبھی خلاف ورزی کی۔ حلیفوں کا نازک سے نازک حالات میں بھی ساتھ دیا اور دشمنوں کے ساتھ ان

کے نہایت ہی نامساعد حالات میں بھی انصاف کیا۔ سیاسی جبر کا خاتمہ کیا۔ اس انقلاب کا محور قرآن حکیم تھا جو ”چوں بجاں در رفت“ کے مصداق صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے رگ و ریشے میں اس طرح سرایت کر گیا کہ ان کی زندگیوں کا رخ ہی تبدیل ہو کر رہ گیا۔ یہ تغیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم کو راہِ دلیل بنانے کے باعث ہی ممکن ہوا۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا^۱ یعنی ”میں تو صرف معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“ آج بھی اگر دنیا فوز و فلاح اور اپنے مسائل کے حل کی خواہاں ہے تو اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کرنا پڑے گا۔ دنیا کو پر آشوب حالات کا سامنا ہے، ان سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انقلاب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی نصب العین بنایا جائے۔

اس انقلاب کے لیے سب سے پہلے اپنی فکر کی تصحیح شرط لازم ہے اور یہ فطری ثمرہ ہے تلاوت قرآن حکیم کا۔ اس سے فاسد خیالات اور غلط نظریات کی بیخ کنی ہوگی۔ جب قلوب و اذہان نور ایمانی سے منور ہو جائیں گے تو مجموعی طور پر معاشرہ یا قوم بلکہ پوری دنیا کے اجتماعی فکر کی تطہیر اور اس کی سوچ کے دھارے کا رخ تبدیل ہو جائے گا۔ قرآنی اخلاق اور قرآن مثالی سیرت کا مظہر اتم آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات تھی۔ کسی بھی نوع کی آیت لے لیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی نہ کسی پیغمبرانہ سیرت اور کسی نہ کسی مقام نبوت کی تعبیر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ اس کی تفسیر۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ارشاد گرامی ہی تو تھا کہ كَانَ خَلْقُهُ الْقُرْآنَ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت قرآن ہی تو تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی رحمت قرار دیا اور قرآن حکیم کو بھی رحمت بنایا:^۲

وَنَزَّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ.

”ہم اس قرآن کے سلسلہ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے تو شفا اور رحمت ہے۔“

اس کو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح بیان کیا۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب

گنبد آگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

اور اس آیت الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ

لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا. ط

”آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔“

کے نزول کے ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت بھی مکمل ہو گئی۔ اب قیامت تک قرآن حکیم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ بنی نوع انسان کی ہدایت و رشد کے لیے کافی ہے۔ یہ ایک ایسا نور ہے جس کی قندیلیں گل نہیں ہوتیں۔ یہ ایک ایسی منزل ہے کہ اس کی راہ میں کوئی راہرو بھٹکتا نہیں۔ نہ ہی یہ کسی ایک علاقے یا ذہاں آباد لوگوں کے لیے نازل ہوا بلکہ یہ کل کائنات کے لیے ہے لہذا قرآن حکیم بھی رحمت تمام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی رحمت تمام، انسانیت کا اعلیٰ اور حقیقی درجہ اسی دین کی پیروی سے ہی میسر آ سکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی ہمہ گیری، وحدت انسانی، احترام آدمیت اور دین کے معاملات میں ایسی ذاتی اور عملی مثالیں پیش کیں جن سے نوع انسانی کے فکر و تصور کے دھارے بدل گئے اور اس کے نتیجے میں ایک نئی امت اور ایک نیا معاشرہ معرض وجود میں آیا۔

یہ تقاضائے جبلت ہے کہ انسان تنہا نہیں رہ سکتا۔ وہ انسانیت کی معراج کو معاشرتی زندگی کے بغیر پہنچ ہی نہیں سکتا۔ معاشرہ افراد کی ترقی اور نشوونما کا ضامن ہے۔ چونکہ افراد سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اس لیے فرد کا معاشرے پر اثر ہوتا ہے اور معاشرے کا فرد پر۔ بہترین معاشرتی زندگی وہ ہوتی ہے جس میں سب افراد ایک دوسرے کے لیے معین و مددگار ہوں۔ ارشاد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

خَيْر النَّاسِ انْفَهَمَ لِلنَّاسِ.

”لوگوں میں بہتر وہ فرد ہے جو لوگوں کے حق میں سب سے زیادہ نفع رساں ہے۔“

اور یہ نفع رسائی یقیناً خاندان سے شروع ہوتی ہے جو معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اور بچے کا اولین مدرسہ ہے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رَضَا الرَّبُّ فِي رَضَا الْوَالِدَيْنِ وَسَخَطَهُ فِي سَخَطِهِمَا.

”خدا کی خوشنودی والدین کی خوشنودی میں اور خدا کی خوشنودی والدین کی خوشنودی میں مضمحل ہے۔“

انسان مدنی الطبع ہے اور وہ معاشرے سے الگ تھلگ ہو کر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں مختلف مقاصد کے تحت معرض وجود میں آنے والے اداروں میں سے کئی ایک کے ساتھ وہ وابستہ ہوتا ہے۔ تعصب، اقتصادی مسائل اور احساس برتری وہ اسباب ہیں جو صحیح تناسب اطاعت قائم نہیں ہونے دیتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَا يَأْمَنُ جَاوِبًا وَيَقِيهِ يَعْنِي ”وہ شخص جس کی شرارتوں سے اس کا ہمسایہ مامون نہیں وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے: مَا زَالَ جِبْرِئِيلُ يُوَصِّنِي بِالْجَارِ حَتَّى ظَنَنْتُ وَأَنَّهُ سَيُورَثُهُ. یعنی ”جبرئیل مجھ کو پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی برابر تاکید کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے خیال کیا کہ پڑوسی کو پڑوسی کا وارث بنا دیں گے۔“ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: أَخْبِرَ بِيَوْمِكُمْ بَيْتٌ فِيهِ يَتِيمٌ مَكْرُومٌ يَعْنِي ”تم میں سب سے بہتر گھر وہ ہے جس میں یتیم معزز طریقے سے رہتا ہے۔“

ماہرین عمرانیات کی رائے ہے کہ خاندان اور ہمسائے کے حقوق کا یوں پاس ملحوظ خاطر ہو تو دنیا صحیح معنوں میں جنت بن جاتی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مَنْ لَا يَرْحَمِ فِي الْأَرْضِ لَا يَرْحَمُهُ مِنَ السَّمَاءِ ”جو زمین والوں پر رحم نہیں کرے گا، آسمانوں والا اس پر رحم نہیں کرے گا۔“ بزبان شاعر

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر

خدا مہربان ہو گا عرش بریں پر

گویا اسلامی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ اتباع احکام الہی اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں صحیح معنوں میں انسان بننے کی انتھک کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ اگر ہم ہر ہر موقع پر اخلاقی برتاؤ کو ملحوظ خاطر رکھیں تو ہم خود کو تمام گناہوں اور جرائم سے بچا سکتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا عملی اور عملی نمونہ ہمارے سامنے ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم اپنے اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے: ۱۷۰

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.

”درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ تھا۔“

اس کا مطلب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ اور شمائل ایک حیثیت سے عملی قرآن ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حقوق العباد کا احترام کیا جائے اور امور خیر میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ اس طرح شرکی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ فرمان الہی ہے۔^{۱۱}

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ
وَاتَّقُوا اللَّهَ ۗ

”جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو۔“

اگر اقوام عالم اس اصول پر عمل کریں تو دنیا میں فساد کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔ مشاہدہ یہ ہے کہ حق کی بجائے دوسرے مصالح کی بنا پر قومیں باطل کی طرف داری شروع کر دیتی ہیں۔ جن کی وجہ سے باطل قوتیں مضبوط ہو جاتی ہیں اور دنیا میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حکومتیں اپنے سیاسی مفادات کے پیش نظر شہادت حق کو چھپاتی ہیں اور عدل و انصاف کی پاسداری نہیں کرتیں۔

پیغمبر انسانیت نے مسلمانوں میں اخوت و مساوات کی روح پھونک کر ان کے باہمی اتفاق کو ایک ابدی صورت عطا کی۔ قرآن حکیم میں ارشادات ربانی ہیں:

۱۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ ۗ^{۱۲}

”مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔“

۲۔ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ ۚ إِنَّكَ أَعْيُنًا نَّظُرُ ۚ وَفِى صَدْرِكَ حِزْبٌ ۚ فَاذْكُرْ ۗ^{۱۳}

”اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔“

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ^{۱۴} المسلم من مسلم المسلمون من لسانہ

ویدہ یعنی ”مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے (دوسرے) مسلمان محفوظ رہیں۔“

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کے بعد قتل کو بڑا گناہ قرار دیا۔^{۱۵}

ایک شخص کی عائلی زندگی اس کے سیرۃ و کردار کی حقیقی عکاس ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی گھریلو اور باہر کی زندگی میں تفاوت ہو۔ اگر دونوں میں مطابقت ہے تو وہ یقیناً ایک عظیم انسان ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کسوٹی پر پوری اترتے ہیں۔ بڑے سے بڑا انسان جو ایک ہی بیوی کا شوہر ہو وہ بھی یہ ہمت نہیں کر سکتا کہ اس کو اذن عام دے دے کہ وہ اس کی ہر بات، ہر واقعہ، ہر حالت بر ملا دوسروں کو بتا دے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عائلی زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ خیر کم خیر کم لاهلہ۔^{۱۷}

”تم میں سب سے بھلا آدمی وہ ہے جو اپنے اہل خانہ کے لیے بھلا ہو۔“

۲۔ خیارکم خیارکم نسائہم۔^{۱۸}

”تم میں سب سے بھلے وہ لوگ ہیں جو اپنی بیویوں کے لیے بھلے ہوں۔“

احمد مختار صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان ارشادات کے مطابق عمل کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں پر حد درجہ شفقت فرماتے اور ان کو اپنے رازوں میں شریک فرماتے۔ اس لیے کہ اگر بیوی محرم راز نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر ان سے ان رازوں کی حفاظت میں کوتاہی ہوتی تو اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی سرزنش بھی فرماتے تھے۔ لیکن یہ انداز بھی ایسا ہوتا کہ مخاطب بات بھی سمجھ جائے اور کچھ زیادہ گراں بھی نہ گذرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں ان کا ہاتھ بٹاتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زہد و قناعت کی تعلیم پر پورا اترتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزادی دے رکھی تھی کہ وہ اگر اپنے لیے عیش و آرام والی زندگی کو پسند کرنا چاہیں یا اس سے محروم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت والی زندگی۔^{۱۸} لیکن انہوں نے ہر قیمت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کو پسند کیا۔

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچوں سے بے حد محبت تھی۔ ایک بار عید کے روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم عید گاہ کی طرف تشریف لے جا رہے تھے۔ ہر طرف بچے خوبصورت اور رنگارنگ کپڑے پہنے خوش و خرم کھیل رہے تھے جب کہ ایک بچہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک طرف کھڑا رو رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لے گئے، اسے پیار کیا اور رونے کی وجہ دریافت فرمائی۔ بچے نے بتایا کہ ”میرا باپ نہیں، اس لیے میں نئے کپڑے نہیں

یہن سکا۔“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نم ہوتے ہوئے بچے کو اٹھا کر گھولائے، نئے کپڑے پہنوائے اور فرمایا: ”جس کا دنیا میں کوئی باپ نہیں ہے، میں اس کا نگہبان ہوں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل عورت کو نحوست اور مکرو فریب کا پرتو خیال کیا جاتا تھا۔ وہ اپنے جائز تمدنی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی حقوق سے محروم تھی حتیٰ کہ بعض قبائل تو اپنی بچیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سختی سے ممانعت فرمائی اور اسے گناہ عظیم قرار دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کی مستقل حیثیت قائم کی اور اسے وراثت میں حصہ دار ٹھہرایا۔ جنت کو ماں کے پاؤں تلے قرار دیا اور اس کی خدمت کو جہاد قرار دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی بیٹیوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور اپنی بیٹی فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق فرمایا کہ ”یہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔“ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو فطرت کے مطالبے کے مطابق رتبہ عطا فرمایا اور انسانی تمدن کی ترقی اور استحکام کے لیے ایک ایسی ٹھوس اور مستحکم بنیاد فراہم کر دی جس کے بغیر خاندان کی تائیس میں اعتدال، نظام معاشرت و معیشت میں توازن اور نظام حکومت و سیاست میں استواری محال ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے معاشی حقوق عطا کیے کیونکہ تمدنی منزلت معاشی استحکام کی ہی رہن منت ہوتی ہے۔

اسی وقت جو ذلت عورت کے ساتھ روارکھی جا رہی ہے، اسلام اس سے ہٹ کر عورت کو ایک اعلیٰ و ارفع مقام دیتا ہے۔ عصر حاضر میں عورت کو محض کمرشل آرٹ کا ایک ذریعہ تصور کر لیا گیا ہے۔ امن کے دنوں میں اپنی اشیاء کی زیادہ فروخت کے لیے اس کی بے حرمتی کی جاتی ہے اور جنگ کے دنوں میں وہ انفرادی اور اجتماعی آبروریزی کا نشانہ بنتی ہے۔ مقبوضہ کشمیر اور بوسنیا کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ مغربی تہذیب نے اسے گھر کی مامون چار دیواری سے نکال کر ایک کماؤ فرد بنا ڈالا ہے۔ یہی معاشی بے بسی معاشرت میں اس کی علامی کا سب سے بڑا سبب بنتی ہے۔ مغربی ثقافت میں ٹیلی ویژن پر ترغیب گناہ کے بے شمار سامان مہیا کیے جاتے ہیں۔ رفقائے کارحتی کہ ہمسائے بھی گناہ آلود زندگی بسر کرنے میں مدد ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے میں تو جرأت، ایمان اور استقلال اور دعاؤں کے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ چیزیں عصر حاضر میں مفقود ہیں جب کہ سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی رو سے ان سے

عورتوں کو لیس کیا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ عائلی زندگی کی پاکیزگی کو یقینی بناتی ہے اور اس کے ساتھ ہی انفرادی زندگی کی پاکیزگی کو بھی۔ وہ اپنی مرضی سے شادی کر سکتی ہے۔ اگر نباہ نہ ہو تو اسے خلع کا حق دیا گیا ہے تاکہ وہ ظالم، ناکارہ اور ناپسندیدہ شوہر سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔ مطلقہ اور بیوہ کو عقد ثانی کا حق دیا گیا ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کئی ایک بیواؤں سے عقد کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوجداری اور دیوانی قوانین میں مرد اور عورت میں کامل مساوات قائم کی۔ اسے علم سے بہرہ ور ہونے کا حق دیا اور اس طرح وہ اپنی روحانی بالیدگی اور اخلاقی سرفرازی کا سامان بھی بغیر کسی رکاوٹ کے کر سکتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا وہی دائرہ کار مقرر فرمایا جو اس کی جسمانی ساخت اور اس کی فطری صلاحیتوں اور قابلیتوں سے ہم آہنگ اور عین مطابق تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد و زن کی مصنوعی مساوات کا سبز باغ دکھا کر اسے ان سختیوں اور مشقتوں، ان جھمبیلوں اور تصادموں کے منجدھار میں نہیں ڈالا جس سے نبرد آزما ہونے کے لیے اسے فطرت نے تیار بھی نہیں کیا بلکہ اسے ایک قابل احترام ہستی کا درجہ دیا جو عائلی اور اجتماعی زندگی میں مثبت طریقے سے اپنا کردار ادا کرتی ہے۔

الحاد و زندقہ کے اس دور میں دنیا گونا گوں مسائل سے دو چار ہے۔ غالباً ایسی سنگینی حالات کی مثال نہیں ملتی۔ ایک شدید فکری اور ذہنی انتشار پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے اندر خود غرضی، طمع اور حرص کے بے شمار سانپ کلبلا رہے ہیں۔ ہر جگہ نفرتیں اور تعصبات ہیں۔ عیار عقل بھی بھیس بدل کر اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ عصر حاضر کو دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کا بھی سامنا ہے۔ امیر جائز و ناجائز ذرائع سے اپنی دولت و ثروت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ ایک نہایت ہی مہلک صورت اختیار کرنا جا رہا ہے اور بیشتر برائیوں کا باعث بن رہا ہے۔ دولت کے حصول کی غیر اخلاقی مسابقت بھی موجود ہے اور اس میں سرکاری ملازمین اور کاروباری طبقہ بھی شامل ہے۔ اگر سرکاری ملازمین رشوت کا بازار گرم کیے ہوئے ہیں تو کاروباری طبقہ ملاوٹ، مہنگائی، ذخیرہ اندوزی، سمگلنگ اور ٹیکسوں میں چوری سے اپنے ہاتھ رنگ رہا ہے۔ جہالت، تعصب، بے حیائی، ریاکاری، بد امنی، فسادات، ڈاکہ زنی، رہزنی اور اغوا برائے تاوان بھی عصر حاضر کے ”تحائف“ ہیں۔ یہ تمام مسائل ایک ہی شجر کی شاخیں ہیں اور وہ شجر ہے منافقت۔ عدم

مساوات نے معاشرے کی صورت مسخ کر کے رکھ دی ہے۔ ایک طبقے کا دوسرے طبقے کے ہاتھوں استحصال عام ہے۔ ایثار، مساوات اور قول و فعل کی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث نسلی امتیازات نے جنم لیا ہے۔

سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہمارے داخلی مسائل مثلاً اکل حرام، رشوت، اقربانوازی، چوربازاری، نوسربازی، سمگلنگ، منشیات اور جرائم مثلاً قتل، چوری اور جنسی جرائم کا مکمل علاج بلکہ انسداد موجود ہے۔ یہ رنگ و نسل، وطنیت اور جغرافیہ کے تصورات اور آقا و غلام کے امتیازات سے بلند و بالا تر ہے۔ بلاشبہ آج بھی اگر ہم اپنے ایمان، اعمال اور کردار کو رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق ڈھال لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اخوت اور وحدت کی اسی فضا میں نہ رنگی جائے جو چودہ صدیاں پہلے قائم ہوئی تھی اور جب مسلمان ایک بہت بڑی قوت بن کر دنیا پر چھا گئے تھے۔ ارشاد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے: ”قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ تم ضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو۔ ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہ گاروں کے ساتھ تم سب پر اپنا عذاب بھیجے گا۔ اس وقت تم خدا سے دعا مانگو گے تو وہ قبول نہیں ہوگی۔“

اگر انسان زیور تعلیم سے آراستہ نہ ہو تو اس کے لیے خیر اور شر کی اقدار میں امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مشہور حدیث ہے: ^{۱۹} طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَىٰ كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ يَعْنِي ”تختصیل علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا: ^{۲۰} ”علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین میں جانا پڑے۔“

اس مختصر سے جملے میں دینی اور دنیاوی دونوں علوم شامل ہیں۔ ایسی تعلیم جو کہ ایک طرف فرد کو حقوق نفس کی تکمیل کی طرف رغبت کرے تو دوسری طرف حقوق اللہ کو پورا کرنے کے قابل بنائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں تعلیم کا مقصد اخلاقی نشوونما اور کردار کی اصلاح تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ^{۲۱} بُعِثْتُ لَا تَمِّمَ حُسْنَ الْاِخْلَاقِ يَعْنِي ”مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا گیا ہے تاکہ اخلاقی اچھائیوں کو تمام و کمال تک پہنچا دوں۔“ یہ اسلامی تعلیم ہی ہے جس نے بتایا کہ ”کسی گورے کو کالے پر، کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔“ گویا اسلام انسانوں کے رنگ و نسل، ملک و زبان کو کوئی حیثیت نہیں دیتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

مزید فرمایا کہ ”میں رنگ و نسل کے امتیازات کو اپنے پاؤں تلے روندتا ہوں۔“ قرآن حکیم نے
 اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۝۲۲ ”درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت
 والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔“ کا ابدی اصول بیان کر کے ہمیشہ
 ہمیشہ کے لیے بنی آدم علیہ السلام کو بحیثیت انسان عزت و وقار کا مقام بخش دیا اور انہیں بتا دیا کہ
 تمہارے شعوب و قبائل اس لیے بنائے گئے ہیں کہ تمہیں ایک دوسرے کو پہچاننے میں آسانی ہو
 اور وجہ افتخارات صرف اور صرف تقویٰ ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اتونسی
 باعمالکم والاتوننی بانسابکم یعنی ”گویا حسن عمل آدمیت کی اساس ہے اور ہر قسم کے
 نام و نمود کو غیر اسلامی قرار دے دیا گیا ہے کیونکہ حقیقی عظمت کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔
 اسی حقیقت کو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

آدمیت احترام آدمی
 باخبر شو از مقام آدمی!

اس طرح ہر نام و نمود سے پاک اور خیر کا تا قیامت اسوہ حسنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی
 ذات مبارک ہے جنہوں نے فرمایا تھا: الفقیر فخری یعنی ”درویشی میرا نشان فخر ہے۔“
 عصر حاضر کا ایک سب سے بڑا مسئلہ علاقائی تعصبات اور جاہلانہ گروہی نعرے ہیں۔ جن
 کی وجہ سے ہر جگہ قتل و غارت، لوٹ مار، خوف و ہراس، بد امنی اور بے اعتمادی کی آگ کا
 عذاب موجود ہے۔ رحم و کرم، محبت اور دوستی کے چشمے سوکھ چکے ہیں۔ اخوت اور مواخات کی
 قدریں بدل چکی ہیں۔ آدمی آدمی کے لیے بھیڑ یا بن چکا ہے، قومیں قوموں سے برسر پیکار
 ہیں۔ انسانیت تباہی و بلاکت کے آخری کنارے پر پہنچ چکی ہے ایسے میں دنیا امن کی پیاسی اور
 سکون کی متلاشی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پر ایمان
 کی بنیاد پر ایک امت بنائی تھی۔ اس امت میں مکے کے مہاجرین، مدینے کے انصار، حبشہ کے
 بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور فارس کے سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب کو یکساں حقوق حاصل تھے اور
 ایمان کے رشتہ نے ان میں یگانگت پیدا کر دی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعصب زدہ
 عربوں کو اپنی سیرۃ کے دلکش رویوں سے شیر و شکر کیا۔ اسی طرح آج بھی ضروری ہے کہ ایک
 اللہ، ایک رسول، ایک قرآن اور ایک امت کے اصول پر علاقائی، گروہی اور جماعتی، تعصبات کا

قلع قمع کیا جائے۔ ذرائع ابلاغ، جمعہ کے خطبات اور درسگاہوں کے ذریعے تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اخوت، وحدت اور یک جہتی کا شعور پیدا کیا جائے۔ نظام تعلیم میں ایسی تبدیلیاں لائیں کہ ہر سطح پر نفس مضامین میں احادیث، قرآنی آیات اور ہدایات مکمل طور پر سمودی جائیں۔ اس کے لیے نصاب کی نئے سرے سے تدوین اور ذرائع ابلاغ عامہ کے بھرپور استعمال کی اشد ضرورت ہے۔ آج اگر ہم سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیمانے پر پورے خلوص اور سچائی کے ساتھ خود کو لے آئیں تو کوئی وجہ نہیں کہ عصر حاضر میں بھی لڑائی جھگڑے، تعصبات اور نفرتوں کی آگ ٹھنڈی نہ پڑ جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت بنی نوع انسان کے لیے امن و سلامتی کا پیامبر ہے جب کہ آپس میں ملوثو ایک دوسرے کو سلام کرو کہ اس سے محبت بڑھتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مساوات کا تصور پیش کر کے بنی نوع انسان میں طبقاتی، نسلی، علاقائی اور لسانی تفریقات کا قلع قمع کر دیا ہے اور اس طرح تمام انسانوں کو عدل و انصاف کا یکساں استحقاق دے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام امتیازات مٹا دیئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ^{۲۳} ”وہ شخص ہم میں سے نہیں جو عصبیت پر واقع ہو۔“ اس طرح امن کی پیاسی دنیا کو بھائی چارے کی فضا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع ہی میں ملے گی۔ یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ طیبہ ظلمت کدہ عالم کے لیے روشنی کا مینار ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ^{۲۴} ”ان العباد کلہم اخوة۔“ یعنی اللہ کے بندے (تمام انسان) آپس میں بھائی ہیں۔“ اس اصول پر عمل کر کے ان حالات میں سیرۃ طیبہ کے اتباع سے ہمارے دلوں میں یکجہتی اور نگاہوں میں یک رنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہمارے زندگی کے چشمے اسی حیات آفرین پیغام سے پھوٹ سکتے ہیں اور اسی سے ہم امن و شائستگی اور سکون و طمانیت سے آشنا ہو سکتے ہیں۔ سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وحدت انسانیت کا پیغام دیتی ہے۔ اس کے ذریعے ہم انتشار اور بد امنی سے دو چار دنیا کے لیے امن، سلامتی اور یکجہتی کی کلید حاصل کر سکتے ہیں اور اسی کے ذریعے دنیا آج بھی عالمگیر وحدت اور ہم آہنگی سے معمور ہو سکتی ہے۔

دنیا میں آج جو بد امنی اور فتنے پھیلے ہوئے ہیں ان کا حقیقی سبب یہ ہے کہ لوگ اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر اپنے مطلب و مفاد کے لیے دوسروں کی حمایت کرتے ہیں۔ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ پیش رکھنا چاہیے جن کا بے مثال عفو ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ فتح مکہ

کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن اس انتظار میں تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ اتنا حیرت انگیز تھا کہ نہ صرف اسی دور بلکہ آنے والے ادوار میں بھی لوگ انگشت بندھاں اور سر بگریباں ہیں۔ شاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ^{۲۵} اذهبوا انتم اللطقاء یعنی ”تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ آج تم سب آزاد ہو۔“ پھر آج اسلامی ممالک کیوں آپس میں برسریکا رہیں؟ کیا وہ ایک دوسرے کو معاف نہیں کر سکتے؟ یقیناً ہم اب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ کی روشنی میں یک جہتی اور قومی وحدت پیدا کر سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ہر شخص صحیح تناسب اطاعت قائم کرے اور قوم اور معاشرے کے لیے ایثار و قربانی دے اور اپنے قول و فعل میں تضاد ختم کرے، ہم اپنے تضادات ختم کریں اور نئی نسل کو اچھائی اور خیر کا نمونہ بن کر دکھائیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں آجرواجیر میں باہمی ہمدردی کا فقدان ہوتا ہے۔ اس خود غرضانہ کھچاؤ کے نتیجہ میں ہڑتالیں اور تالہ بندیاں روزہ مرہ کا معمول بن جاتی ہیں جن سے سنگین معاشی، معاشرتی اور سیاسی بحران جنم لیتے ہیں۔ اس کے علی الرغم اشتراکی نظام میں محنت کش کی انفرادیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ ریاست کے لیے جیتا اور اسی کے لیے مرتا ہے۔ یہاں اس کا استحصال ریاست کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ ہر دو نظام افراط و تفریط کا شکار ہیں اور اس بے اعتدالی کے ہولناک نتائج پوری دنیا کے سامنے ہیں۔

ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں ہی قائم کردہ نظام انسان کے اس اہم مسئلے کو اعتدال و توازن سے حل کرتا ہے۔ پیداواری عمل میں محنت اور سرمائے کو ان کا جائز مقام عطا کرتا ہے۔ وہ نہ سرمائے کو اس امر کی اجازت دیتا ہے کہ وہ محنت کو اپنا غلام بنا کر رکھ لے اور نہ محنت کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنی چیرہ دستیوں سے سرمائے کی افادیت کو مجروح کر کے رکھ دے۔ اس نظام میں آجرواجیر ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ غمگسار اور معاون ہوتے ہیں۔ یہی فضا امن اور سلامتی کی ضامن ہے اور تعلقات کی یہی استواری اور راستی معاشی بحران پر قابو پانے اور پیداوار میں مسلسل اضافے کا قابل اعتماد اور لائق اعتماد وسیلہ بن سکتی ہے۔ یہ محض خود فریبی ہے کہ ہم ہاتھ سے کام کرنے والے کو قابل نفرین گردانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ کا مطالعہ کیجیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فریبی کے ان

جھوٹے اور خود تراشیدہ بتوں کو کس طرح پاش پاش کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ کی تعمیر میں خود حصہ لیا۔ مسجد قبا اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر میں ایک عام محنت کش کی طرح کام کیا۔ غزوہ احزاب کے موقع پر خندق کھودنے میں بھرپور حصہ لیا اور خود پتھر اٹھا اٹھا کر محنت کشوں کی حرمت اور عظمت کا عملی نمونہ پیش کیا۔ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے محنت کش کے ہاتھوں پر بوسہ دیا جن پر پتھروں پر کدال چلانے کی وجہ سے گٹے پڑ گئے تھے۔ محنت و مشقت انسانیت کی معراج ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ^{۲۶} ”انسان کی وہ روزی سب سے زیادہ پاکیزہ ہے جو اس نے اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کمائی ہے۔“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت کشوں کی حالت یکسر بدل کر رکھ دی اور ان میں عزت نفس اور خود اعتمادی کی روح پھونک دی۔ ان کو ذلت اور بے چارگی کی پستیوں سے اٹھا کر عزت و وقار کے بلند ترین مدارج پر فائز کر دیا۔ بروقت معاوضے کی ادائیگی کے متعلق فرمایا: ^{۲۷} ”مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔“ خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت میں عظمت کا تصور پیش کیا اور فرمایا: ^{۲۸} ”ما اکل احد طعاما قط خيرا من ان ياكل من عمل يديه“ یعنی ”بلاشبہ تمہارے اسلام کی تکمیل یہ ہے کہ تم اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرو۔“ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس کے حکم کے مطابق خرچ کرنا درحقیقت اس امر واقعی کو عملی طور پر تسلیم کرنا ہے کہ اس کائنات میں کام کرنے کے سارے مواقع اور وہ سب کچھ جو انسان حاصل کرتا ہے وہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی دین ہے، اگر اللہ تعالیٰ نہ دیتا تو وہ ایک دانہ بھی حاصل نہ کر سکتا تھا۔ زکوٰۃ دینے والے کا مال دنیا کی حرص اور بخل جیسے ناپاک جذبات سے پاک ہو جاتا ہے اور آخرت، نیکی اور تقویٰ کے کاموں کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اپنی کمائی میں مساکین کا حصہ ان کے حق کے طور پر تسلیم کیا جائے اور دیا جائے۔ مساکین میں بھی سب سے اول اپنے اقرباء کا خیال رکھا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ افضل الصدقة الصدقة على ذی الرحم الكاشح یعنی ”افضل ترین وہ صدقہ ہے جو اس قریبی رشتہ دار کو دیا جائے جو عداوت اور دشمنی رکھتا ہو۔“ یہ کہ آدمی کا آدمی کی حیثیت سے احترام ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرے کو بحران سے دوچار کرنے والی ہر صورت کا تدارک کیا۔ فرمایا: ”جو شخص مسلمانوں کے لیے اشیاء کے نرخ گراں کرنے کی غرض سے ذخیرہ اندوزی کرے تو وہ غلط کار ہے۔“ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار ارشادات میں حلال رزق کے حصول پر زور دینے کے لیے فرمایا گیا ہے: **طَلَبَ الْحَلَالَ جِهَادٌ** یعنی ”رزق حلال کی تلاش جہاد ہے۔“ اس طرح کے مختلف اقدامات کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں معاشی استحصال کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ طیبہ کی ہر گھڑی اور ہر آن عدل و اعتدال اور احسان و سلوک کا حسین مرقع تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں دنیائے انسانیت کے لیے عمل کا پورا نمونہ اور گم کردگان راہ کی ہدایت اور رہنمائی کا سامان مہیا نہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے اخلاق و کردار کا جو اعلیٰ ترین نمونہ وضع کیا ہے اس پر پورے خلوص اور دیانتداری سے عمل پیرا ہوں تو ہمارا رشتہ لڑائی جھگڑوں، نفرتوں اور عصبیتوں کی آگ سے پاک ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست میں ایک ایسی صاف ستھری عدلیہ کی عملی مثال پیش فرمائی کہ جس میں سربراہان مملکت عدلیہ کے سامنے اس طرح جوابدہ ہوتا ہے جس طرح ریاست کا ایک عام باشندہ۔ درحقیقت قومی زندگی جس حقیقی یگانگت کا تقاضا کرتی ہے وہ کسی ایسی ریاست میں نشوونما نہیں پاسکتی جس کا نظام عدل مختلف طبقوں کے لیے مختلف ہو۔ اسی لیے چوری کے جرم میں محزوم کی ایک ممتول اور بااثر خاتون فاطمہ کی جب اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذریعے بریت کی سفارش کرائی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **تم سے پہلی قومیں اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ ان میں اونچے طبقوں کو سزا دینے کا رواج نہ تھا۔ خدا کی قسم! اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی یہ جرم کرتی تو میں یہی سزا دیتا۔“** چنانچہ مجرمہ کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی اسلامی زندگی میں ایک بہت ہی مستحکم اصول کی حیثیت اختیار کر گیا اور اسی بنا پر یہ قانون بنا کہ حدود کے سلسلے میں نہ کوئی سفارش قابل شنوائی ہے اور نہ کسی صورت معاف کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم اسوہ حسنہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں عدالتی نظام اس طرح تشکیل دیں کہ ستاور فوری انصاف ممکن ہو تو معاشرے میں عدل و مساوات قائم کرنے میں بے حد مدد مل سکتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ میں اعتدال ہے۔ اسی اعتدال کا ایک نظریہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر ایک کا حق پہچانتے اور اسے ٹھیک ٹھیک ادا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا اور نہ کسی کی کبھی حق تلفی کی، خواہ وہ حق اللہ کا ہو، بندوں کا ہو، اہل و عیال کا باخود اپنے نفس اور جسم کا ہو۔

صاحب خلق عظیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرۃ طیبہ کا یہ طرہ امتیاز رہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن اعمال و افعال کی ملت کے افراد کو تعلیم دی اس پر خود پہلے عمل کر کے یہ ثابت فرمایا کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو صرف ان اعمال کی تعلیم دیتا ہے جو قابل عمل ہوں۔ غزوہ احزاب کے موقع پر خندق کھودنے کے دوران میں جب ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھوک کی شکایت کرتے ہوئے اپنے پیٹ پر باندھا ہوا پتھر دکھایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا شکم مبارک دکھایا جہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ ایسی مساوات کی مثال کیا دنیا کا کوئی دوسرا نظام پیش کر سکتا ہے؟

اسلام نے معاشرتی بے راہ روی کے انسداد کے لیے بھی کئی طرح کے اقدامات کیے۔ بے حیائی کے متعلق فرمایا: ^{۳۱} لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَبِاطْنِ لَيْعِنَ "بے حیائی کے جتنے بھی طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ خواہ وہ علانیہ ہوں یا پوشیدہ۔" ایک اور موقع پر فرمایا: ^{۳۲} الْحَيَاءُ شَعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ لَيْعِنَ "جہاد ایمان کی ایک شاخ ہے۔" عصر حاضر میں ہر طرف بے حیائی کے مناظر عام ہیں لیکن ان احادیث پر عمل کر کے اس لعنت سے دور رہا جاسکتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود تاجر رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کو ایک مرغوب پیشہ بنایا۔ بظاہر تجارت ایک دنیاوی کام ہے لیکن اگر اس میں دیانتداری برتی جائے تو وہ عبادت بن جاتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ^{۳۳}

التَّاجِرُ الصَّدُوقُ الْأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّ وَالصَّادِقِينَ وَالشَّهَدَاءِ.

یعنی "سچائی کے ساتھ معاملہ کرنے والا امانت دار تاجر قیامت کے دن نبیوں،

صدیقیوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔"

تاجر ناپ تول صحیح رکھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ^{۳۴} زَنْ وَرَاجِعٌ لَيْعِنَ تَوَلَّ اور پورا دے۔" تاجر کو جھوٹی قسموں سے منع فرمایا کہ اس طرح برکت ختم ہو جاتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ^{۳۵} إِيَّاكُمْ وَكَثْرَةَ الْخَلْفِ فِي الْبَيْعِ فَإِنَّهُ يُنْفِقُ ثُمَّ يَمْحَقُ. یعنی

”اپنے مال کو بیچنے میں کثرت سے قسمیں کھانے سے بچو۔ یہ چیز (وقتی طور پر) تو تجارت کو فروغ دیتی ہے لیکن آخر کار برکت ختم کر دیتی ہے۔“ اس طرح ذخیرہ اندوزی کی ممانعت فرمائی: ^{۳۳} وَالْمُحْتَكِرُ مَلْعُونٌ يَعْنِي ”اور وہ شخص جو احتکار کرے وہ لعنت کا مستحق ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاجر پر یہ لازم قرار دیا کہ وہ اپنے مال کے عیب نہ چھپائے۔ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے تاجر کے پاس سے گذرے جو غلہ فروخت کر رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ غلہ کے اندر ڈالا۔ اندر کا حصہ پانی سے تر تھا۔ آپ نے تعجب کا اظہار مایا تو اس نے بتایا کہ ”حضور بارش سے بھگی گئیں۔“ استفسار فرمایا: ”پھر اُسے اوپر کیوں نہ رکھا؟“ پھر فرمایا: ^{۳۴} مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا يَعْنِي ”جس نے دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔“

رشوت نا انصافی، ظلم اور لاقانونیت کے پھیلنے کا سبب بنتی ہے اور یہ صورت حال پوری کی پوری قوم کو اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی پہلو سے تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ^{۳۸} الرَّائِسِيُّ وَالْمُرْتَشِي كِلَاهُمَا فِي النَّارِ يَعْنِي ”رشوت دینے والا اور لینے والا دونوں دوزخی ہیں۔“ ایک اور جگہ فرمایا: ^{۳۹} لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّائِسِيَّ وَالْمُرْتَشِيَّ يَعْنِي ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے اور رشوت لینے والے پر لعنت بھیجی ہے۔“

آج کل منشیات کی لعنت ہر جگہ معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نشہ کی ممانعت ان الفاظ میں فرمائی۔ ^{۴۰} اجتنبوا کُلَّ مُنْكَرٍ يَعْنِي ”ہر نشہ آور چیز سے بچو۔“

سچائی نیکی اور اصلاح کی بنیاد ہے جب کہ جھوٹ ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ آج کل جھوٹ فن حیات کے طور پر بولا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ بولنے سے منع فرمایا ہے۔ ابوداؤد میں روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”یہ زبردست خیانت ہے کہ تم ایک بات اپنے بھائی سے کہہ اور وہ تمہیں سچا جانے اور تم اس سے جھوٹ بات کہو۔“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبر کی بھی ممانعت فرمائی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے انسان حق قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اور خود غرضی اور انسان دشمنی کی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ حسب و نسب کا غرور، حسن و جمال کا غرور، دولت و عزت کا غرور، قوت و حکومت کا غرور اور علم و زہد کا

غرور اس کی مختلف اشکال ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ^{۴۱} لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ أَحَدٌ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ يَعْنِي "جس آدمی کے دل میں رائی کے برابر غرور ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔"

ایک صحت مند معاشرتی نظم پیدا کرنے کے لیے اسلام ہر فرد کی عزت نفس کی حفاظت پر بہت زور دیتا ہے اور حقائق جانے بغیر کسی بھی قسم کی بات پر یقین نہ کرنے کا درس دیتا ہے۔ ^{۴۲} اور اسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کے لیے شہادت پیش کرے۔ ^{۴۳} لیکن جھوٹی شہادت کو قابل تعزیر قرار دیا گیا ہے ^{۴۴} آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جھوٹی گواہی دینا اور شرک دونوں برابر کے گناہ ہیں۔ ^{۴۵}

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسد کے متعلق فرمایا کہ اس سے بچو کہ یہ نیکیوں کو اس طرح بھسم کرتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو بھسم کر ڈالتی ہے۔ ^{۴۶}

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملت اسلامیہ کو ایک وحدت قرار دیا ہے اور تفرقہ اندازی کرنے والوں کے متعلق فرمایا ہے کہ مَنْ تَفَرَّقَ فَلَيْسَ مِنَّا يَعْنِي "جو شخص آپس میں (مسلمانوں میں) تفرقہ اور جدائی ڈالے وہ ہم میں سے نہیں۔" آج بے شمار مسلمان تفرقہ اندازی کو ایک معمولی فعل خیال کرتے ہیں حالانکہ یہ گناہ عظیم ہے۔

زندگی کی بقا کے لیے کھانا پینا ضروری ہے مگر اتنا کھانا کہ معدے کے لیے اس کا بار برداشت کرنا اور اسے ہضم کرنا مشکل ہو جائے، صحت کو تباہ و برباد کرنے اور گونا گوں بیماریاں پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ بسیار خوری سے انسان نہ صرف سنگدل ہو جاتا ہے بلکہ پردل سیاہی چھا جاتی ہے اور انسان حیوانی شہوات کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ قرآن حکیم پر خوری کا فروع کا وصف قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ مذکور ہے۔ ^{۴۷}

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۝

"ا، کفر کرنے والے بس دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں،

جانوروں کی طرح کھاپی رہے ہیں اور ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے۔"

بسیار خوری کا نتیجہ ذیابیطس کی شکل میں بھی سامنے آ سکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

تعلیمات کی روشنی میں اگر انسان طہارت اور ہم جنس پرستی سے اجتناب کرے تو ایڈز جیسی لاعلاج بیماری اس کے قریب نہیں آسکتی۔

عصر حاضر کی مادی تہذیب انسان کی روحانی عظمت کو پامال کرتی ہے۔ اس کی چمک ظاہری ہے باطنی نہیں۔ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ منتشر اور پریشان حال انسانیت کی فلاح کے لیے آگے بڑھیں۔ قرآن حکیم ہمیں کائنات اور بنی نوع انسان کو ایک اکائی تصور کرنے کا درس دیتا ہے۔ انسان کو جو چیز انسان بناتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ مقاصد کا حصول ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو قرآن حکیم نے ”حکم“ یعنی آخری سند ٹھہرایا ہے۔^{۴۹}

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝

”نہیں، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔“

اسی طرح قرآن حکیم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرار دیتا ہے۔^{۵۰}

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ.

”جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔“

خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”جس نے میری اطاعت کی بے شک اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی بے شک اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور میں لوگوں (یعنی حق و باطل) کے درمیان فرق پیدا کرنے والا ہوں۔“^{۵۱}

اللہ تعالیٰ نے معاشرے کو شکست و ریخت سے بچانے کے لیے سورۃ الحجرات میں تمام اصول بیان فرمادئے ہیں۔ جیسے فرمایا: ”ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑاؤ“، ”ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔“، ”ایک دوسرے کے برے نام نہ رکھو۔“ پھر عیب چینی اور خوردہ گیری و طعن و تشنیع

کی مذمت بھی کی اور انہیں تباہ کن اعمال بھی قرار دیا۔ اتحاد کے بارے میں فرمایا: كُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا گویا انصاف پر اصلاح معاشرہ کی بنیاد رکھی۔ غرض معاشرہ میں برائیوں کے انسداد کی مقدور بھرکوشش مسلمانوں کا انفرادی، اجتماعی اور قومی فریضہ ہے جسے نہایت احتیاط سے پوری حکمت و بصیرت کے ساتھ بروئے کار لانے کی ضرورت ہے تاکہ مثبت، موثر، نتیجہ خیز اور دیرپا فوائد مقاصد حاصل ہو سکیں۔

ان ارشادات ربانی پر عمل پیرا ہو کر حسد و عناد جیسے مہلک عوامل کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انس و محبت، اخوت و مساوات اور اتحاد و یگانگت کے ثمرات بھی حاصل ہوں گے۔

یہی مقصود فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی

اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کردار و گفتار سے اسلامی اقدار و اخلاق کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ اسلام کا دائرہ عمل نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ پوری معاشرتی زندگی کا احاطہ کیے ہوا ہے اور یہی بندگی ہے۔ اس احساس عبدیت کی عملی شکل یہ پیش کی گئی ہے کہ جس کام سے اللہ اور اس کے رسول منع کریں، ان سے بچو اور جس کام کو کرنے کی تلقین کریں وہ کرو۔ فرمایا: ^{۵۲}

إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ

”اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو۔“

عصر حاضر کے مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ ہم اپنے دلوں کو شوکت نبوت سے منور کریں کیونکہ اسی میں ہدایت اور رہنمائی مضمر ہے۔ یہی راہ نجات ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے محاسن، مکارم عالیہ پوری انسانیت کے لیے مشعل راہ اور ڈھال ہیں۔ زندگی کے کسی بھی شعبے کے بارے میں کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں جس کے بارے میں رہنمائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں نہ ملتی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع میں بھرپور انداز میں نبوت کی شان جلوہ گر ہے۔ یہ رہتی دنیا تک انسانیت کا منشور اعظم ہے۔ اس میں عصر حاضر کے مسائل کا بہترین حل موجود ہے فرمایا: ^{۵۳}

کے نوکریوں نے خون دیکھا، وہاں پہنچ کر ان کو ماریا لے گئے ہیں۔ سو جس
 کو کہتے ہیں کہ وہاں، اسی وقت سے اس کے، اس کو ماریا لے گئے۔
 وہاں جا بیٹا کی سوانی رکھیں یا سوانی لگی ہیں۔
 کتنے عذابا تھے اس پر جانے لگا۔

موتوں میں سے بڑی بڑی ہیں۔ ان شمس کے لیے اس کے بھائی گاؤں (سیتا) اس کی
 رخصت منگانی کے لیے جا کر نکلتے ہیں۔ اس تہوار کے درمیان اس کی چیز چھوڑے جا رہے ہیں کہ جب
 تک اس پر بارش نہ ہو کہ کتنی دور ست سے نہ ہونگے۔ وہاں سے شرن کتاب۔
 اس کا بی بی کو کہتے ہیں کہ متو ہے پر کوئی بدترانی کا عمل نہیں ہے ورنہ اس کی گنجی کے لیے
 نہیں کے متو ہے اس بدترانی ہے۔ کوئی بدترانی ہے تو تھوڑی کی چھپر۔

حوالہ جات

- ۱ سنن ابن ماجہ
- ۲ قرآن حکیم ۱۷:۸۲
- ۳ قرآن حکیم ۵:۳
- ۴ بخاری
- ۵ بخاری
- ۶ بخاری و مسلم
- ۷ متفق علیہ
- ۸ بخاری
- ۹ بخاری و مسلم
- ۱۰ قرآن حکیم ۳۳:۲۱
- ۱۱ قرآن حکیم ۵:۲
- ۱۲ قرآن حکیم ۲۹:۱۰
- ۱۳ قرآن حکیم ۳:۱۰۳
- ۱۴ بخاری و مسلم
- ۱۵ مسلم
- ۱۶ ترمذی، دارمی، ابن ماجہ
- ۱۷ ترمذی
- ۱۸ قرآن حکیم ۳۳:۲۸-۲۹
- ۱۹ بخاری
- ۲۰ ایضاً
- ۲۱ موطا
- ۲۲ قرآن حکیم ۲۹:۱۳
- ۲۳ مشکوٰۃ
- ۲۴ ابوداؤد
- ۲۵ بخاری، ابن ہشام

مشکوٰۃ	۲۶
ابن ماجہ	۲۷
بخاری	۲۸
بزار	۲۹
بخاری	۳۰
بخاری	۳۱
بخاری	۳۲
ترمذی	۳۳
بخاری	۳۴
مسلم	۳۵
سنن ابن ماجہ	۳۶
بخاری	۳۷
بخاری، طبرانی، المعجم الکبیر	۳۸
ابوداؤد	۳۹
بخاری	۴۰
ترمذی	۴۱
قرآن حکیم ۶:۴۹	۴۲
قرآن حکیم ۲:۲۸۳	۴۳
قرآن حکیم ۴:۲۳	۴۴
ابوداؤد	۴۵
ایضاً	۴۶
طبرانی	۴۷
قرآن حکیم ۱۲:۴۷	۴۸
قرآن حکیم ۶۵:۴	۴۹
قرآن حکیم ۸۰:۴	۵۰
بخاری، ترمذی وغیرہ	۵۱
قرآن حکیم ۳۱:۳	۵۲
ابن ہشام	۵۳

حضور کی عائلی زندگی اور اس کی اہمیت

عائلی زندگی معاشرے میں ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس کے مستحکم ہونے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام عائلی زندگی کا نگران اور منتظم مرد کو قرار دیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”خبردار تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور رعیت (بیوی بچے) رکھنے والا ہے اور ہر شخص سے اس کی رعیت کی بابت سوال کیا جائے گا۔“ گھر ایک ننھی سی ریاست ہے اگر اس میں ہر فرد احسن طریق سے اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو تو گھر جنت کا نمونہ بن جائے گا۔ اس گھر کے بچے اپنی عملی زندگی میں ملک و ملت کے لیے بہترین افراد ثابت ہوں گے۔ اس مرحلہ پر بچے کو جو کچھ سکھایا جاتا ہے وہ بعد میں راسخ عادات کی شکل میں عمر بھر ساتھ چلتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خاندان بچے کا اولین مکتب ہے۔ عصر حاضر میں عائلی زندگی کو سنوارنے کے لیے بے شمار قواعد و ضوابط بنائے جاتے ہیں لیکن پھر بھی مقصد کے حصول میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

عائلی زندگی کی اساس نکاح ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم نے کوئی ایسی چیز نکاح کے سوانہ دیکھی ہوگی جو دو افراد کے درمیان اتنے درجہ کی محبت پیدا کر دے۔“ ایک گھر کے افراد ایک چھت تلے زندگی بسر کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم میں نکاح کے لیے لفظ احسان استعمال ہوا ہے جس کے معنی قلعہ، نکاح کرنے والے کو محصین (قلعہ بندی کرنے والا) اور نکاح کرنے والی کو محصنہ (قلعہ میں محفوظ شادی شدہ عورت) کہا جاتا ہے۔ گویا عورت نکاح کرنے کے بعد اس قلعہ میں داخل ہو جاتی ہے جو اخلاقی پابندیوں کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔ گویا نکاح کا مقصد عائلی زندگی اختیار کرنا اور عفت و عصمت کی زندگی بسر کرنا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شادی کے لیے عورت کا انتخاب چار اوصاف کی بنا پر ہو سکتا ہے: مال، نسب، حسن اور دینداری۔ چنانچہ تم دیندار عورت تلاش کرو۔ اگر کوئی ایسا نہ کرے تو اس کے

ہاتھوں کو مٹی لگے گی (اخیر چل کر ندامت ہوگی)۔^۱ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تمام بیویوں میں وہی سب سے زیادہ منظور ہوتی جس سے دین کی خدمت سب سے زیادہ بن آسکتی تھی۔ اور یہ جو ہر عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں سب سے نمایاں تھا۔

عائلی زندگی انسان کو احساس ذمہ داری سے ہمکنار کرتی ہے۔ باپ اہل خانہ کے لیے نان نفقہ کا بندوبست کرتا ہے اور بیوی اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہے۔ اسلام میں خاندان کا مفہوم دوسرے معاشروں کی نسبت خاصا وسیع ہے اس میں شوہر، بیوی اور اولاد کے علاوہ والدین، بہن بھائی، ان کی اولاد، چچا، ماموں، ان کی اولاد وغرضیکہ تمام نسبی رشتہ دار شامل ہیں۔ محبت و رحمت، عدالت اور اجتماعی کفالت اس کے عناصر ثلاثہ ہیں۔ جس قدر عائلی زندگی میں ان عناصر کو استقامت حاصل ہوگی اسی قدر معاشرہ مستحکم بنیادوں پر استوار ہوگا۔ خاندان کی کامیابی کا انحصار جملہ افراد کے باہمی حسن سلوک، محبت اور رواداری پر ہے۔ عائلی زندگی ہمیں انسانی رشتوں سے روشناس کراتی ہے جن کی بنا پر لوگ ایک دوسرے کے قریب اور قریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ارشاد خداوندی ملاحظہ ہو:^۲

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ
بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝

”اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔“

قرآن حکیم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے تمام ضروری اجزاء موجود ہیں جن میں نہ صرف نبوت کے بعد کے واقعات شامل ہیں بلکہ بعثت سے قبل کی زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جیسے یتیمی، افلاس اور تلاش حق وغیرہ۔ بعثت کے بعد کے واقعات میں اعلان و تبلیغ، مخالفین کی عداوت، ہجرت، لڑائیاں، وقائع اور اخلاق وغیرہ کے پہلو بھی اجاگر کیے گئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کو نجی اور عوامی حصوں میں تقسیم نہیں کر رکھا تھا۔ بیوی سے بڑھ کر خاوند کو کوئی نہیں جانتا ہر بیوی کو یہ اذن عام تھا کہ خلوت کی باتوں کو بھی جلوت میں برملا

بیان کرے تاکہ لوگ اس کو دیکھ سکیں اور اس سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔ اس اخلاقی وثوق اور اعتماد کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر سب سے پہلے صدیقۃ النساء خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی ایمان لائیں اور صدیقیت کے تمام تقاضوں کو پورا کیا۔ اس وقت ان کی شادی کو پندرہ برس ہو چکے تھے۔ یہ ایک طویل عرصہ ہے جس میں ایک دوسرے کی عادات و خصائل کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو نبی غار حرا سے وحی کے نزول کے بعد گھر تشریف فرما ہوئے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر فوراً لبیک کہا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اقتضائے بشریت سے خوفزدہ ہوئے تو خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تسکین دیتے ہوئے کہتی ہیں: ”یا رسول اللہ! خدا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہرگز تنہا نہیں چھوڑے گا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرابتداروں کا حق پورا کرتے ہیں، مقروض کے ماویٰ اور غریبوں کے مولیٰ ہیں۔ مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق کی طرفداری کرتے ہیں اور مصیبتوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے کام آتے ہیں۔“ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کافی بوجھ ہلکا ہوا۔ خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ورقہ بن نوفل، جو ان کے برادر عم زاد تھے اور عبرانی زبان کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ تورات اور انجیل پر عبور رکھتے تھے، کے پاس لے گئیں اور تمام واقعہ بیان کیا۔ ورقہ نے کہا کہ ”یہ تو وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اتر ا تھا۔“

خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تعلق قبیلہ اسد سے تھا جس کے مرد علم و معرفت میں ممتاز تھے اور حنیف کہلاتے تھے۔ بعض بت پرست ہونے کے باوجود حقیقت کے متلاشی رہتے تھے تاکہ کسی واحد حقیقی کی پرستش کی جائے۔ عنقوان شباب میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش روزگار ہوئی تو خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امین و صادق ہونے کا شہرہ سن رکھا تھا) نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا بھیجا اور کہا کہ ”میں نے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تجارت کرنا چاہتے ہیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سرمایہ نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے سرمایہ سے تجارت کر سکتے ہیں۔“ خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا درآمدات و برآمدات کا کاروبار کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنے وسیع کاروبار کے لیے کئی ایک افراد کو ملازم رکھا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب اہل مکہ کا قافلہ تجارت کو روانہ ہوتا تھا تو اکیلا ان کا

سامان تمام قریش کے برابر ہوتا تھا۔^۵

شرائط طے ہو جانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا کاروبار سنبھالا۔ اس سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار شام کا رخت سفر باندھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیانت اور خوش معاملگی سے خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا کاروبار چمک اٹھا۔ جہانگیرہ خاتون تھیں اور بیوہ بھی۔ اہل مکہ ان کو طاہرہ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پہلے ابوہالہ بن زہرہ تمیمی سے بیاہی ہوئی تھیں۔ ان سے ہند اور حارث نام کے دو لڑکے پیدا ہوئے تھے۔ ابوہالہ کے انتقال کے بعد عتیق بن عاذ مخزومی کے نکاح میں آئیں۔ ان سے ایک لڑکی ہند پیدا ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق فاضلہ، خصائل حمیدہ اور اوصاف کریمہ کے پیش نظر ہی انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے رشتہ مناکحت میں بندھ گئے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۲۵ برس تھی جبکہ خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ۴۰ برس کے پیٹے میں تھیں۔ ہل جزاء الاحسان الا احسان۔ حالانکہ کئی ایک معززین مکہ اپنی دختران کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کے خواہش مند تھے۔ دوسری طرف کئی ایک ممتاز سردار خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے شادی کے خواہاں تھے۔ خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن مبارک سے جو اولاد ہوئی ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

۱۔ زینب ۲۔ رقیہ ۳۔ قاسم ۴۔ ابراہیم ۵۔ ام کلثوم ۶۔ فاطمہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پہلے فرزند کے نام کی نسبت سے ہی ابو القاسم کہلائے۔ دونوں بھائی خوردسال ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا صرف ایک بیوی ہی نہ تھیں بلکہ ان سے زیادہ کوئی اور شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کی عمیق ترین گہرائیوں سے واقف نہ تھا۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشیر اور صہمی ترین دوست تھیں۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتے گزار دی اور ہر مشکل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔ انہوں نے اپنی تمام دولت اللہ کی راہ میں خرچ کر دی۔ ایک روایت کے مطابق خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دولت قریش کی مجموعی دولت سے بھی زیادہ تھی۔ ہر روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب زخمی گھر آتے تو وہ ان کے زخموں کو دھوتیں، پٹی باندھتیں، لباس تبدیل کرواتیں تسلی دیتیں اور

دلداری فرماتیں۔ ان کی اسی صدیقیت کے پیش نظر ہی اللہ تعالیٰ نے ان کو جبرئیل کی معرفت سلام بھیجا۔ باوجود اختلاف سن کے دونوں میں کبھی بھی کوئی اختلاف رونما نہیں ہوا۔ خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تین برس تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور رہیں جس دوران میں بھوک اور فقر و فاقہ سے دوچار ہونا پڑا۔ پچیس برس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت زوجیت میں رہنے کے بعد حرم نبوت کی یہ شمع جب بجھی تو مسلمانوں کے پاس ان کے لیے کفن تک نہ تھا۔ ان کو ان کی صو قہ کھیں دفن کیا گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نوبویاں تھیں جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدیجہ الکبریٰ کی رحلت کے بعد ازدواج کیا۔ جب تک وہ حیات تھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دوسری خاتون سے نکاح نہیں کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر ان کو فراموش نہ کر سکے۔ اکثر ان کو محبت سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ غزوہ بدر کے قیدیوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا داماد ابوالعاص بھی تھا۔ اس کے زرفدیہ میں زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک ہار بھیجا جو انہیں ان کی والدہ خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دیا تھا۔ یہ دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم دلگیر ہو گئے اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمایا کہ تمہاری مرضی ہو تو بیٹی کو ماں کی یادگار واپس کر دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔^۸ خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی کوئی جانور ذبح کرتے تو اہتمام سے خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ہم نشین عورتوں کے ہاں گوشت بھجاتے۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ گو میں نے خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو نہیں دیکھا لیکن مجھ کو جس قدر ان پر رشک آتا ہے کسی اور پر نہیں آتا۔^۹ اس کی وجہ اکثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے متعلق ذکر کرنا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ ”جب لوگوں نے میری تکذیب کی تو انہوں نے تصدیق کی۔ جب لوگ کافر تھے وہ اسلام لائیں۔ جب میرا کوئی معین نہ تھا تو انہوں نے میری مدد کی۔ اور اس سے اللہ تعالیٰ نے مجھے اولاد دی جب کہ دوسری بیویوں سے اولاد سے مجھے محروم کیا۔“^{۱۰}

خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی رحلت کے بعد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سودہ بنت زمعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ۱۰ نبوی میں شادی کی جو پہلے سکران بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بیاہی ہوئی تھیں۔ دونوں میاں بیوی قدیم الاسلام ہیں اور حبشہ کی طرف دو دفعہ ہجرت

کرنے والے ہیں۔ سکران رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کا ایک بیٹا عبدالرحمن تھا۔ سکران رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کے بعد سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیوہ بیوگی کی زندگی بسر کر رہی تھیں اور کبیر السن تھیں۔ دوسری طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کے بعد گھریار کے خیال سے متفکر رہتے تھے۔ آخر خولہ بنت حکیم کی تحریک پر سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے والد نے ان کی شادی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دی۔ سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نہایت سخی اور فیاض تھیں اور نہایت اطاعت شعار تھیں۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔

سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے شادی کی۔ نکاح کے وقت ان کی عمر چھ برس تھی البتہ رخصتی ۹ برس کی عمر میں شوال ۱ھ میں ہوئی۔^{۱۱} اس کم سنی کی شادی کا اصل منشاء، نبوت اور خلافت کے درمیان تعلقات کی مضبوطی تھی۔^{۱۲} آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوا کسی کنواری لڑکی سے شادی نہیں کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۱۸ برس تھی۔ آپ کا نام عائشہ، لقب صدیقہ، خطاب ام المومنین، کنیت ام عبداللہ اور لقب حمیرا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنت الصدیق سے خطاب فرمایا ہے۔ آپ فوق الفطرة حافظہ کی مالک تھیں۔ آپ کے عالمہ فاضلہ اور فصیح اللسان ہونے سے کسی کو انکار نہیں۔ پہلے تینوں خلفاء کے زمانہ میں فتویٰ دیا کرتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کرنے میں کثیر الروایت ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی فضیلت دوسری عورتوں پر ایسی ہے جیسے تریڈ (گوشت روٹی) کی فضیلت اور کھانوں پر۔^{۱۳} ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یہ نوید سنائی کہ جبریل انہیں سلام دیتے ہیں۔^{۱۴} علامہ حافظ ابن قیم رقمطراز ہیں:^{۱۵}

”حضور اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ساتھ نہایت محبت اور حسن سلوک کا معاملہ کرتے تھے۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس انصار کی لڑکیاں جمع ہوتیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ان کے ساتھ کھینے کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ اگر وہ کسی ایسی بات کی خواہش کرتیں جس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو تو ان کی خواہش پوری کر دیتے تھے۔ وہ جس برتن سے پانی پیتیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس برتن سے ان کے منہ لگانے کی جگہ منہ لگا کر پانی پی

لیتے۔ جس ہڈی کو وہ چوستیں، اس ہڈی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی لے کر چوستے۔“^{۱۷} ایک مرتبہ عید کے روز حبشہ کے ایک قبیلے بنی ارفدہ کے حبشی مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈھالوں اور برچیوں سے اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا اس کے لیے موقع پیدا فرمایا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھے کی اوٹ سے ان کے کرتب دیکھ لیں۔^{۱۸} یہاں تک کہ جب عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھک گئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”بس۔“ انہوں نے کہا: ”ہاں۔“ ارشاد ہوا تو جاؤ۔^{۱۸}

حافظ ابن قیم لکھتے ہیں: ”دو مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر کے موقع پر ان کے ساتھ دوڑے بھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا سلوک کرنے والا ہو۔“^{۱۹}

جو حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کو کر کے دکھایا۔ جو کچھ قرآن حکیم میں تھا وہ سب مجسم ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نظر آیا۔ ایک دفعہ چند افراد عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ”یا ام المومنین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور معمولات بیان فرمائیے۔“ مخدومہ جہاں رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جواب دیا: ”کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ہے؟ کان خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق ہمہ تن قرآن تھا۔“ پھر دریافت کیا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت شبانہ کا کیا طریقہ تھا؟“ فرمایا: ”کیا تم نے سورۃ منزل نہیں پڑھی؟“^{۲۰} قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ^{۲۱}

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝ ”اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔“ ایک دفعہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سونے کے کنگن پہنے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتروادیئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی کو یہ زیبا نہیں۔ فرماتے تھے کہ ”انسان کے لیے دنیا میں اتنا ہی کافی ہے جس قدر ایک مسافر کو زادراہ۔“^{۲۲} ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کوئی تقریب تھی مگر کوئی سامان نہ تھا۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاں جو کچھ بھی تھا وہ ان کو دلا دیا، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر اس وقت رات کے کھانے کو کچھ نہ تھا۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ اہل صفہ کو عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر لائے اور فرمایا: ”جو کچھ کھانے کو ہوا۔“ چونی کا پکا ہوا کھانا حاضر کیا گیا۔ وہ کافی نہ ہوا۔ کوئی اور چیز طلب کی۔ تو

چھوہارے کا حریرہ پیش ہوا۔ پھر پیالہ میں دودھ آیا۔ مگر یہی سامان مہمانی کی آخری قسط گھر میں تھی۔^{۲۳}

عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کسی کو برا بھلا کہنے کی نہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم برائی کے بدلہ میں برائی نہیں کرتے تھے بلکہ معاف فرما دیتے تھے۔“^{۲۴} واقعہ اُفک رونما ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تک عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بات نہیں کی جب تک خود اللہ تعالیٰ نے ان کی بے گناہی کی شہادت نہ دے دی۔^{۲۵} ان آیات کے نزول سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان آسودہ ہوئے اور منافقین کا یہ حربہ ناکام ہوا۔ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً ۲۸ برس بعد ۵۷ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت گھر میں تھوڑے سے جو کے سوا کچھ بھی نہ تھا اور چند سیر جو کے بدلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زرہ ایک یہودی کے یہاں رہن رکھی پڑی تھی۔ اسی طرح مرض الموت میں یاد آیا کہ کچھ اشرفیاں گھر میں پڑی ہیں۔ حکم دیا کہ ”انہیں خیرات کر دو۔ کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے رب سے اس طرح ملے گا کہ اس کے پیچھے اس کے گھر میں اشرفیاں پڑی ہوں۔“^{۲۶} آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے صرف ایک نقرہ خچر چھوڑا جس پر سوار ہوا کرتے تھے اور ہتھیار چھوڑے۔ اور کچھ زمین (خیبر اور فدک میں) چھوڑی جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں ہی مسلمانوں کے لیے وقف کر گئے تھے۔^{۲۷}

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کرتے تھے کہ ”فرزند آدم علیہ السلام کو ان چند چیزوں کے سوا اور کسی چیز کا حق نہیں رہنے کو جھونپڑا، تن ڈھانکنے کو ایک کپڑا، پیٹ بھرنے کو کبھی سوکھی روٹی اور پانی۔“^{۲۸}

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد محض الفاظ کی حد تک ہی محدود نہ تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی مکمل طور پر اس کی عکاسی کرتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رہائش ایک حجرہ میں تھی جس کی وسعت چھ سات ہاتھ سے زیادہ نہ تھی۔ دیواریں کچی تھیں اور چھت کھجور کے پتوں اور اونٹ کے بالوں کی تھی۔ بلندی اتنی تھی کہ آدمی کھڑا ہوتا تو چھت تک پہنچ جاتا۔ دروازہ میں ایک پٹ کا کواڑ تھا۔^{۲۹} لیکن وہ عمر بھر کبھی بند نہ ہوا۔ پردہ کے طور پر ایک

کبیل پڑا رہتا تھا۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: پانی ہوتا البتہ کہیں سے کچھ تھوڑا سا گوشت آجاتا (تو اس کو بھی کھا لیتے)۔^{۳۱} ایک روز چند صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فاقہ کی شکایت کی اور پیٹ کھول کر دکھائے کہ ان پر ایک پتھر بندھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا شکم مبارک کھولا تو ایک کے بجائے دو پتھر بندھے تھے۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک روز فاقہ سے تھے، ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ وہ اسی وقت نخلستان سے کھجور توڑ کر لائے اور کھانے کا اہتمام کیا۔ کھانا جب سامنے آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک روٹی پر تھوڑا سا گوشت رکھ کر فرمایا کہ یہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بھجوادو، کئی روز سے اسے کھانا نصیب نہیں ہوا۔^{۳۲} ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر تشریف لائے تو افسردہ تھے۔ دریافت کرنے پر فرمایا کہ ”ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا! کل جو سات دینار آئے تھے، شام ہو گئی اور وہ بستر پر پڑے رہ گئے۔“

حفصہ بنت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شادی حمیس بن حذافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوئی تھی۔ دونوں نے مدینہ کو ہجرت کی۔ غزوہ بدر میں لگنے والے زخموں کی تاب نہ لا کر حمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہو گئے۔ ان دونوں کی کوئی اولاد نہ تھی۔ حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ۳ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔ تھوڑی سی تیز مزاج تھیں۔ واقعہ ایلاء کے متعلق عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ان کو ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مغایر کی بو آنے کے متعلق کہنے کو کہا تھا۔ اس طرح ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ام المومنین صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ حفصہ نے مجھے یہودی کی دختر ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ آپ نے فرمایا: ”تم نبی کی بیٹی ہو، تمہارا چچا پیغمبر ہے اور پیغمبر کے نکاح میں ہو۔ حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تم پر کس بات میں فخر کر سکتی ہے؟“^{۳۳}

عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دختران ہونے کی بنا پر باقی ازدواج کے مقابلہ میں، باہم ایک خیال کرتی تھیں۔ لیکن کبھی کبھی خود بھی باہم رشک کا ظہار کر دیا کرتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوران سفر راتوں کو عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اونٹ پر ملتے تھے اور ان

سے ہم کلام رہتے تھے۔ ایک دفعہ ایک روز حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا کہ رات کو تم میرے اونٹ پر اور میں تمہارے اونٹ پر سوار ہو جاؤں گی تاکہ مختلف مناظر دیکھنے میں آئیں۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا راضی ہو گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا والے اونٹ کے پاس آئے جس پر حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سوار تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلام کر کے بیٹھ گئے۔ جب منزل پر پہنچے تو عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں پایا تو اپنے پاؤں اذخر نامی گھاس کے درمیان لٹکا کر کہنے لگیں کہ اے اللہ میں ان کو تو کچھ نہیں کہہ سکتی تو کسی بچھو یا سانپ کو متعین کر جو مجھے ڈس جائے۔^{۳۳} حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خلافت کے دوران میں ۴۵ھ میں وفات پائی۔

ام المومنین زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا پہلے عبداللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ انہوں نے غزوہ احد میں شہادت پائی۔ اسی سال (۳ھ) میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے شادی کی۔ اپنی فیاضی کی وجہ سے ام المساکین کہلاتی تھیں۔ شادی کے دو تین ماہ بعد رحلت فرمائی۔

ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نام ہند تھا۔ عبداللہ بن عبدالاسد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں تھیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رضاعی بھائی تھے۔ حبشہ کی طرف دونوں میاں بیوی نے ہجرت کی۔ عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بدر و احد دونوں غزوات میں شرکت کی۔ غزوہ احد میں لگنے والے زخموں سے جانبر نہ ہو سکے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ۵ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے نکاح کیا۔ اغلب ہے کہ انہوں نے ۶ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۴ برس تھی۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بعد فضل و کمال میں انہی کا درجہ تھا۔ ان کی ذہانت کا مظاہرہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ہوا جب مسلمان صلح کی ناگوار شرائط کے پیش نظر مکہ سے باہر قربانی کرنے میں تامل کر رہے تھے تو ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تدبیر سے ہی یہ مشکل حل ہوئی۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: ”مسلمانوں کے دل غمگین ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود باہر نکل کر سر منڈائیے اور قربانی کیجیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ کر سب ایسا ہی کرنے لگیں گے۔“ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ۳۴ھ اس سے

معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امہات المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اہم امور پر مشورہ فرماتے تھے۔

جب مسلمانوں نے بنو مصطلق کو زیر کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے سردار حارث بن فرار کی صاحبزادی جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ۵ھ میں شادی کی۔ وہ پہلے مسافع بن صفوان سے بیاہی ہوئی تھیں جو غزوہ مرسیع میں قتل ہوا۔ قیدیوں میں جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ اس پر تمام مسلمانوں نے اپنے اپنے حصہ کے تمام لونڈی اور غلام بھی آزاد کر دیئے۔ (ان کی تعداد سات سو بتائی جاتی ہے) کیونکہ اب وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرابتدار بن گئے تھے۔^{۳۵} جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ۶۵ برس کی عمر میں ۵۰ھ میں وفات پائی۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مساوات اور اخوت کی عملی مثال اپنے غلام زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو متبنی بنا کر پیش کی اور پھر اپنی پھوپھی زاد بہن زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ان سے بیاہ دیا۔ لیکن ان دونوں کا نباہ نہ ہو سکا اور نوبت طلاق تک جا پہنچی۔ کچھ عرصہ بعد ۵ھ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے خود شادی کر لی۔ اس پر کفار نے شور کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی رچالی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ یہ محض ایک لفظی رشتہ تھا جس کو واقعیت سے کوئی تعلق نہ تھا۔^{۳۶} حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس شادی سے تبنی کی اس جاہلانہ رسم سے نجات ملی اور عربوں کی بہت سی خاندانی رقابتوں اور خرابیوں پر ضرب پڑی۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی کسی وحی کو چھپا سکتے تو اس آیت کو ضرور چھپا دیتے (جس میں اس نکاح کا ذکر ہے)^{۳۷} تاکہ کفار کو طعن و تشنیع کا موقع نہ ملے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا نہیں کیا اور یہی اس بات کی بین دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ کا کوئی پہلو بھی تاریک نہیں رہا۔ نیز ارشاد باری ہے:^{۳۸}

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۗ وَإِنْ لَمْ نَفْعَلْ مِمَّا
بَلَّغْتَ رِسَالَةَ ۗ

”اے پیغمبر جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں

تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔“

جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو نکاح کی پیشکش کی تو فرمایا: ”میں بغیر استخارہ کے کوئی رائے قائم نہیں کرتی۔“ واقعہ افک کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب ان کی رائے دریافت کی تو فرمایا: مَا عَلِمْتُ فِيهَا إِلَّا خَيْرًا ط یعنی ”مجھ کو عائشہ کی بھلائی کے سوا کسی چیز کا علم نہیں۔“ حالانکہ ان کی ہمیشہ حمنہ اس اتہام میں شریک تھیں۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اس احساس کو ہمیشہ ہی یاد رکھا۔^{۳۹} زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نہایت قانع اور فیاض طبع تھیں۔ خود اپنے دست و بازو سے معاش پیدا کرتی تھیں اور خیرات کر دیتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا تھا کہ:

اسر عكن لحاجاتى اطول لكن يدا.

”تم میں مجھ سے جلد وہ ملے گی جس کا ہاتھ لمبا ہوگا۔“

اس پر تمام اپنے ہاتھ ناپا کرتی تھیں حالانکہ یہ فیاضی کی طرف اشارہ تھا۔ چنانچہ ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں سب سے پہلے ۲۰ھ میں ۵۳ برس کی عمر میں زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے انتقال کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شادی کے وقت ان کی عمر ۳۵ برس تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف وقتوں میں نو شادیاں کیں لیکن ہر شادی کے پیچھے کوئی نہ کوئی مصلحت کارفرما ہوتی تھی۔ صلح حدیبیہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ خواہش تھی کہ قریش کے ساتھ راہ و رسم پیدا ہوں۔ ۶ھ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے شادی کی اور اس طرح ابوسفیان کے داماد ہوئے۔ ان کا نام رملہ تھا اور کنیت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھی۔ انہوں نے اپنے شوہر عبداللہ بن جحش کے ساتھ حبشہ ہجرت کی تھی۔ بعد میں ان کا شوہر مرتد ہو کر وہیں فوت ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس شادی سے خیال تھا کہ یہ رشتہ مکہ میں ان کے سب سے بڑے دشمن ابوسفیان کی خصومت میں کمی کا باعث ہوگا۔ فی الواقعہ اس شادی نے اہل مکہ کے مشرف بہ اسلام ہونے میں ایک موثر کردار ادا کیا۔ انہوں نے ۴۴ھ (بعض کے نزدیک ۵۹ھ یا ۵۰ھ یا ۵۵ھ ہے) میں وفات پائی۔

میمونہ بنت الحارث رضی اللہ تعالیٰ عنہا عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہمیشہ نسبتی تھیں۔ ان

کی آٹھ بہنیں تھیں اور تمام کی تمام مکہ کے سرکردہ افراد کے ساتھ بیاہی ہوئی تھیں۔ میمونہ پہلے ابو رہم بن عبدالعزی کے نکاح میں تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد ۷ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرابتداری کے دائرہ میں وسعت پیدا ہوئی۔ وہ خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی پھوپھی تھیں۔ اس شادی کے بعد ہی وہ اسلام لائے۔ صلح حدیبیہ کی رو سے مدینہ اٹھ آنے والوں کو مسلمان واپس کرنے کے مکلف تھے لیکن خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ایسا مطالبہ کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ۵۱ھ میں وفات پائی۔

جب مسلمانوں نے خیبر فتح کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں اور یہودیوں کی بہبود اور باہمی تعلقات کی استواری کے خیال سے خیبر کے سردار حنی بن اخطب کی دختر صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ۷ھ میں شادی کی۔ ان کا اصلی نام زینب تھا۔ ان کا باپ بنی نضیر کا سردار اور ماں بنی قریظہ کی سردار کی بیٹی تھی۔ صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شادی پہلے سلام بن مشکم القرظی سے ہوئی تھی۔ طلاق کے بعد کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں آئیں۔ وہ خیبر کی لڑائی میں قتل ہوا۔ باپ اور بھائی بھی کام آئے اور یہ گرفتار ہوئیں۔ ایک بار زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ان کو یہودیہ کہہ دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو ماہ تک ان کے پاس نہیں گئے۔ آخر عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی کوششوں سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ انہیں روتے دیکھا کیونکہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا کہنا تھا کہ ”ہم تمام ازواج میں افضل ہیں کیونکہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چچا زاد بہن بھی ہیں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ”تم نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ ہارون علیہ السلام میرے باپ، موسیٰ علیہ السلام، میرے چچا اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے شوہر ہیں۔ اس لیے تم لوگ کیونکر مجھ سے افضل ہو سکتی ہو۔“^{۱۱} صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ۵۰ھ میں وفات پائی۔

سیدہ عالم فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب ترین اولاد تھیں۔ وہ جب کبھی آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر کھڑے ہو جاتے اور فرط محبت سے ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے اور اپنی نشست گاہ سے ہٹ کر اپنی جگہ بٹھاتے^{۱۲} جب آپ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کبھی سفر پر روانہ ہوتے تو سب سے آخر میں فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس جاتے اور واپسی پر وہ سب سے پہلے شرف باریابی چاہنے والوں میں ہوتیں۔ ان کی عسرت اور تنگدستی کا یہ عالم تھا کہ چکی پیٹے پیٹے ان کی ہتھیلیوں پر نشانات پڑ گئے تھے اس طرح مشک میں پانی بھر کر لانے سے ان کے سینے پر نیل کے داغ پڑ گئے تھے۔ ایک روز انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک خادمہ کی خواہش ظاہر کی۔

فرمایا: ”اے فاطمہ! بدر کے یتیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں۔“

پھر فرمایا: ”لوٹدی غلام جو تم چاہتے ہو اس سے بہتر بات میں تم کو بتلاؤں تم سونے سے قبل ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۲ بار اللہ اکبر پڑھو۔ یہ لوٹدی غلام سے تمہارے لیے بہتر ہے۔“^{۲۴}

اسی طرح ایک دفعہ علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک طلائی ہار فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب ان کو یہ ہار پہنے دیکھا تو فرمایا:

”اے فاطمہ! تم کیا لوگوں سے یہ کہلوانا چاہتی ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی گلے میں آگ کا طوق ڈالے ہے۔“

فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اسی وقت وہ ہار فروخت کر ڈالا اور حاصل کردہ رقم سے ایک غلام خرید کر آزاد کیا۔

اسی طرح ایک دفعہ انہوں نے اپنے دونوں صاحب زادوں (حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے لیے چاندی کے کنگن بنوائے اور دروازے پر لٹکائے۔ انہی دنوں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی غزوہ پر تشریف لے گئے تھے۔ جب واپس آئے تو خلاف معمول فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر تشریف لے گئے۔ وہ زیرک تھیں سمجھ گئیں اور فوراً پردوں کو چاک کر ڈالا^{۲۵} اور صاحب زادوں کے ہاتھوں سے کنگن اتار دیئے۔ وہ روتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کنگن لے کر بازار بھیج دیئے کہ ان کے بدلے ہاتھی دانت کے کنگن لا دو۔^{۲۶}

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچوں سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو چومتے اور پیار کرتے۔ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ (انہوں نے دس برس تک

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کی) فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر اپنے اہل و عیال کو چاہنے والا کوئی اور نہ تھا۔ لوگ اس درجہ محبت پر حیران ہوتے۔

ایک بار اقرع بن حابس تمیمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھا تو کہا:

”میرے دس بچے ہیں لیکن میں نے انہیں کبھی نہیں چوما۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔“

اسی طرح ایک بار ایک شخص نے کہا:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے بچوں سے پیار کرتے ہیں، ہم تو اپنے بچوں کو کبھی پیار نہیں کرتے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا:

”اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے شفقت و محبت چھین لی ہے تو کوئی اور اس کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔“

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی نواسی امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو کندھے پر اتار دیتے، پھر کھڑے ہوتے تو چڑھا لیتے۔ اسی طرح پوری نماز ادا فرمائی۔^{۴۸}

ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کچھ تحائف ملے جن میں ایک زریں ہار بھی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”یہ میں اپنی محبوب ترین اہل کو دوں گا اسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی کسن نواسی امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی صاحب زادی) کو بلا کر ان کے گلے میں ڈال دیا۔“^{۴۹}

اسی طرح ایک دفعہ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوش مبارک پر سوار تھے۔

کسی نے کہا: ”کیا سواری ہاتھ آئی ہے۔“

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”سوار بھی کیسا ہے؟“^{۵۰}

جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچوں کو دیکھتے تو ان کو سلام کہتے اور اگر مناسب سمجھتے تو ان کے ساتھ مل کر کھیلتے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جو مشن باہر ہوتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے لے کر گھر میں داخل ہوتے تھے۔ بیوی سے بڑھ کر انسان کی باطنی کمزوریوں سے کوئی دوسرا واقف نہیں ہوتا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ محترمہ ہی لائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین کی تبلیغ کا کام خاندان کے ساتھ ہر قسم کے روابط قائم رکھتے ہوئے کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گوتم بدھ کی طرح بیوی اور بچوں کے فرائض سے آنکھیں موندھ کر ویرانوں کا رخ نہیں کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاندان اور معاشرے سے پیوستہ رہ کر حقوق اللہ اور حقوق العباد کا پرچار کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذاتی آرام سے زیادہ اس بات کے لیے فکر مند رہتے کہ گھر والے اپنی آخرت کی ذمہ داریوں کی طرف سے غافل نہ ہونے پائیں۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ جب گھر تشریف لاتے تو کسی قدر بلند آواز میں یہ الفاظ دہراتے: ^{۱۵}

لو كان لابن ادم واديان من قال لا بتغى واديا ثالثا ولا يملاء فيه
الالتراب وما جعلنا المال الا لاقام الصلوة وابتاء الزكوة ويتوب
الله على من تاب.

”آدم علیہ السلام کے بیٹے کی ملکیت میں اگر دولت و مال سے بھرے ہوئے دو میدان ہوں تو وہ تیسرے کی حرص کرے گا۔ اس کی حرص کے منہ کو صرف مٹی بھر سکتی ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے دولت تو اپنی یاد دلانے اور مسکینوں کی مدد کے لیے پیدا کی ہے۔ جو اللہ کی طرف لوٹے تو اللہ بھی اس کی طرف لوٹے گا۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخدوم و ممتاز بن کر نہ رہتے تھے بلکہ گھر کے کام میں ازواج مطہرات کا ہاتھ بٹاتے۔ گھر میں خود جھاڑو دیتے، کپڑوں میں پیوند خود لگاتے، بکری کا دودھ دوہ لیتے، اپنی نعلین مبارک کو سی لیتے اور غلام کے ساتھ مل کر آٹا گوندھ لیتے۔ گھر تشریف

لاتے تو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ مسکراتے ہوئے داخل ہوتے۔ ازواج سے سخت درشت لہجہ میں بات نہ کرتے۔ اگر کسی کی کوئی بات ناگوار محسوس ہوتی تو التفات میں کمی فرما لیتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے متعلق ہم یہ کہیں کہ وہ قابل تقلید نہیں ہے۔ جہاں تک اہل بیت کی ضروریات کا تعلق ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بس اسی قدر اہتمام فرماتے تھے جو اپنی اور ان کی اشد ضرورت کے لیے کافی ہو۔ اس سے زیادہ کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی خواہش فرمائی نہ کوشش کی۔ جو دو سخا کا یہ عالم تھا کہ اس قلیل معاش میں سے بھی اکثر انفاق فی سبیل اللہ فرماتے اور اپنے ضروریات سے اس حد تک قطع نظر کر لیتے کہ بسا اوقات فاقوں کی نوبت آ جاتی۔ ۷ھ میں خیبر کی فتح کے بعد یہودیوں کے نخلستان مسلمانوں کو ملنے کے بعد ان کی پیداوار میں سے امہات المؤمنین کو ہر فصل پر فی کس ۸۰ وسق کھجور اور ۲۰ وسق جو ملنے لگے (وسق ۶۰ صاع یعنی سواد دوسیر کے برابر ہوتا ہے)۔ گھر کے مصارف کا انتظام بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تحویل میں تھا۔ وہ حسب ضرورت قرض ہی لے لیتے اور جب کوئی صورت بنتی تو قرض ادا کر دیتے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

خَيْرَ كُمْ لَا يَعْطَلُهُ وَاَنَا خَيْرُكُمْ لَا عَيْبِي.

”تم میں اچھا وہ ہے جو اپنی بیوی کے لیے سب سے اچھا ہو اور میں اپنی بیویوں کے لیے تم سب سے اچھا ہوں۔“

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عائلی زندگی ایک ہموار اور مثالی زندگی تھی۔ ایک پرسکون ماحول تھا جس میں ہر شے اپنی فطری حدود میں تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ازواج مطہرات پر حد درجہ اعتماد فرماتے تھے اور ان کو اپنے ہر قسم کے راز میں شامل فرماتے تھے اگر کبھی کسی زوجہ محترمہ سے اس راز کی امانت میں کوئی کوتاہی ہو جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو ایک خاص انداز میں سرزنش فرماتے یعنی اس طرح کہ مخاطب بات بھی سمجھ جائے اور اس کی طبیعت پر کچھ زیادہ گراں بھی نہ گزرے۔ ایک مرتبہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ ”یہ عیب کیا کم ہے کہ ان کا قد چھوٹا ہے۔“

اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

”عائشہ تم نے ایک ایسی بات زبان سے نکال دی ہے کہ اگر وہ سمندر میں ملا دی جائے تو اس کی کڑواہٹ اس کو بھی تلخ کر کے رکھ دے۔“

اگر کوئی اہلیہ محترمہ جائز حدود کے اندر رہتے ہوئی اپنی خودداری کا مظاہرہ کرتی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی دلداری فرماتے:

اگر کسی کو کوئی تحفہ بھیجنا ہوتا تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر باری کے اندر بھیجتا۔ دوسری بیویاں ایسا نہ چاہتی تھیں اس لیے انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ جس کسی کو تحفہ بھیجنا ہو وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی خاص بیوی کے گھر قیام کی تخصیص نہ کرے اور وہ بھیج دے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی اس بات کا کوئی نوٹس نہ لیا لیکن ان کے تیسری دفعہ عرض کرنے پر فرمایا کہ میں جب عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس ہوتا ہوں تو اس وقت ہی میرے پاس وحی آتی ہے جب کہ کسی اور کے ہاں قیام میں تو نہیں آتی۔^{۵۳} اسی حوالے سے چند ازواج مطہرات نے فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اپنا سفیر بنا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیجا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”کیا تم اس کو نہیں چاہتیں جس کو میں چاہتا ہوں۔“

چنانچہ وہ واپس چلی گئیں۔ ازواج نے پھر دوبارہ بھیجنا چاہا مگر وہ راضی نہ ہوئیں۔^{۵۴}

اب اس کام کے لیے زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو منتخب کیا گیا کیونکہ ان کو عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ہمسری کا دعویٰ تھا۔ انہوں نے اپنا موقف زوردار طریقے سے پیش کیا کہ عائشہ اس رتبہ کی مستحق نہیں ہیں۔ جب وہ اپنا موقف پیش کر چکیں تو حضور نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو جواب آں غزل کہنے کو فرمایا: ان کے استدلال سے زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا لا جواب ہو گئیں۔

اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”کیوں نہ ہو، ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی ہے۔“

نماز عصر پڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ تمام ازواج مطہرات کے ہاں جاتے، تھوڑی دیر ٹھہرتے اور آخر میں جن کی باری ہوتی تھی وہاں شب بھر قیام فرماتے۔ ابتدا

ام سلمہ سے ہوتی تھی۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ جن کی باری ہوتی تھی وہیں پر تمام ازدواج مطہرات آجاتی تھیں اور دیر تک محفل رہتی۔ کچھ رات گئے، سب رخصت ہو جاتی تھیں۔ بشری تقاضا کے تحت کبھی کبھی ان میں منافقت کا اظہار بھی ہو جاتا تھا لیکن اس میں کسی طرح کی بدورت شامل نہیں ہوتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب کی خاطر داری مقصود تھی۔

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاں تشریف فرما تھے کہ صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کھانا پکا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیجا (وہ کھانا پکانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں)۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے خادمہ کے ہاتھ سے پیالہ چھین کر زمین پر دے مارا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیالے کے ٹکڑے چن چن کر یکجا کیے اور ان کو جوڑا۔ پھر دوسرا پیالہ منگوا کر واپس کیا۔^{۵۵} بدلا دلوانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے فعل کو گوارا فرمایا ہے۔ ایسے معمولی خفیف معاملات میں ایسی دقیق دعائیں کرنا غایت درجہ کی شفقت کی دلیل ہے۔ اسی طرح ایک دفعہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ذرا برہم ہو کر بلند آواز میں گویا تھیں کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آگئے۔ انہوں نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو تھپڑ مارنا چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آڑے آگئے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ غصہ میں چلے گئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا:

”کیوں؟ کس طرح تم کو بچالیا۔“^{۵۶}

چند روز بعد ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے تو صورت حال مختلف دیکھ کر بولے

کہ: ”مجھے بھی صلح میں شریک کر لیجئے جیسا کہ اس روز میں نے لڑائی میں شرکت کی تھی۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”ہاں اور ہاں۔“^{۵۷}

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقع پر عائشہ سے فرمایا: ”تو مجھ سے جب ناراض

ہوتی ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں۔“

ان کے استفسار پر بتایا:

”جب تو خوش رہتی ہے اور کسی بات پر قسم کھانی ہو تو یوں قسم اٹھاتی ہے۔“

”محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خدا کی قسم! اور جب ناراض ہو جاتی ہو تو کہتی ہو ابراہیم علیہ السلام کے خدا کی قسم!“

اس پر عائشہ رضی اللہ تعالیٰ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا: ”ہاں! یا رسول اللہ! میں صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام چھوڑ دیتی ہوں۔“ ۵۸

ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے تیز قدمی میں مقابلہ کرنے کو فرمایا: وہ نازک اندام تھیں، آگے نکل گئیں۔ چند سال بعد وہ مزید اندام ہو گئیں تو پھر مسابقت کی نوبت آئی۔ اب کے وہ پیچھے رہ گئیں۔

آپ نے فرمایا: ”یہ اس دن کا جواب ہے۔“

۹ھ میں ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس معمول سے زیادہ بیٹھے جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس کہیں سے شہد آ گیا تھا۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کیا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت مرغوب تھا۔ اس طرح سے اسے نوش فرمانے کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو رشک ہو۔ انہوں نے (بشیرت کے اقتضا کی وجہ سے) حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے پاس آئیں تو کہنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ سے مغایر (پھول جس سے شہد کی لکھیاں رس چوستی ہیں) کی بو آتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قسم کھائی کہ آئندہ میں شہد نہ کھاؤں گا۔ ۶۰ اس پر ارشاد باری ہوا: ۱۱

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي فَرُصَاتٍ أَرْوَا جَكَ
وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

”اے نبی، تم کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہے؟ (کیا اس لیے کہ) تم اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو؟ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔“

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مثالی عائلی زندگی میں منافقین کی بیویاں تلاطم پیدا کرنے کے درپے رہتی تھیں اور امہات المؤمنین کو بہکانے کی کوشش کرتی تھیں کہ تم اس عسرت زدہ زندگی کو خیر باد کہہ دو، کئی عظیم المرتبت سردار تم سے رشتہ مناکحت باندھنے کو تیار ہیں۔ امہات

المومنین پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات کی طرح ان کو بھی زخارف دنیوی کا خوگر نہیں بنایا تھا۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

ما کانت لاحدانا الا ثواب واحد.

”ہم تمام بیبیوں کے پاس صرف ایک ایک جوڑا کپڑا تھا۔“

ایک دفعہ بشری تقاضوں کے پیش نظر تمام ازواج مطہرات نے اچھے کھانے اور اچھے لباس کی خواہش ظاہر کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سکون خاطر میں یہ تنگی طلبی اس قدر خلل انداز ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عہد فرمایا: کہ ایک ماہ تک ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے نہ ملیں گے۔ مشہور یہ ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام ازواج کو طلاق دے دی ہے۔

یہ عرصہ ایلاء کہلاتا ہے۔^{۱۱} ایک ماہ پورا ہونے کے (یہ مہینہ ۲۹ دن کا تھا) بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالا خانہ سے اتر کر عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے عرض کیا:

”یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا تھا: کہ ایک ماہ تک ہمارے حجروں میں نہ آئیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دن پہلے کیونکر تشریف لائے؟“
فرمایا: عائشہ مہینہ ۲۹ دن کا بھی ہوتا ہے۔“^{۱۲}

اس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دونوں کی خوش مزاجی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے امہات المومنین کو شیطانی پروپیگنڈے اور دنیا کی دلفریبیوں سے محفوظ رکھا۔ جب سورۃ الاحزاب کی آیات ۲۸، ۲۹ نازل ہوئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور پھر یکے بعد دیگرے ہر زوجہ محترمہ سے یہی سوال کیا کہ: ^{۱۳} اگر وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قطع تعلق کرنا چاہتی اور دنیوی آسائش کو ترجیح دینا چاہیں تو ایسا کرنے میں آزاد ہیں۔ لیکن سب نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور دنیاوی سکھ و آرام کے مقابلے آخرت کی زندگی کو ترجیح دی ہے۔

بولائے تو کہ گر بندہ خریشم خوانی

از سفر خواجگی کون و مکان برخیزم

ان آیات میں ارشاد ربانی ملاحظہ فرمائیے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لَأَزُوجِكُمْ إِن كُنْتُمْ تُرِيدُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا
فَتَعَالَيْنَ أُمْتَعُكُنَّ وَأُسْرِفُكُنَّ سَرَاخًا جَمِيلًا ۝ وَإِن كُنْتُمْ تُرِيدُونَ اللَّهَ
وَرَسُولَهُ وَالذَّارُ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنِينَ أَجْرًا
عَظِيمًا ۝

”اے نبی! اپنی بیویوں سے کہو اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکو کار ہیں اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔“

پھر اللہ تبارک تعالیٰ نے امہات المؤمنینؓ کو ان کے عظیم منصب کے متعلق یاد دلایا۔ ۶۵

يُنِسَاءَ النَّبِيِّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ إِن فَلَاحُ تَحْضَعْنَ اتَّقِيَنَّ بِالْقَوْلِ فَيَطْع
الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝ وَ قَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا
تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ
اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۝ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ
وَيُطَهِّرَكُم تَطْهِيرًا ۝ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ
وَالْحِكْمَةِ ط إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا ۝

”نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا بتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے، بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔ اپنے گھر میں ٹک کر رہو اور سابق دور جاہلیت کی سی سچ دھج نہ دکھاتی پھرو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گندگی کو دور کرے اور اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے۔ یاد رکھو اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں۔ بے

شک اللہ لطیف اور باخبر ہے۔“

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ازدواجی تعلقات حسن معاشرت اور اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے جن میں درج ذیل خصوصیات بدرجہ اتم نظر آتی ہیں:

۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیویوں کے پاس رہنے میں عدل فرماتے تھے؛ سفر کے لیے اپنی ساتھی بیوی کا انتخاب بذریعہ قرعہ فرماتے۔^{۶۶}

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ازواج مطہرات میں وقت کو عدل و انصاف سے تقسیم فرماتے تھے۔ رحلت سے قبل ناسازی طبع میں بھی پانچ روز تک باری باری ایک ایک اہلیہ کے حجرہ میں تشریف لے جاتے رہے۔ مرض میں اس وقت شدت پیدا ہوئی جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ میں مقیم تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ میں قیام کی اجازت فرداً فرداً تمام ازواج مطہرات سے لی۔ اجازت ملنے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ میں اٹھ آئے۔^{۶۷} کیا ان سے بے پناہ محبت کی بنا پر تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر شوہر ایک باری میں دوسری کے گھر رہنا چاہے تو باری والی سے اجازت حاصل کرے۔ بی بی کو بھی مناسب ہے کہ ایسے امور میں شوہر کی راحت کی رعایت کرے۔

۳۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی ازواج مطہرات کی دلداری فرماتے اور ان کو اپنے رازوں کا امین بناتے۔

۴۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام بیویوں کو جائز حد تک خودداری کے اظہار کا خواہ حاصل تھا۔

۵۔ تمام بیویوں کے آپس میں تعلقات کی بنیاد محبت تھی۔ عام سوکنوں والی صورت حال نہیں تھی۔

حوالہ جات

- ۱۔ بخاری کتاب النکاح
- ۲۔ قرآن حکیم ۲۱:۳۰
- ۳۔ بخاری کتاب الوجی
- ۴۔ بخاری کتاب الوجی، کتاب التفسیر
- ۵۔ بخاری کتاب بدء الخلق، کتاب المناقب
- ۶۔ یہ پہاڑ کا ایک درہ تھا جو خاندان بنو ہاشم کا موروثی تھا۔ یہاں مسلمان قریش کے مظالم سے تنگ آ کر پناہ گزین ہوئے۔
- ۷۔ صوقعہ ایک بڑی سی اوڑھنی ہوتی تھی جسے عرب عورتیں سر پر اوڑھتی تھیں۔
- ۸۔ بخاری کتاب المناقب تاریخ طبری، ص ۱۳۴۸
- ۹۔ بخاری کتاب الادب، کتاب المناقب، مسلم فضائل خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا
- ۱۰۔ مسند ابن حنبل ج ۶، مسند عائشہ، ص ۱۱۵-۱۵۰
- ۱۱۔ بخاری کتاب المناقب، کتاب النکاح
- ۱۲۔ سیرت عائشہ، ص ۲۶، سید سلیمان ندوی
- ۱۳۔ بخاری کتاب بدء الخلق، کتاب المناقب
- ۱۴۔ بخاری کتاب المناقب
- ۱۵۔ زاد المعاد، ج ۱، ص ۳۸
- ۱۶۔ مسند ابن حنبل ج ۶، ص ۶۴، سنن ابی داؤد باب مواکلتہ الخائض
- ۱۷۔ بخاری کتاب العیدین
- ۱۸۔ ایضاً، کتاب الجہاد والسیر
- ۱۹۔ زاد المعاد، ج ۱، ص ۳۸
- ۲۰۔ ابوداؤد قیام الیل، مسند ابن حنبل، ج ۶، ص ۵۴
- ۲۱۔ قرآن حکیم ۴:۶۸
- ۲۲۔ خطبات مدراس، ص ۱۲۴، سید سلیمان ندوی
- ۲۳۔ ایضاً، ص ۱۲۵
- ۲۴۔ ایضاً، ص ۱۱۵

- ۲۵ قرآن حکیم، ۲۳: ۱۱-۲۰
- ۲۶ خطبات مدراس، ص ۱۲۲، سید سلیمان ندوی
- ۲۷ بخاری کتاب المغازی
- ۲۸ ترمذی بحوالہ خطبات مدراس، ص ۱۲۳
- ۲۹ مسند ابن خنبل و ابن سعد و ادب المفرد، بخاری باب النساء
- ۳۰ بخاری کتاب الرقاق
- ۳۱ خطبات مدراس، ص ۱۲۳-۱۲۴ سید سلیمان ندوی
- ۳۲ ترمذی، ص ۲۷۸ کتاب المناقب
- ۳۳ بخاری باب القرعہ بین النساء و کتاب النکاح
- ۳۴ بخاری کتاب الشروط
- ۳۵ ابن ہشام حصہ دوم ۳۳۵
- ۳۶ قرآن حکیم ۳۳: ۴، ۳۳: ۳۷
- ۳۷ بخاری کتاب التوحید، مسند ابن خنبل، ج ۶، ص ۲۳۳
- ۳۸ قرآن حکیم ۵: ۶۷
- ۳۹ بخاری قصہ افک
- ۴۰ مسند ابن خنبل، ج ۶، ص ۹۵
- ۴۱ سیرۃ النبیؐ، ج ۲، ص ۲۳۸، علامہ شبلی نعمانی
- ۴۲ ایضاً، ص ۲۳۵
- ۴۳ ابوداؤد
- ۴۴ بخاری کتاب النفقات
- ۴۵ بخاری کتاب الشہادات
- ۴۶ سیرۃ النبیؐ، ج ۲، ص ۲۳۵، علامہ شبلی نعمانی
- ۴۷ بخاری و مسلم کتاب الادب
- ۴۸ بخاری کتاب الادب، نسائی باب ادخال الصبیان فی المساجد
- ۴۹ مسند ابن خنبل، ج ۶، ص ۱۰۱
- ۵۰ مسلم، ج ۲، ص ۲۹۱
- ۵۱ مسند ابن خنبل، ج ۶، ص ۵۵
- ۵۲ بخاری، باب حسن المعاشرہ

۵۳ بخاری کتاب المناقب

۵۴ بخاری کتاب البیہ

۵۵ بخاری۔ کتاب النکاح میں یہ روایت ازواج کے ناموں کے بغیر ہے جب کہ نسائی میں کسی قدر اختلاف سے یہ روایت درج ہے۔ بحوالہ سیرۃ النبیؐ، ج ۲، ص ۲۵۶، علامہ شبلی نعمانی

۵۶ ابوداؤد کتاب الادب، باب ماجاء فی المزاح

۵۷ ایضاً

۵۸ بخاری باب ما نجد من الجران

۵۹ سنن ابی داؤد باب السبق

۶۰ بخاری کتاب الطلاق

۶۱ قرآن حکیم ۱:۶۶

۶۲ ایلاء کے معنی ہیں کچھ مدت تک بغیر طلاق کے علیحدگی۔ حجرہ سے متصل ایک بالا خانہ تھا جس کو مشربہ کہتے تھے ۹ھ میں ایلاء کے ایام میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی بالا خانہ پر ایک ماہ قیام فرمایا تھا۔

(ابوداؤد، وصلاة اللعام قاعدا)

۶۳ بخاری، کتاب النکاح، باب الفرقہ

۶۴ بخاری کتاب التفسیر

۶۵ قرآن حکیم ۳۳:۳۲-۳۴

۶۶ بخاری کتاب الجہاد والسیر

۶۷ بخاری کتاب المغازی

انقلاب نبویؐ

انقلاب قدیم معاشرے کی ناکامی کے باعث رونما ہوتے ہیں۔ دنیا میں اس وقت تک ان گنت انقلاب رونما ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بیشتر انقلابات جزوی نوعیت کے حامل تھے۔ فی الواقعہ یہ نتیجہ انقلاب تھے کیونکہ ان سے معاشرہ حسن زندگی سے محروم ہو گیا۔ ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس کے جیکو نیز معاشرتی تبدیلی کے داعی تھے۔ انہوں نے سیاست و حکومت میں تبدیلی برپا کی۔ انہوں نے آزادی، اخوت اور مساوات کے خوش نمائندے لگائے۔ انقلاب کے نتیجہ میں یہ مقاصد حاصل نہ ہو سکے البتہ کشت و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ پہلے انقلابیوں کی طرف سے اور بعد میں خونی انقلابیوں کو گلوٹین سے قتل کر دیا گیا۔ بے شمار لوگوں کو اشتہاری قرار دیا گیا۔ ان کے لیے انقلابی عدالتیں قائم کی گئیں جن کا مقصد ان کے قضیہ کی سماعت اور سزا دیتا تھا۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں روس میں لینن کی سرکردگی میں بالشویکیوں نے انقلاب کی تیج سجائی۔ اس سے روسی معاشرے میں زبردست متشدد انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ نظام معیشت میں بھی تبدیلی آئی لیکن یہ بھی ایک نتیجہ انقلاب تھا۔ اس نے معاشرتی سطح پر کئی ایک برائیوں کا استقبال کیا لیکن ہیئت اجتماعیہ کا تزکیہ نہ کر سکا کیونکہ اس میں توحید کا فقدان تھا۔ بالآخر دسمبر ۱۹۹۱ء میں حیات و طمانیت سے محروم ہونے کی بنا پر یو ایس ایس آر کا شیرازہ بکھر گیا۔ ایک حکمران طاقت کا کیوں خواہاں ہوتا ہے؟ صرف اس لیے کہ وہ متشدد طریقے سے کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے۔ جنوری ۱۹۳۳ء میں جرمنی میں ہٹلر طوفانی سرعت کے ساتھ آیا اور اس کے افق پر چھا گیا لیکن ۱۹۴۵ء کے بعد جرمن مورخین نے اسے محض *Machter- greifung* یعنی *Seizure of power* کا نام دیا۔ کیونکہ اصل میں یہ انقلاب نہیں بلکہ فاشیت تھی۔ ۱۹۴۹ء میں ماؤزے تنگ کی قیادت میں چین میں اشتراکی انقلاب آیا لیکن حقیقت میں کوئی دیرپا تبدیلیاں رونما نہ ہو سکیں۔ ان تمام قائدین میں سے کون ایسا ہے جس کی زندگی انسانیت کی فلاح و سعادت، امن و عافیت اور محبت و اخوت کا قابل تقلید نمونہ بن سکی ہو؟

انقلاب کی دو اقسام ہوتی ہیں یعنی موضوعی اور معروضی۔ اول الذکر نفسیاتی انقلاب ہوتا ہے اور یہ فرد میں حسی، مسمی، قلبی اور نفسی طور پر مثبت تبدیلیاں لانے کا موجب بنتا ہے۔ اس سے مظلوم انسانوں کی آرزوئیں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس لیے ہم اسے حسین انقلاب بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے علی الرغم معروضی انقلاب سے مراد معاشرتی طور پر نمایاں و موثر تغیر و تبدل ہے۔ اس سے برائیوں کا قلع قمع ہوتا ہے اور عدل و احسان اور محبت و اخوت کے انوار چھا جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے تلمیحات قرآن کی رو سے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

”ہیت اجتماعیہ کے مثبت و تخلیقی اور حسین و رحمت بداماں تبدیل کلی کی خاطر اس کا اس حکیمانہ انداز میں تزکیہ کرنا کہ وہ فرعونی و ہامانی اور آزری و قارونی سرطانوں سے پاک و صاف اور اس کی نشاۃ الثانیہ اور ارتقائے کل کا آغاز ہو جائے، نیز اس کے فکر و عمل کی جہت صالحہ ہو جائے۔“

اسلام سے قبل معاشرہ رہبانیت اور مطلق العنانیت میں بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے دنیا جہالت تو ہم پرستی، جمود اور لاچارگی میں کھو گئی تھی۔ باہمی کشت و خون، تشدد و افتراق اور دوسرے گونا گوں رذائل نے اہل عرب کو تباہی کے دہانے پر لاکھڑا کیا تھا۔ ایسے بھیانک اور تاریک دور میں آفتاب رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بوقبیس کی پہاڑی سے طلوع ہوا اور اس کی نورانی کرنوں نے دیکھتے ہی دیکھتے سارے عرب کو بقعہ نور بنا دیا۔ اسلام امن، نظم، مساوات، انصاف، عدل، اخوت، باہمی مدد اور اعتماد کی تعلیمات سے مزین تھا۔ دنیا کی کایا پلٹنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور نظام نہیں ہو سکتا تھا۔ اسلام ایک زبردست انقلاب لایا جو یکسر قرآن تھا اور جس کے پیچھے محرک قوت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی سیرت طیبہ تھی۔ آپ کی پرہیزگاری، پاکیزگی قلب، عصمت و عفت، انکساری، راستبازی، تحمل، حوصلہ، صبر، اعتماد، ایمان، قناعت، جدوجہد اور خشیت الہی اس کے نمایاں پہلو تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا داعی پیغام یعنی اسلام ایک انقلاب ہے۔ یہ ہر قسم کے خداؤں چاہے وہ دولت ہو یا طاقت کو ختم کرتا ہے۔ اسلام ایک بند نظام نہیں ہے بلکہ یہ ہر دور کے انسان کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے اس کی عالمگیریت میں ہی ان مسائل کا حل موجود ہے۔

دنیا کے اندر تبدیلی پیدا کرنا آسان کام نہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انفرادی

اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں ایک حیات بخش انقلاب برپا کیا۔ یہ ہمہ گیر و کلی تھا۔ انقلاب بھی کیسا؟ جس کا مرکز و محور دل بنے۔ فکر و نظر کی آبیاری سے ان کی زندگی کا پورا عمل و آہنگ تبدیل ہو گیا۔ یہ تربیت باطنی اور ظاہر کا قرینہ تھا۔ قبیلہ اسلم کے معز بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زنا جیسا قبیح فعل سرزد ہو جاتا ہے۔ جان کس کو پیاری نہیں ہوتی لیکن آخرت کا تصور اور رب کے حضور جوابدہی کا خوف تھا جو کشاں کشاں انہیں مقتل میں لے آیا۔ وہ اسے چھپا سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے اقرار پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی طرف سے منہ پھیر لیتے۔ الغرض انہوں نے چار مرتبہ زنا کا اقرار کیا۔ تب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے واسطے سنگساری کا حکم دیا۔ بعض صحابہ کرام انہیں سزا پانے کے باوجود بھی برا کہتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہوا تو فرمایا:

”معز کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا مانگو کہ اس نے وہ توبہ کی کہ اگر وہ

کسی پوری قوم میں بانٹی جائے تو اس میں سب کی گنجائش ہو سکتی ہے۔“

اسی طرح قبیلہ عامد کی ایک حاملہ خاتون عامدیہ نے حضور کی خدمت میں آ کر خود اپنے جرم کا اقرار کیا اور سزا کی درخواست کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے وضع حمل کے بعد آنے کو کہا۔ وہ اس کے بعد آئی تو فرمایا کہ بچہ کی پرورش کر لو۔ مدت مقررہ گزرنے کے بعد وہ آئی کیونکہ اسی کا احساس گناہ ابھی بھی محو نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ وہ سنگسار کر دی گئی۔ خون کے کچھ چھینٹے خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے منہ پر پڑے تو انہوں نے اس عورت کو برا بھلا کہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہوا۔ تو فرمایا: ”خالد چپ رہو۔“ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر شاہی محصول لینے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخشا جاتا۔“

جب ہجرت کے بعد اسلامی جمعیت نے ایک امت کی شکل اختیار کی تو ہر طرح کی طبقاتی تقسیم ختم ہو گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحدت انسانی کا مہتمم بالشان تصور پیش کیا جس نے وطنیت، قومیت، عصبیت اور لسانیت وغیرہ کے بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ بقول علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ یہ ایک ایسا عظیم الشان انقلاب تھا جس نے تمام خود ساختہ قوانین، سیاسی تکلفات، بدعات اور نظام سے لبریز نظامہائے سلطنت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ

دیا۔ اس انقلاب نے نہ صرف کسریٰ و قیصر کی شخصیتوں کا خاتمہ کر دیا بلکہ خود کسرویت اور قیصریت کو صفحہ ہستی سے فنا کر دیا۔ یہی پیشین گوئی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی:

إِذَا هَلَكَ كِسْرَىٰ فَلَا كِسْرَىٰ بَعْدَهُ وَإِذَا هَلَكَ قَيْصَرٌ فَلَا قَيْصَرَ بَعْدَهُ.

”جب کسریٰ ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں اور جب قیصر ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں۔“

انسانی زندگی میں کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں اسلام کی وجہ سے حیرت انگیز تبدیلی رونما نہ ہوئی ہو۔ استعاراً ہی نہیں بلکہ فی الواقعہ شتر بان جہاں بانی کے مقام پر فائز ہو گئے۔ رہزن رہنما بن گئے جب کہ ڈاکو محافظ اور بردہ فروش یتیم پرور ہو گئے۔ اندھیروں سے اجالے طلوع ہوئے۔ عصیان و طغیان کے افق سے امن و امان اور صلح و آشتی کی سحر خندہ ہوئی۔ ایسا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آفاقی ارشاد پر عمل کر کے ہی ممکن ہوا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

المسلم من مسلم المسلمون من لسانہ دیدہ.

”یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے (دوسرے) مسلمان محفوظ رہیں۔“

اس طرح ایک جاہل اور اجڈ قوم جو تہذیب کے لفظ سے نا آشنا تھی وہ دنیا کی مہذب ترین قوم بن گئی۔

جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے

کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

”وہ لوگ جو سیاسی، معاشی اور عمرانی تاریکیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گھرے ہوئے تھے

اور کارہائے سیاہ میں تقاضر محسوس کرتے تھے وہ معلم اخلاق بن گئے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم نے ان کے اندر فکری تبدیلی پیدا کی۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت یا کوئی لالچ

ان غلامان محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہ کر سکی اور نہ انہیں اپنے

مقصد سے ہٹا سکی۔ نو مسلموں میں کمال درجہ کی استقامت پیدا ہوئی۔ خباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ

بن ارت کو مشرف بہ اسلام ہونے پر طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں۔ ایک روز دہکتے کونلوں پر ان کو لٹا دیا گیا اور ایک شخص ان کے سینے پر پاؤں رکھے رہا۔ تاکہ وہ کروٹ نہ لے سکیں۔ یہاں تک کہ کونلے ان کی پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے۔ لیکن خباب رضی اللہ تعالیٰ تعالیٰ عنہ کی استقامت میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا۔ اسی طرح بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی جلتی ریت پر لٹانے کے بعد ان کے سینے پر بھاری چٹان رکھ دی جاتی۔ گلے میں رسی باندھ کر گھسیٹا جاتا لیکن ان کی زبان سے احد احد کے الفاظ ہی نکلتے۔ خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سولی دی جانے لگی تو انہوں نے دو گانہ نفل ادا کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

اسلام معاشرے کی تربیت خشیت الہی و تصورے آخرت کی بنیاد پر کرتا ہے کیونکہ اگر انسان پر بظاہر بہت سی پابندی عائد کر دی جائیں اور اس کے باطن کو نہ بھلایا جائے تو عقل حیلہ ساز بہت سی راہیں نکال لیتی ہے۔ اسلام درحقیقت اپنے معاشرے کو اندر سے بدلتا ہے تاکہ قانون شکنی کا موقع ہی نہ آئے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سب سے زیادہ زور خشیت الہی اور تصور آخرت پر دیتا ہے۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۖ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۙ

”پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر

بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔“

ایک دفعہ ایک فاقہ زدہ فرد کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے گھر سے ماسوی پانی کے کچھ دستیاب نہ ہوا تو اسے ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے گھر لے گئے لیکن وہاں بھی محض بچوں کے لیے کھانا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی ام سلیم سے کہا کہ چراغ بجھا دو اور وہی کھانا مہمان کے سامنے رکھ دو۔ تینوں ساتھ کھانے پر بیٹھے۔ میاں بیوی بھوکے رہے اور اس طرح ہاتھ چلاتے رہے گویا کھا رہے ہوں۔ صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ تمہارے اس حسن سلوک سے بہت خوش ہوا۔“^۹

اسی بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

وَيُؤْتِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ط

”اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔“
یہ اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ ایک شب ایک ماں نے اپنی بچی کو دودھ میں پانی ملانے کو کہا: تو اس نے ماں کو یاد دلایا کہ ”عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے منع فرمایا ہے۔“
ماں نے کہا: ”عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دیکھ تو نہیں رہا۔“
تو بچی نے کیا خوب جواب دیا: ”عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہیں دیکھ رہا لیکن اس کا خدا تو دیکھ رہا ہے۔“

اسلام کا مقصد اذہان و نظریات کی تطہیر تھا اور اس تطہیر کا دائرہ کسی خاص خطہ زمین تک محدود نہ تھا بلکہ یہ آفاقی تھا اور روئے زمین کے تمام لوگوں پر محیط تھا۔ اس کے مقاصد جلیلہ میں معاشرے کو ظلم و استحصال سے نجات دلانا اور دامن زندگی کو خیر و سعادت سے معمور کرنا شامل تھے۔ معاشرتی سرطان زندگی میں لذت اور حسن پیدا ہی نہیں ہونے دیتے، یہ انسانیت کے دشمن ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کا کلی استیصال کرنا جہاد اکبر ہے تاکہ ان کی نشاۃ ثانیہ کا کوئی بھی احتمال باقی نہ رہے۔ وہ لوگ جو عبادت ربانی سے بیگانہ تھے اور اس کی لذت سے نا آشنا تھے وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے دفعتاً کیا سے کیا ہو گئے۔ اب یاد الہی ہی ان کا مقصود حیات بن گئی۔ وہ سر بسجود ہو کر اٹھنا ہی نہ چاہتے تھے۔ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قیام اور سجدہ میں اتنی دیر لگاتے تھے کہ گمان ہوتا تھا کہ وہ کچھ بھول گئے ہیں۔^{۱۱} ابو طلحہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک خوشنما چڑیا کے چہچہانے پر اس کی طرف دیکھنے لگے، جب خیال آیا تو رکعت یاد نہ رہی۔ باغ کو فتنہ خیال کرتے ہوئے اسے اللہ کی راہ میں نذر کر دیا۔^{۱۲} ان کے پیش نظر ضرور قرآن حکیم کی یہ آیت ہوگی۔^{۱۳}

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ.

”اور جان رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد حقیقت میں سامان آزمائش

ہیں۔“

خشیت الہی کا ہی یہ اثر تھا کہ ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک لڑائی کے دوران میں ایک پہاڑی پر پہرہ دینے پر متعین تھے۔ رات کا وقت تھا وہ اپنی نیند کو ٹالنے کے لیے یاد الہی میں مصروف ہو گئے۔ دشمن کی طرف سے ایک ایک کر کے تین تیر آئے اور ان کے جسم میں پیوست

ہوتے گئے لیکن انہوں نے نماز نہ توڑی۔ جب ان کا دوسرا ساتھی نیند سے بیدار ہوا تو ان کے استفسار پر کہ ان کو کیوں نہیں جگایا تو انہوں نے جواب دیا کہ جو سورۃ میں نے شروع کر رکھی تھی اسے وہ نامکمل نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔^{۱۴}

اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو خلفاء (عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی مثالیں ہیں۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر فیروز لوء لوانے مسجد نبوی میں نماز فجر کے دوران خنجر سے حملہ کیا، وہ شدید زخمی ہو کر گر پڑے لیکن مقتدی ہر چیز سے بے نیاز اللہ تعالیٰ کے حضور ایستادہ رہے۔ ابامت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کرائی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد امیر المومنینؓ کی طرف توجہ دی گئی۔^{۱۵}

اسی طرح کا واقعہ علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے وقت رونما ہوا۔ ان پر کوفہ میں نماز فجر کے دوران میں ابن ملجم نے تلوار سے حملہ کیا۔ وہ گھائل ہو کر گر پڑے لیکن مسلمانوں نے نماز جاری رکھی۔ کربلا کے میدان میں خانوادہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے افراد نماز ظہر ادا کرنے کے لیے دشمن سے مہلت مانگی۔^{۱۶}

دنیوی انقلابات لاکھوں انسانوں کی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں اور مال و اسباب کی بربادی تو قرین قیاس بھی نہیں۔ اسی طرح لاکھوں عصمتوں کو انقلاب کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انقلاب محافظ انسانیت تھا جس نے اس کو اس کی معراج تک پہنچا دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی بھی مادی انقلاب کے برعکس خون کی ہولی نہیں کھلی۔ اس میں محض چند سونفوس یا تو شہید ہوئے یا واصل جہنم ہوئے۔ مزید براں اس انقلاب میں کوئی واقعہ بھی ایسا رونما نہیں ہوا کہ کسی کے ناموس پر دست درازی ہوئی ہو۔ اس کے برعکس دیگر دنیاوی انقلابات میں تاریخ شرمندگی اور ندامت کے ایسے ان گنت واقعات سے عبارت ہے۔ آپ کی بعثت لقصہ اعلاء کلمۃ اللہ، اقامت دین، اظہار دین حق اور علی الدین کلمہ پر مشتمل تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھرپور ۲۳ برسوں کی جدوجہد مسلسل سے نظام عدل، انسانی حریت، اخوت و مساوات، علوم و فنون، بین الاقوامی تعلقات، تہذیب و تمدن، سیاست و حکومت، قانون، معاشرت اور معیشت میں احسن و اکمل تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اتنے قلیل عرصہ میں نقید المثال انقلاب کو پیدا کرنا تاریخ کا ایک اہم ترین واقعہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے اہل عرب کے اندر صدیوں کے پرورش پائے ہوئے اسباب نزاع و اختلاف کو ایک ایک کر کے رفع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے ان کی عداوتوں کے شعلے بجھا دیئے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے: ^ک

وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ^ط

”اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیئے۔“

جو لوگ مودت و محبت کے جذبہ سے عاری اور شقاوت و عداوت کے عادی تھے اور قتال و جدال کو اپنا قومی افتخار سمجھتے تھے ان کو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم ملا جس پر عمل پیرا ہو کر وہ باہم شیر و شکر ہو گئے۔ نصرت الہی کے باعث آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر ارشاد دلوں پر نقش ہوتا چلا گیا۔ اس طرح صحابہ کرام کی ایک ایسی جمعیت تیار ہو گئی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات پر عمل پیرا تھی۔ اپنی تعلیمات کو پیش کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قومی، نسلی یا جغرافیائی تعصبات کی انگلیخت سے کوئی کام نہیں لیا۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چار طریقوں کو بروئے کار لائے:

تلاوت آیات، تزکیہ نفس، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت۔ اس طرح ان میں شعور کی پختگی آئی۔ اسلام میں دیتان اور پر امن بقائے باہم کوئی گنجائش نہیں کیونکہ دین ہر صورت میں غالب ہوتا ہے۔ اسی لیے اسلام میں مکمل بندگی کا تصور پایا جاتا ہے۔ تاکہ بندگان خدا اسلامی تعلیمات سے متصف ہو کر دنیا میں اس کے نظام کا بول بالا کریں۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے: ^{۱۸}

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ.

”اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ

اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے۔“

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خون کے رشتے سے بڑھ کر ایک اور رشتہ کی نشاندہی فرمائی۔ یہ رشتہ دین کا رشتہ تھا جس نے میت کے پچھڑوں کو ملا دیا اور دشمنوں کو بھائی بھائی بنا

دیا۔ خاندانی و قبائلی یگانگت سے بڑھ کر دین کی یگانگت کی لو ان کے اندر لگائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قائم کردہ جمعیت کا دستور قرآن حکیم، مقتدر اعلیٰ اللہ تعالیٰ، اس کی ثقافت، ثقافت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھی۔ اس جمعیت کو امت کا نام دیا گیا جس میں دنیوی کروفر کی بجائے خلافت الہی کا جلال اور ظاہری شان و شوکت کی جگہ خدمت اور محبت کا جمال تھا۔ لیکن اس سادگی و فقر کے باوجود اس میں دبدبہ تھا کہ قیصر و کسریٰ اس سے لرزہ بر اندام تھے۔ اس کے افراد صالح و متقی، صابر و متوکل اور حق گو و حق شناس تھے۔ وہ حسب و نسب، ثروت اور نسلی امتیاز سے واقف نہ تھے۔ بلکہ گورے اور کالے، غنی اور فقیر، شریف اور عامی سب برابر ٹھہرے اور حاکمیت ہوئی تو قانون کی۔

قرآن کریم میں ارشادات ربانی ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوا بَيْنَ اَخْوِيكُمْ^{۱۹}

”مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو۔“

۲۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗئِلَ لِتَعَارَفُوْا^ط
اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ^ط

”لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔“

قرآن حکیم یا اسلامی معاشرے میں چار نظام حیات قائم ہونے کے ساتھ ساتھ فعال بھی ہوتے ہیں:

(۱) نظام صلوٰۃ

(۲) نظام زکوٰۃ

(۳) نظام امر بالمعروف

(۴) نظام انہی عن المنکر

جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے:

اَلدِّیْنِ اِنْ مَّكَّنٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَالزَّكٰوةَ وَاَمَرُوا

بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط

”یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے،

زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے۔“

امر بالمعروف نیکی سے انتہائی شیفتگی اور والہانہ عشق کا نام ہے اور بدی سے انتہائی بغض و عناد رکھنا نہی عن المنکر ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر دوسروں ہی کی خدمت نہیں بلکہ اپنی خدمت بھی ہے اور درحقیقت مجموعی بہتری میں اپنی بہتری چاہنے کی دانش مندانہ حکمت عملی کا دوسرا نام ہے۔^{۲۲}

اسلامی معاشرے میں ذرائع پیدائش کا مالک اللہ تعالیٰ کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ انسان محض ایک امین ہے اسلامی معاشرے کی بنیادیں تقویٰ، عدل و احسان، احترام آدمیت، اخوت و محبت اور حریت و مساوات پر اٹھائی گئی ہیں۔ اس میں افراد کی نظری و عملی زندگی کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد ہے:^{۲۳}

وَالْعَصْرَ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۝ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ .

”زمانے کی قسم! انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔“

اسلامی معاشرے میں افراد مومن و صالح اور صاحب کردار و مصلح ہوتے ہیں۔ مقتدر اعلیٰ چونکہ اللہ تعالیٰ ہے اس لیے زندگی آئین قرآنی اور اسوہ حسنہ کے مطابق بسر کی جاتی ہے۔ اسلامی ریاست میں مسلمان محض تفویض کردہ اختیارات استعمال کرتے ہیں۔ جب مسلمانوں نے آئین قرآنی اور اسوہ حسنہ کے مطابق زندگی بسر کی تو معاشرتی برائیوں کے ماحول کے پروردہ افراد ایک پاکیزہ قرآنی معاشرے کے ستون ٹھہرے۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، صدیق ہو گئے۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، فاروق اعظم کے لقب سے نوازے گئے۔ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، غنی کے نام سے منسوب ہوئے اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مرتضیٰ اور اسد اللہ کہلائے۔ جب کہ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابوعبید اللہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ، امین الامت،

سعد بن عباد رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رئیس الانصار، معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ، قاضی القضاة، حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سید الشہداء اور خالد بن ولید، سیف اللہ کے اعزازات سے مشرف ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جو بھی آیا وہ تہی دامن نہ رہا۔ بقول شاعر

صبحیں بدل گئیں، شامیں بدل گئیں
اقدار بدل گئیں، عزائم بدل گئے
فکر بدل گیا، عقائد بدل گئے

لیکن ان کی کایا پلٹنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے اپنا نمونہ کامل پیش کیا۔ قبا میں قیام کے دوران میں جب مسجد کی تعمیر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنفس نفیس اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ ایسے ہی مناظر مسجد نبوی کی تعمیر میں بھی دیکھنے میں آئے۔ غزوہ احزاب میں خندق کی کھدائی میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مثالی محنت کش کا منظر پیش کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سربراہ ریاست ہونے کے باوجود نہ صرف اپنے گھریلو کام بلکہ دوسروں کا کام کاج بھی کر دیا کرتے تھے۔ محنت سے محبت کرتے تھے۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتے اور گھروالوں کی خدمت کرتے تھے اور جب نماز کا وقت آجاتا تو نماز کو چلے جاتے۔ ۲۴ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی کی ایک اور روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی جوتیاں خود مرمت کر لیا کرتے تھے، اپنے کپڑے خود سی لیتے اور اپنے گھر میں اسی طرح کام کرتے تھے جس طرح تم اپنے گھروں میں کرتے ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بکری کا دودھ خود دودھ لیتے اور اپنا کام خود کر لیا کرتے تھے۔ ۲۵

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ”نظافت نصف ایمان ہے۔“

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے انہی اوصاف کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں کامیاب و کامران رہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ حسن انقلاب، ص ۳۹
- ۲۔ ابن ماجہ باب ذکر التوبہ، ابوداؤد، ج ۲، ص ۱۳۵، بخاری کتاب الحدود
- ۳۔ مسلم کتاب الحدود
- ۴۔ ایضاً
- ۵۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۷، ص ۴۲
- ۶۔ بخاری
- ۷۔ ابن سعد، ج ۳، تذکرہ خباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، بحوالہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۶، ص ۲۷۹، شبلی نعمانی
- ۸۔ قرآن حکیم ۹۹: ۷-۸
- ۹۔ بخاری کتاب المناقب و کتاب التفسیر، باب حسن الخلق و باب من اسعد الکفن
- ۱۰۔ قرآن حکیم ۵۹: ۹
- ۱۱۔ بخاری باب الملک بین السجدتین
- ۱۲۔ بحوالہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۵، ص ۱۱۰ شبلی نعمانی
- ۱۳۔ قرآن حکیم ۸: ۲۸
- ۱۴۔ ابوداؤد کتاب الطہارت، باب الوضوء من الدم
- ۱۵۔ بخاری واقعہ شہادت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- ۱۶۔ تاریخ طبری کبیر، ج ۷، ص ۳۲۷، واقعات ۶۱ھ بحوالہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۵، ص ۱۰۹، شبلی نعمانی
- ۱۷۔ قرآن حکیم ۸: ۶۳
- ۱۸۔ قرآن حکیم (۳۳: ۹)، (۲۸: ۲۸)، (۹: ۶۱)
- ۱۹۔ قرآن حکیم ۴۹: ۱۰
- ۲۰۔ قرآن حکیم ۴۹: ۱۳
- ۲۱۔ قرآن حکیم ۲۲: ۴۱

- ۲۲ الجہاد فی الاسلام، ص ۹۶، سید ابوالاعلیٰ مودودی
- ۲۳ قرآن حکیم ۱۰۳:۱، ۳
- ۲۴ بخاری باب اخلاقہ و شمانکہ
- ۲۵ ترمذی، باب فی اخلاقہ و شمانکہ

اسلام میں انسانی رشتے

فرد مدنی الطبع ہے اور وہ اپنے کمال کو معاشرتی زندگی کے بغیر نہیں پہنچ سکتا۔ بہترین معاشرتی زندگی وہی ہے جس میں افراد ایک دوسرے کے لیے معین و مددگار ہوں۔ قرآن حکیم نے انسانی رشتوں کے حوالے سے باقاعدہ ایک فہرست تیار کر دی ہے جس میں والدین سرفہرست ہیں:

وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ
وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۗ ط

”اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابتداروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے اور ان لوٹھی غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو۔“

... حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

خَيْرُ النَّاسِ أَنْفَعُهُم لِلنَّاسِ.

”لوگوں میں بہترین فرد وہ ہے جو لوگوں کے حق میں سب سے زیادہ نفع رساں ہے۔“

یہ نفع رسائی گھر سے شروع ہوتی ہے جو بچے کا اولین مدرسہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

رَضَا الرَّبُّ فِي رَضَا الْوَالِدَيْنِ وَسَخَطَهُ فِي سَخَطِهِمَا

”اللہ کی خوشنودی والدین کی خوشنودی میں اور اللہ کی خوشنودی والدین کی

خوشنودی میں مضمحل ہے۔“

ام ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یادیں وابستہ تھیں۔ ان کا احترام حقیقی ماں جیسا ہی کیا۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو امی بعد امی کہا کرتے تھے۔ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اٹھ کر چادر بچھادی تھی۔ اسی طرح ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی آئے تو ان کے لیے بھی محبت سے کھڑے ہو گئے اور ان کو اپنے سامنے بٹھایا۔ (ابوداؤد کتاب الادب بر الوالدین)

اسلام میں انسانی رشتوں کی اساس اخلاق اور محبت ہے۔ ان دونوں کا اظہار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیا ہے والدین کے حقوق میں یہ شامل ہے کہ ان کو ایذا نہ پہنچائے۔ اگر ان کو کوئی حاجت ہو تو مال سے ان کی خدمت کرے اگر چہ وہ کافر ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات ہیں:

”جو شخص رزق میں کشادگی اور عمر میں زیادتی کا خواہش مند ہو اس کو چاہیے کہ

صلہ رحمی کرے اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔“

”ماں باپ کے مرنے کے بعد ان کے لیے دعائے مغفرت و رحمت کرتا رہے۔

ان کے ذمہ جو قرض ہو اس کو ادا کرے۔ گاہ گاہ ان کی قبر کی زیارت کرے۔“

کسی کے استفسار پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر بار ماں کے ساتھ ہی احسان کرنے کا حکم دیا۔

چوتھی دفعہ پوچھنے پر فرمایا: اپنے باپ کے ساتھ، پھر جو قریبی رشتہ دار ہوں وہ مقدم ہیں۔“

ایک دفعہ ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جہاد میں شرکت کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشورہ چاہا۔ فرمایا: ”کیا تمہاری ماں زندہ ہے؟“

انہوں نے جواب اثبات میں دیا:

فرمایا: ”تم اس کے ساتھ چمٹے رہو کہ جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے۔“

والدین کی رضا مندی گناہوں کی مغفرت کا سبب ہے۔ ان کے ساتھ حسن سلوک کی نہایت عمدہ تاکید کی گئی ہے:

۱- وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبُلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَيْهِمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرُهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۝ وَخَفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْتَنِي صَغِيرًا ۝

”والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو، انہیں جھڑک کر جواب نہ دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرمائے جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔“

۲- وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۝

”اور والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔“

چنانچہ اولاد کا فرض ہے کہ:

۱- وہ ان کے ساتھ یکساں حسن سلوک کرے۔

۲- دونوں کا یکساں ادب و احترام کرنے۔

۳- گفتگو میں نرمی اختیار کرے۔

۴- معاملات میں دونوں کے سامنے عاجزی اختیار کرے۔

۵- معروف میں ان کی اطاعت کرے۔

۶- دونوں کے لیے دعائے مغفرت کرے۔

ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی والدہ کی بد مزاجی کی شکایت کی۔ آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے سمجھانے کے انداز میں فرمایا:

”جب نو ماہ تک تیری والدہ تجھے پیٹ میں لیے پھرتی رہی، تو بد مزاج نہ تھی اور

جب تیرے لیے شب بیدار رہی تو بد مزاج نہ تھی۔ جب تجھے دو سال تک اپنے

شیر سے نوازتی رہی تو بد مزاج نہ تھی۔“

اس شخص نے جواب دیا:

”میں اپنی والدہ کو اس کا بدلہ دے چکا ہوں۔“

آپ نے پوچھا:

”کیا دیا تو نے اسے؟“

اس نے جواب دیا:

”میں نے اپنے کاندھوں پر بٹھا کے والدہ کو حج کرایا ہے۔“

اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”کیا تو والدہ کو اپنی پیدائش کے وقت دروزہ کا بدلہ دے سکتا ہے؟“

اسلام مرد کو ایک سے زائد نکاح کی اجازت عائلی عدل کے ساتھ مشروط کر کے مرحمت کرتا ہے لہذا جو قائم کرنا اور قائم بالقسط رہنا ایک مشکل کام ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ قرآن حکیم کی سورۃ نساء کی تیسری آیت کریمہ سے بات مترشح ہوتی ہے کہ اسلام کثرت ازدواج کے حق میں نہیں بلکہ اس چیز کا خواہاں ہے کہ مرد ایک زندگی نظام ہی اختیار کرے۔ لیکن اگر اسے کسی دوسرے نکاح کی مجبوری ہے تو اسے ہر حال میں اپنی بیویوں کے مابین عدل قائم کرنا ہوگا۔ اسلام نے مرد پر یہ لازم قرار دیا ہے کہ وہ نکاح کے وقت عورت کو حق مہر ادا کرے۔ اس طرح عورت کی قدر و منزلت اور معاشرتی حیثیت کو رفعت عطا کی گئی ہے۔ اس کی مثال تاریخ عالم کے کسی دوسرے معاشرے میں نہیں ملتی۔ عورت کو عیاشی کا ذریعہ سمجھنے کی بجائے اسے گاڑی کے دو پہیوں میں سے ایک قرار دیا ہے جس کے بغیر عائلی زندگی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اسلام نے عورت کو زندہ رہنے کا حق عطا کیا ہے جب کہ روایتی فلسفہ کے مطابق شوہر اپنی بیوی کو قتل کر سکتا تھا۔ ہندوستانی عورت کو اس کے خاوند کے مرنے کے ساتھ ہی سستی کر دیا جاتا تھا۔ عربوں کے ہاں ظہور اسلام سے قبل دختر کشی کا رواج تھا۔ اسلام آیا تو اس نے کہا:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ

”قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔“

اسلام نے بیوی کے خاوند کے ذمہ جو حقوق قرار دیئے ان میں سے چیدہ چیدہ درج ذیل

ہیں:

تعلق زوجیت بذریعہ نکاح، حق مہر کا تقرر و ادا یگی، حسن سلوک، نان و نفقہ کی فراہمی، کثرت ازدواج کی صورت میں عدل اور باعصمت عورتوں کی حفاظت و عزت۔ اگر ضرورت

تادیب کی ہو تو توسط کا لحاظ رکھے۔ ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ عابد و زاہد ہونے کے باوجود اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بات معلوم ہوئی۔ تو ان کو بلوا کر فرمایا: ۱؎

وَلَزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا.

”اور تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے۔“

درست رویہ، اطاعت زوجیت، حفظ غضب، گھر کی دیکھ بھال، اس کے اقارب بالخصوص والدین سے نرمی سے پیش آنا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ۲؎

”اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس عورت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا جو شکر

کی ناشکر گزار ہوگی۔ عورت کسی وقت بھی شوہر سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔“

اسلام نے عورتوں کو قانوناً مردوں کے دوش بدوش کھڑا کیا ہے البتہ ۲ اخلاقاً رتبہ میں مردوں کو تھوڑی سی اعزازی برتری عطا کی گئی۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ. ۳؎

”عورتوں کے لیے ہی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے

حقوق ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے۔“

اس میں حکمت یہ ہے کہ خانگی تنازعات کا فیصلہ مرد کو فضیلت دے کر ہی ممکن ہے تاکہ وہ

اپنے گھر کا نظام اچھی طرح چلا سکے۔ یہ برتری اس لیے بھی بلاوجہ نہیں کیونکہ فرمایا گیا: ۳؎

الرِّجَالِ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا

أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ. ۴؎

”مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک کو دوسرے

پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔“

عورتوں میں فطری طور پر ضد بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

مرد کو سختی سے منع فرمایا کہ ”عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو کہ ان کی پیدائش پسلی سے ہوئی جس

سے اس کے اس ٹیڑھا پن کے ساتھ تم کام لے سکو تو لے سکتے ہو۔ اگر اس کو سیدھی کرنے کی فکر

کرو تو تم اس کو توڑ ڈالو گے۔“ ۱۵

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس نسبت سے ایک اور عمدہ نسخہ تجویز فرمایا: ”اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو، غور کرو گے تو اس میں کوئی دوسری اچھی بات نکل آئے گی۔“ ۱۶

اس سلسلہ میں قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ۱۷

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُنَّ شَيْئًا
وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝

”ان کے ساتھ بھلے طریقہ سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔“
اگر مرد عورت کے نان و نفقہ اور دیگر ضروریات کی کفالت نہیں کرتا تو عورت قانون کا سہارا لے سکتی ہے۔ اور اگر اس پر بھی مرد نہ دے تو بیوی کو اس سے علیحدگی کے دعویٰ کا اختیار حاصل ہے۔ حتیٰ کہ وہ خاص حالات میں مرد سے اس کے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے۔

والدین پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ خوف و افلاس کے ڈر سے بچے کو قتل نہ کریں:
وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۗ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ
كَانَ خِطَاءً كَبِيرًا ۝ ۱۸

”اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔“

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچوں کی احسن طریق سے تربیت کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان کے ساتھ شفقت و مہربانی سے پیش آئیں اور ان کی بہتری کے لیے دعا کریں۔ ان کی شادی کرائیں اور وراثت میں ان کا حق دیں۔ اولاد کے ساتھ محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ اس کی خاطر انسان بڑی صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔ اقرع بن حابش تمیمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بوسہ لیتے دیکھا تو کہا:

”میرے دس بیٹے ہیں میں نے ان میں سے کسی کا کبھی بوسہ نہیں لیا۔“

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”سچی بات تو یہ ہے کہ جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔“

لیکن اولاد کو بے جا پیار سے بگاڑا نہیں چاہیے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

”کسی باپ نے اپنے بیٹے کو حسن ادب سے اچھا عطیہ نہیں دیا۔“

لڑکیوں کی اچھی تربیت آئندہ نسلوں کی اچھی تربیت کے مترادف ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی (یہ فرماتے ہوئے آپ نے اپنی دو انگلیوں

کو ملاتے ہوئے اشارہ فرمایا) میں اور وہ جنت میں اس طرح داخل ہوں

گے۔“

اسلام نے انسانی جان کی حرمت کو بے پناہ اہمیت دی ہے۔ اس حق کے بغیر باقی حقوق

بے معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جسے پیدا کیا اسے زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ اہل روم کے ہاں

باپ کو اپنی اولاد کے قتل کا پورا حق حاصل تھا اور اس کے یہ غیر محدود اختیارات ان کے لیے تقاخر

کا باعث تھے۔ عرب دختر کشی کیا کرتے تھے لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مندرجہ

بالا ارشادات و افعال کی رو سے وہ جنس جسے قابل ذلت خیال کیا جاتا تھا، آنکھوں کی ٹھنڈک بن

گئی۔

گھر کے بعد ہمسائے کا درجہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یدخل الجنة من لایامن جاره بوائقہ.

”وہ شخص جس کی شرارتوں سے اس کا ہمسایہ مامون نہیں وہ جنت میں داخل نہیں

ہوگا۔“

عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے:

ما زال جبرئیل یوصینی بالجار حتی ظننت انه یورثہ.

”مجھے ہمسائے کے بارے میں جبرئیل نے اتنی تلقین کی کہ میں سمجھنے لگا کہ شاید

وہ ہمسائے کو وارثوں میں شامل کر دے گا۔“

اسی طرح خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمسایوں کے بارے میں حسن سلوک کی اتنی زیادہ تلقین فرماتے کہ بعض دفعہ صحابہ کرامؓ کو یہ خیال گذرتا کہ ان کو جائیداد میں حصہ دار نہ بنا دیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان بھی قابل ذکر ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے۔^{۲۲}

ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
 ”وہ شخص مومن نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے مگر اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا ہو۔“^{۲۳}

ہمسایہ اپنے کھانے پینے کی اشیاء میں دوسرے کی شرکت کرے۔ اگر دینے کی استطاعت نہ ہو اور اچھی چیز بچوں کو کھلائے تو انہیں وہ چیز لے کر باہر نکلنے سے روکے تاکہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔

اسلام نے قرابتداری کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے، جیسے فرمایا:

۱۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ. ^{۲۴}

”اور ماں باپ کے ساتھ اور رشتے داروں کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔“

۲۔ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ. ^{۲۵}

”اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں پر خرچ کرے۔“

۳۔ قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ. ^{۲۶}

”جو مال بھی خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتے داروں پر خرچ کرو۔“

۴۔ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَايِ ذِي الْقُرْبَىٰ. ^{۲۷}

”اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔“

۵۔ وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ. ^{۲۸}

”رشتہ دار کو اس کا حق دو۔“

۶۔ فَأْتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ. ^{۲۹}

”پس (اے مومن) رشتہ دار کو اس کا حق دو۔“

رشتہ داروں سے حسن سلوک کے متعلق ارشادات ربانی کے یہ چند ایک نمونے ہیں۔

انسان کے خانگی افکار اور تنازعات پریشانی پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں لیکن جو لوگ اہل خانہ اور قرابتداروں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ، صلہ رحمی اور خوش معاملگی سے پیش آتے ہیں ان کی زندگی میں مسرت اور طمانیت پیدا ہوتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ^{۳۰}

”صلہ رحم سے قرابتداروں میں محبت، مال میں کثرت اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔“

رشتوں کا جوڑنا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاص عمل خیر تھا اور ادعائے نبوت سے قبل

بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ شعار رہا۔

پہلی وحی کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھبرائے ہوئے گھر واپس آئے تو خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جن جملوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی ان میں یہ جملہ بھی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ صلہ رحمی (رشتے کو جوڑنا) کرتے ہیں۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ محترمہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو نیک کام شمار کیے ہیں ان میں رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک ایسے نیک کام کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے خاندان والوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ، صلہ رحمی اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں ان کی زندگی میں خانگی مسرت، انشراح اور طمانیت خاطر رہتی ہے۔ جو دولت اور عمر دونوں میں برکت اور اضافے کا باعث بنتی ہے۔ اسلام رشتہ داری کو کتنی اہمیت دیتا ہے اس کا اندازہ قرآن حکیم کی اس آیت سے لگایا جاسکتا ہے: ^{۳۱}

وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ.

”اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ۔“

اسی فرمان کے پیش نظر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھلم کھلا اسلام کی تبلیغ شروع کی۔

حضور یتیموں کے بلجا و ماوی تھے۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کا ارشاد مروی ہے:

خَيْرُ بَيْتٍ فِيهِ يَتِيمٌ مُكْرَمٌ.

”تم میں سب سے بہتر وہ گھر ہے جس میں یتیم معزز طریقے سے رہتا ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یتیم کے کفیل کو جنت کی خوشخبری دی ہے۔^{۳۲} اس کے ساتھ ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یتیم کا مال کھانا انکار سے کھانے کے مترادف قرار دیا ہے۔ عرب میں یہ ایک عام رواج تھا کہ کئی بااثر لوگ دولت مند یتیم لڑکیوں سے محض اس لیے بیاہر چاتے تھے کہ ان کی جائیداد پر قابض ہو جائیں۔ بعد میں ان کو ستاتے تھے۔ اس کے متعلق ارشاد ربانی ہوا:^{۳۳}

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ
مَنْسِي وَتِلْكَ وَرُبَعٌ ۚ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةٌ أَوْ مَا مَلَكَتْ
أَيْمَانُكُمْ ۗ ذَٰلِكَ أَذْنَىٰ أَلَّا تَقُولُوا ۝

”اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں۔ بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرین صواب ہے۔“

یتیم بچوں کے مال کو بددیا تنی اور اسراف سے خرچ بھی نہیں کر دینا چاہیے۔ جب وہ سن شعور کو پہنچ جائیں تو وہ مال ان کو واپس کر دینا چاہیے۔
ارشاد ربانی ملاحظہ ہو:^{۳۵}

وَأَتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ ۚ وَلَا تَأْكُلُوا
أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ ۗ

”یتیموں کے مال ان کو واپس کر دو۔ اچھے مال کو برے مال سے نہ بدل لو اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔“

جہاں تک نادار یتیموں کا تعلق ہے تو ان کی پرورش، نیک سلوک اور احسان کا بار بار حکم دیا گیا ہے۔^{۳۶} یتیم اور مساکین خیرات و صدقات کے بہترین مصارف قرار دیئے گئے۔ مختلف احکام کے بعد یہ حکم دیا گیا ہے:

وَأَنْ تَقُولُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ ۗ

”اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو۔“
مدنی معاشرے میں ارشادات ربانی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے ایک ایسا مثبت، انقلابی اور صحت مند معاشرتی رویہ پیدا ہوا کہ جب ایک نوجوان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا:

”تو نے کسی نوجوان عورت سے شادی کرنے کی بجائے ایک زیادہ عمر کی بیوہ سے شادی کرنے کو کیوں ترجیح دی ہے؟“

تو اس کا جواب یوں تھا:

”حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے بھائی کی یتیم اولاد کم سن ہے اور میں نے سوچا کہ ایک تجربہ کار عورت ان کی پرورش زیادہ اچھے طریقے سے کر پائے گی۔“

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا خوبصورت معاشرہ تربیت و تشکیل دیا تھا کہ ایک دفعہ بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ محض اس لیے ایک دوسرے سے ناراض رہنے لگے تھے کہ وہ ایک متوفی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے یتیم بچوں کی پرورش کر کے ثواب کمانا چاہتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع ملی تو فرمایا:

”بچوں کو سامنے لاؤ، وہ جسے پسند کریں اس کے پاس چلے جائیں۔“

ایسی ان گنت مثالیں موجود ہیں کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیواؤں سے شادی کی محض اس لیے استدعا کی کہ وہ اپنے مرحوم دوست کے یتیم بچوں کی پرورش کر سکیں۔ انہوں نے نہ صرف بیواؤں سے شادیاں کیں اور اپنی املاک کو اپنی بیویوں کی سابقہ اولاد میں بھی تقسیم کیا تا کہ وہ کسی قسم کی محرومی کا شکار نہ ہوں۔ اس ضمن میں قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے: ^{۳۷}

وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ ۝

”اور جن کا حال یہ ہے کہ دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل ان کے اس

خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔“

یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اعلیٰ اقدار اور صفات عالیہ ہی کا نتیجہ تھا کہ انسان کو اپنی

تعظیم کے نشان اور راز بندگی ملا۔

ظہور اسلام سے قبل غلامی کا عام رواج تھا۔ بلکہ جس شخص کے پاس جتنے زیادہ غلام ہوتے اتنا ہی وہ معزز اور سرکردہ خیال کیا جاتا تھا۔ غلاموں کو بکاؤ اور متروکہ مال خیال کیا جاتا تھا۔ وہ غلاموں کا بیاہ کرتی اور جب چاہتے جبراً ان میں تفریق کر دیتے تھے۔ عہد رسالت میں ایک شخص نے ایسا کیا تو غلام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ کر شکایت کی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا:
”لوگ کیوں غلاموں کا نکاح کر کے پھر تفریق کرانا چاہتے ہیں۔ نکاح و طلاق کا حق صرف شوہر کو ہے۔“^{۳۸}

اسلام سے پہلے آقا اپنے غلام کے ساتھ نہایت ہی ذلت آمیز سلوک کرتا، بعض اوقات وہ اپنے غلام کو جان سے مار ڈالتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غلامی کے استیصال کے لیے نہایت ہی حکیمانہ اقدامات کیے اور انسانوں کو انسانی بندگی سے ہٹا کر صرف اللہ تعالیٰ کی عبودیت کی صراط مستقیم پر چلایا اور غلاموں کو ہر قسم کی زنجیروں سے نجات دلا دی۔^{۳۹}

غلاموں نے پہلی بار یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی کہ تمام لوگ مٹی سے پیدا ہوئے ہیں، رنگ اور چہرے میں فرق فقط ایک دوسرے کی پہچان کے لیے ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:^{۴۰}

”اے گروہ قریشی! آج سے اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کی نخوت و برتری ختم کر دی۔ حسب و نسب کا غرور رخصت کر دیا گیا۔ سنو سب انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام کو مٹی سے خلق کیا گیا۔“

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی:^{۴۱}
يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۗ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۗ ط

”اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ بہتر ہو

یہ مساوات کا محض درس ہی نہ تھا بلکہ یہ اولاد آدم علیہ السلام میں مساوات کی ایک ناقابل تردید دلیل تھی جس نے یہ ثابت کیا کہ رنگ و نسل کے امتیازات لوگوں کے پیدا کردہ ہیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ^{۴۲}

”لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غلاموں کے حقوق کا خاص خیال تھا۔ فرمایا:

”تمہارے غلام اللہ کی مخلوق ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان پر فضیلت دی ہے۔ تم ان پر ظلم مت کرو اور اگر یہ کوئی قابل معافی غلطی کریں تو انہیں آزاد کر دو اور انہیں مارو مت۔ اللہ کو احساس ہوتا ہے اور یہ گناہ کبیرہ ہے۔“

ابو مسعود انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز وہ اپنے ایک غلام کو بے تحاشا مار رہے تھے کہ انہوں نے سنا کہ کوئی ان سے کہہ رہا ہے:

اعلم ابا مسعود اللہ اقدر علیک منک علیہ.

”خبردار ابو مسعود! اللہ تعالیٰ تجھ پر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے جو تجھ کو اس غلام پر حاصل ہے۔“

پلٹ کر دیکھا تو پیچھے مجسمہ رحمت پیکر شفقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے تھے۔ ابو مسعود انصاری نے فوراً ہی اس غلام کو آزاد کر دیا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ابا افک لولم تفعل عسک النار.

”اگر تو اس کو آزاد نہ کرتا تو آگ کے عذاب میں مبتلا ہو جاتا۔“ ^{۴۳}

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے مختلف طریقوں سے ترغیب دیتے، جیسے مختلف گناہوں کے لیے جو کفارے مقرر کیے گئے ان میں غلام آزاد کرنے کو بہترین کفارہ قرار دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز پر لبیک کہا، اس طرح کہ غلاموں کی دنیا ہی تبدیل ہو گئی۔

فتح مکہ کے روز اسلام لانے والے حکیم بن حزام نے ایک سو غلام آزاد کیے۔^{۴۴}
عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے صرف ایک قسم کے کفارہ میں چالیس غلام آزاد
کیے۔^{۴۵}

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک ہزار اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ
عنہ نے تیس ہزار غلام آزاد کرنے کی سعادت حاصل کی۔^{۴۶}
غلام آزاد کرنے کی ترغیب کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیمت کے اعتبار
سے ثواب ملنے کی نوید سناتے۔ ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک استفسار (کہ کیسے غلام کو آزاد
کرنا افضل ہے؟) پر فرمایا:

اغلامعائثنا وانفعها عند اهلها.

”وہ جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو مالک کو زیادہ پسند ہو۔“

ارشاد ربانی ہے:^{۴۷}

وَلَا تُكْرَهُوا قَتْلَكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ اِنْ اَرَدْتُمْ تَحْصِنًا لِيَتَّبِعُوا عَرَضَ
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا. ط

”اور اپنی لونڈیوں کو اپنے دنیوی فائدوں کی خاطر قتل نہ کری پر مجبور نہ کرو جب کہ
وہ خود پاكدامن رہنا چاہتی ہو۔“

اسی طرح لونڈی کو اچھی تربیت دے کر آزاد کر کے اس سے نکاح کرنے کو ایک عظیم نیکی
قرار دیا۔ قرآن حکیم میں فرمایا ہے:^{۴۸}

فَكَ رَقَبَةً.

”کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا۔“

کسی اعرابی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استفسار کیا:

”یا رسول اللہ! کوئی ایسا عمل بتائیے جس سے میں جنت میں داخل ہو سکوں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اعتق انسمه وفك الرقبة.

”غلام آزاد کر اور گردنوں کو غلامی سے چھڑا۔“

ایک اور موقع پر فرمایا:

من اعتق رقبة مسلمة كانت فكاكه من النار عضوا بعضو.
”جو کوئی کسی مسلمان کو آزاد کرے گا اس کا ہر عضو اس غلام کے ہر عضو کے
بدلے دوزخ سے بچ جائے گا۔“

اور ایک حدیث میں ہے:

من اعتق نفسا مسلمة كانت فدية من جهنم.
”جس نے ایک نفس مسلمہ کو آزاد کیا تو وہ جہنم سے بچنے کے لیے اس کا فدیہ ہو
گیا۔“

غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان گنت احادیث
ملتی ہیں۔

ایک موقع پر فرمایا: ۴۹

ان اخوانکم حولکم جعلهم اللہ تحت ایدیکم فمن اخوة تحت
یدہ فلیطعمہ مما یا کل ولیلبسہ ما یلبس ولا تکلفوہم ما یغلبہم
فان کلفتموہم فاعینوہم.

”یہ تمہارے بھائی تمہارے خادم ہیں جنہیں اللہ نے تمہارا دست نگر بنایا ہے۔
پس جس کسی کا بھائی اس کے ماتحت ہو اسے چاہیے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود
کھاتا ہے اور وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے۔ تم ان پر ان کی طاقت سے زیادہ
بوجھ نہ ڈالو اور اگر ایسی کوئی بھاری خدمت ان کے سپرد کرو تو ان کا ہاتھ بٹاؤ۔“
کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استفسار کیا کہ ہم کتنی مرتبہ اپنے خادم کو معاف
کریں۔ فرمایا:

اعفوا عنہ فی کل یوم سبعین مرفہ.

”اگر وہ روزانہ ستر بار بھی قصور کرے تو معاف کیے جاؤ۔“

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نزع کے عالم میں جب تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی
زبان بند نہیں ہوئی، یہی فرماتے رہے:

”نماز پڑھنا اور غلاموں کا خیال رکھنا۔ نماز پڑھنا اور غلاموں کا خیال رکھنا۔“^{۵۰}

سوید بن مقرن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم سات بھائیوں کا ایک غلام تھا۔ ایک مرتبہ ہمارے چھوٹے بھائی نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اس غلام کو آزاد کرنے کا حکم دیا۔ انہی سوید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحب زادے معاویہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے ہاں کے ایک غلام کو تھپڑ مار دیا۔ والد نے ہم دونوں کو بلایا اور غلام سے کہا کہ تو معاویہ سے بدلہ لے۔^{۵۱}

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاشرتی عدل کا یہ اصل الاصول بتایا ہے کہ ”دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک کرو جیسا تم چاہتے ہو کہ وہ تم سے سلوک کریں۔“

اسلام کے نزدیک معاشرتی احسان کی ایک حسین صورت حسن خلق ہے جس کی غیر معمولی اہمیت و فضیلت کا اندازہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ ”حسانت یا فکون میں سب سے زیادہ وزنی نیکی حسن خلق ہے۔“ عرب میں یہ رواج تھا کہ غلام کو عبدی (میرا بندہ) اور لونڈی کو (میری بندی) کہہ کر پکارتے تھے اور اپنے آپ کو رب کہلواتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس رواج پر یہ کہہ کر ضرب کاری لگائی کہ انہیں فتای (میرا لڑکا) اور فتائی (میری لڑکی) کہہ کر پکارا کرو اور اپنے آپ کو سبری یا مولائی کہلویا کرو۔^{۵۲} صحابہ کرام نے غلاموں کو اپنے گھر کا اس طرح رکن بنا کر رکھا کہ ان کے غلاموں اور آقاؤں کے درمیان تمیز مشکل ہو گئی۔^{۵۳} عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں فوجی افسروں کو حکم دیا کہ رومی اور عجمی آزاد غلام جو مسلمان ہو گئے ہوں ان کو ان کے قدیم آقاؤں کے خاندانوں میں شمار کرو۔ جو ان کا حق ہو وہ ان کا ہو اور یہ غلام چاہیں تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ بنالیں۔^{۵۴}

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کا یہ عالم تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلانے کا حکم دیا:

ارقاء کم اطعموہم مما تاکلون واکسوہم مما تلبسون۔^{۵۵}

”تمہارے غلام، تمہارے غلام! جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ۔ جو خود پہنو وہی ان

کو پہناؤ۔“

ایسا اس لیے حکم دیا گیا کہ وہ خاندان کے رکن بن کر رہیں۔ زید بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے اور روم جانے والے لشکر میں مہاجرین اور انصار کے قائد بنائے گئے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلاموں کے بارے میں حسن سلوک کی پالیسی کا ہی نتیجہ تھا کہ اکثر کافروں کے غلام بھاگ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں آزاد کر دیا۔^{۵۷} جب مال غنیمت تقسیم ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس میں سے غلاموں کو بھی حصہ دیتے۔^{۵۷}

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غلاموں کی خرید و فروخت کو قطعاً ممنوع قرار دیا اور فرمایا:

”جو کوئی کسی آزاد شخص کو پکڑ کر بیچے گا میں خود اس کے خلاف قیامت کے دن مدعی بنوں

گا۔“^{۵۸}

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وفود مختلف ریاستوں میں بھیجتے ان میں اکثر حبشی ہوتے ہم اسلامی معاشرے میں سربر آوردہ افراد کے مقابلہ میں غلاموں کو اور گوروں کے مقابلے میں سیاہ فام افراد کو بڑے بڑے مناصب پر فائز دیکھتے ہیں یا غلام و آقا اور احمر و اسود کو ایک ہی مسند پر بیٹھا پاتے ہیں۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی مسند فقہ کا صدر جانشین ان کے غلام نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحب زادے عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکتب علم کے صدر نشین ان کے غلام عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور فن قرأت کا امام ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غلام ابی میمون رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پاتے ہیں۔

عرب تین چیزوں کو بدبختی خیال کرتے؛ اجنبی ہونا، غلام ہونا اور سیاہ فام ہونا۔ اتفاق سے یہ تینوں چیزیں بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں موجود تھیں۔ وہ مکہ کے ایک متمول شخص امیہ بن خلف جمعی کے غلام تھے۔ وہ مشرف بہ اسلام ہوئے تو امیہ ان کو اذیت ناک سزائیں دیتا جیسے ننگے بدن تپتی ریت پر لٹا دیتا لیکن ان کی زبان پر اَحَدٌ اَحَدٌ ہی کا ورد ہوتا۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امیہ کو بصد مشکل اس پر آمادہ کیا کہ وہ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے ہاتھوں فروخت کر دے۔ جب بھاری قیمت پر ایسا ہو گیا تو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آزاد کر دیا۔ اسلام نے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو

مقام عطا کیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس پذیرائی سے دوسرے محروم افراد کے حوصلے بلند ہوئے اور فوراً بعد عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لبینہ اور دفیہہ نام کی دونوں کنیروں نے اسلام قبول کر لیا۔ اسلام نے آدمی کے لیے معیار عظمت حسب و نسب، مال و دولت یا خاندانی وجاہت کو قرار نہیں دیا۔

بلکہ ارشاد ربانی ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ اتَّقَاكُمْ.

”بے شک اللہ کے نزدیک تم سے معزز ترین وہ شخص ہے جو پاکباز ترین ہے۔“
اسی سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

اتونی باعمالکم ولا تاتونی بانسابکم.

”میرے پاس اپنے نسب نامے مت لاؤ، مجھے اپنے اعمال نامے دکھاؤ۔“

جو لوگ حکم الہی کے مطابق ایمان لائے اور انہوں نے اپنی زندگیاں اس نہج پر ڈھالیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک برتر قرار پائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لیس شیء اکرم علی اللہ من المومن.

”صاحب ایمان شخص سے بڑھ کر اللہ کے نزدیک کوئی شے مکرم نہیں ہے۔“

اسی طرح اسلام نے نسلی تفریق کی نفی کی اور جھوٹی نمود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نابود کر دیا۔

اسی ذیل میں اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

آدمیت احترام آدمی!

باخبر شواز مقام آدمی!

اسلام سے قبل عرب میں جنگ کے بعد قیدیوں اور غلاموں کو مختلف طریقوں سے عذاب دے کر مار ڈالنے کا رواج تھا۔ لیکن اس کے برعکس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غزوات اور سرایا میں احترام انسانیت کا یہ عالم تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں، بچوں اور معذوروں کے قتل، ایذا رسانی اور مثلہ کرنے کی سخت مخالفت فرمائی۔ حتیٰ کہ دشمن کی لاشوں کو بھی مدینہ واپسی سے قبل ٹھکانے لگاتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبیلہ مصطلق کو زیر کرنے کے بعد اس کے افراد کو غلام نہیں بنایا بلکہ وہ مسلمان ہو گئے۔ اس قبیلہ کی ایک خاتون جو یہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شادی کر لی۔

غزوہ احزاب میں حملہ آوروں کے ایک ممتاز فرد نے خندق عبور کرنے کی کوشش لیکن ناکام رہا اور اپنے گھوڑے سمیت خندق میں گر گیا۔ مسلمانوں نے اسے خندق میں ہی مار ڈالا۔ اس کی لاش ایک سوانٹوں کے بدلے میں واپس لینے کے لیے احزاب کا پیغام آیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ لاش مفت واپس کر دی۔ یقیناً اس سے دشمن کے دل پر اچھا اثر پڑا ہو گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دشمن کو نیست و نابود کرنے کی بجائے ایسی ہی تدبیروں سے اس کو مشرف بہ اسلام کرنے پر آمادہ کرتے رہے۔

۶ھ میں نجد کے ایک سرکردہ اٹامہ بن اثال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر اسلام لائے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ قریش کو غلہ کی رسد روک دی جائے گی۔ اس اقدام کے نتیجے میں مکہ میں قحط پیدا ہو گیا۔ یہ پابندی عسکری نکتہ نظر سے بڑی اہم تھی۔ قریش نے مجبور ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ اس پابندی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعزہ واقربا بھوکے مر رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چاہیے کہ ہماری مشکلات ختم کرنے کے لیے اقدامات کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوری طور پر پانچ سو اشرافیاں مکہ کے فقراء غربا کی امداد کے لیے بھجوائیں^۹ اور ساتھ ہی تمامہ کو حکم دیا کہ وہ یہ پابندی ختم کر دیں۔^{۱۰}

انسانی رشتوں میں ایک اور رشتہ حاکم و محکوم کا رشتہ ہے۔ ایک مشہور مقولہ ہے۔

الناس علی دین ملوکھم .

لوگ اپنے حکمرانوں کے طریقہ و طرز عمل پر ہوتے ہیں۔ اسلام نے جس ریاست کی نیو ڈالی وہ مقصود بالذات نہ تھی بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی۔ یہ ایک ایسے عادلانہ نظام کو قائم کرنے کی خواہاں تھی جس میں کسی فرد کا دیا ہوا قانون نہ ہو بلکہ قانون خداوندی کا راج ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاکم کے لیے یہ شرط مقرر فرمائی کہ وہ بہت چالاک نہ ہو۔ چنانچہ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب زیاد بن سفیان کو معزول کیا تو انہوں نے کہا:

”کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ یا میں نے کوئی خیانت کی ہے؟“

عمر فاروق نے جواب دیا:

”یہ کچھ نہیں۔ میں نے تم کو صرف اس بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمہاری عقل کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔“

اسلامی ریاست میں اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور مسلمان امانت کے طور پر اختیارات کا استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح حکمران آقا نہیں بلکہ ملت کے خادم ہوتے ہیں۔ ان کی دنیوی اور اخروی جوابدہی کا مکمل احساس ہوتا ہے۔ مشاورت اسلامی زندگی کا اصل الاصول ہے۔ اسے جہاں زندگی کے باقی شعبوں میں تسلیم کیا جاتا ہے وہاں نظام ریاست میں بھی اولیت حاصل ہے بلکہ شورا ایت کے پیش نظر حکمران کی بجائے دین و ملت کا مفاد ہوتا ہے۔ حکمران کو اپنے مشیروں سے مشورہ تو ضرور لینا چاہیے لیکن فیصلہ اپنی صوابدید کے مطابق کرنا چاہیے۔ اگر مشورہ ملی مفاد میں ہے تو منظور کر لینا چاہیے ورنہ نہیں۔ اسلام کثرت رائے کو نہیں بلکہ ملت کے مفاد کو اہمیت دیتا ہے۔ یہی جمہوریت اور اسلامی شورا ایت میں فرق ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امن و اخوت پر مبنی ایک نظریاتی مملکت قائم کی جس میں انسانی تحریم و تکریم ہر ایک کے لیے بنائے تقدیس تھی۔ حاکم کی اطاعت کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

(سردار کی بات) سنو اور مانو گو تم پر ایک حبشی غلام سردار مقرر کیا جائے جس کا سرمقے کی طرح چھوٹا ہو (یعنی بیوقوف ہو) ^{۶۲}

ایک اور جگہ یوں ارشاد فرمایا:

ان امر علیکم عبد مجدھا اسود بقرو کم بکتاب اللہ فاسمعوا الہ واطیعوا۔

”اگر کوئی حبشی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تم کو اللہ کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔“

ایک اور موقع پر فرمایا:

من اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصی امیر فقد عصانی.

”جس نے میرے امیر کا کہا مانا اس نے میرا کہا مانا۔ جس نے میرے امیر کی

نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔“

لیکن یاد رہے کہ امیر کی اطاعت کو اس وقت تک لازم قرار دیا جب تک وہ قرآن و سنت

کی کھلی خلاف ورزی نہ شروع کر دے۔

لاطاعة عن عصی اللہ. ۶۳

ایک اور مقام پر فرمایا: کہ حاکم کی اطاعت اسی کام میں ہونی چاہیے جو جائز ہو۔ ۶۵

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا فرمائی:

”اے اللہ! جو میری امت کا والی ہو، اگر وہ امت پر سختی کرے تو تو بھی اس کے

ساتھ سختی کرنا اور جو نرمی کرے تو بھی اس کے ساتھ نرمی فرمانا۔“

(مسلم، باب فضیلة الامام العادل)

اعیان حکومت کا برائی میں مبتلا ہو جانا فتنہ و فساد کی جڑ ہے لیکن جب صحابہ کرام رضی اللہ

تعالیٰ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسے ناپسندیدہ امیروں کی اطاعت سے باز رہنے

کی اجازت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ۶۶

لا ما اقاموا فیکم الصلوة.

”نہیں جب تک وہ تم میں نماز قائم کرتے رہیں۔“

اس طرح اسلام نے حکمران و رعایا کے درمیان ایک توازن قائم کیا ہے۔ چنانچہ حکمران

کے اوصاف بیان کیے گئے تاکہ غلط آدمی کا انتخاب نہ ہو سکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب

بھی کسی کو کہیں کا حاکم مقرر کر کے روانہ فرماتے تو اس کو نصیحت فرماتے:

”لوگوں کو اچھی باتیں بتانا، ان کے لیے آسانیاں پیدا کرنا، دین کو اس طرح

پیش کرنا کہ انہیں اس کی رغبت ہو، انہیں احکام سے مصیبت میں نہ ڈالنا

وغیرہ۔“

ایک اور مقام پر آپ نے فرمایا:

”تم میں سے ہر شخص کچھ نہ کچھ حکومت رکھتا ہے اور قیامت کے دن اس رعیت

کی اس سے پوچھ ہونی ہے۔ بادشاہ تو حاکم ہی ہے اس سے اس کی رعایا کی پوچھ گچھ ہوگی اور ہر ایک آدمی اپنے گھر والوں پر حاکم ہے اس سے ان کی پوچھ گچھ ہوگی۔ عورت اپنے خاوند کے مال کی حاکم و محافظ ہے، اس سے اس کی پوچھ گچھ ہوگی۔ اسی طرح غلام اپنے صاحب کے مال کا نگہبان ہے اس سے اس کی پوچھ گچھ ہوگی۔ غرض تم میں سے ہر ایک شخص حاکم ہے اس سے اس کی رعایا کی باز پرس ہونا ہے۔“

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”حاکم کے حکم کو سننا اور اطاعت کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، خواہ حکم پسند نہ آئے۔ جب تک کہ حاکم کسی گناہ کا حکم نہ دے اور جب وہ کسی گناہ کا حکم دے تو مسلمان پر اس کی اطاعت واجب نہیں۔“^{۶۹}

وائل بن حجر نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استفسار کیا کہ ”یا رسول اللہ! اگر ہم پر ایسے حاکم مسلط ہوں جو ہم سے اپنا حق مانگیں اور ہمارے حقوق سے انکار کر دیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا ارشاد ہے:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”ان کے احکام سنو اور ان کی اطاعت کرو۔ اس لیے کہ ان پر وہ بات فرض ہے جو انہوں نے اپنے ذمہ لی ہے اور تم پر وہ چیز فرض ہے جو تم نے اٹھائی ہے۔“^{۷۰}

معاشرہ انسانی رشتوں سے عبارت ہے اور اس کی اصلاح کا اصول یہ ہے کہ معاشرے کی اصلاح کی ابتداء حکمران کی ذات اور ایوان حکومت سے ہونی چاہیے۔ کیونکہ معاشرتی مفاسد کا منبع عموماً حکمران کی ذات اور اس کا ایوان حکومت ہوتا ہے۔ اگر حکمران صالح اوصاف کا مالک ہوگا تو اس کی بھلک حکومت کے ہر شعبے میں نظر آئے گی۔ بصورت دیگر ہر جگہ بگاڑ پیدا ہو گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہر عمل سے امت کے لیے ایک مشعل منور کی اور کبھی بھی سربراہ ریاست ہونے کا تاثر نہ دیا۔ جب مسجد نبوی کی تعمیر شروع ہوئی تو اس میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ شانہ بشانہ حصہ لے کر ایک نادر مثال قائم کی اور فرمایا:

هذا الحمال لا حمال خبير

هذا اُبر ربنا واطهر.

”جتنی یہ مزدوری نتیجہ خیز ہے اتنی خیبر کی مزدوری نتیجہ خیز نہیں۔ اے ہمارے

رب! اس میں زیادہ نیکی ہے اور یہ زیادہ پاکیزہ عمل ہے۔“

اسی طرح غزوہ احزاب کے موقع پر خندق کی کھدائی میں برابر حصہ لیا۔ سفر میں اپنے

حصہ کا کام خود کرتے۔ ایک مرتبہ کھانا پکانے کے لیے لکڑیاں لانے کا کام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنبھالا۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا:

”یہ کام ہم کر لیں گے۔“

فرمایا: ”میں پسند نہیں کرتا کہ اپنے آپ کو تم سے ممتاز رکھوں۔ اللہ اس بندے کو

پسند نہیں کرتا جو ہمراہیوں میں ممتاز بنے۔“

ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک عورت آئی، اس کا بچہ گڑ بہت کھاتا

تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اگلے روز آنے کو فرمایا:

دوسرے روز وہ آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچے کو گڑ کثرت سے نہ کھانے کی

ہدایت فرمائی:

عورت نے عرض کیا: ”یہ بات تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کل بھی کہہ سکتے تھے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”کل تو میں نے خود گڑ کھایا ہوا تھا اس لیے بات میں تاثیر ممکن نہیں تھی۔“

اسلامی ریاست میں تمام مسلمانوں کو بلا امتیاز رنگ و نسل سیاسی آزادی اور دیگر حقوق

حاصل ہوتے ہیں۔ وہ ملکی امور میں حصہ لینے کے مجاز ہوتے ہیں۔ سیاسی آزادی سے مراد حسن

فکر و عمل، حسن اظہار و ابلاغ اور حسن اکتساب کی آزادی ہے۔ آپ نے ہجرت کے بعد میثاق

مدینہ کے ذریعے تائیس ریاست کی۔ مدینہ میں اوس اور خزرج (انصار کے ان دونوں قبیلوں کو

بنو قریظہ کہتے تھے) کے علاوہ یہودیوں کے قبائل بنی نضیر، بنی قینقاع اور بنی قریظہ آباد تھے۔ کچھ

عیسائی بھی تھے جن کی صحیح تعداد معلوم نہیں لیکن ایک روایت کے مطابق قبیلہ اوس میں پندرہ یا

پچاس عیسائی تھے۔ اے اوس اور خزرج کے درمیان تقریباً ایک سو بیس برس سے خانہ جنگیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب مواخات کا نظام قائم کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تمام قبائل کا ایک نمائندہ اجلاس انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد کے گھر طلب کیا اور انہیں ایک مشترکہ حکومت کی ضرورت کا احساس دلایا۔^۲ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں بانی کا ایک ایسا نظام قائم کیا جس سے صلح اور جنگ ہر قبیلے کی انفرادی ذمہ داری کی بجائے ایک مشترکہ مسئلہ بن گئی۔

اسلام نے جہاں بے شمار حقوق فرد کو عطا کیے ہیں وہاں اسے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے اور دوسرے کا مافی الضمیر سننے کی آزادی سے بھی نوازا ہے۔ اس کا یہ حق ناقابل تنسیخ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی لیے جابر حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنے کو جہاد سے تعبیر کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عدل کا جو تصور پیش کیا ہے اس کے ساتھ ہی احسان کا بھی حکم دیا ہے۔ جس میں حسن سلوک اور ایثار و قربانی کا بھی مفہوم پایا جاتا ہے۔ عدل کی اس پاسداری میں خود اپنے خلاف اور دشمن کے حق میں فیصلے کا بھی تصور پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے خشیت الہی ایک بنیادی شرط ہے۔

ارشاد ربانی ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوْمِينَ بِالْقِسْطِ ۚ شَهِدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ ^{ج ۳}

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو انصاف کے علمبردار بنو اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔“

۲۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوْمِينَ لِلَّهِ شَهِدَاءَ بِالْقِسْطِ ۚ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۗ اِعْدِلُوا ۗ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۗ ^{ط ۳}

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔“

اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔“

امن و عافیت کے رشتے ہمیشہ عادلانہ رویوں سے قائم ہوتے ہیں جب کہ جانبدانہ رویہ عدل کی بجائے ظلم کو راہ دیتا ہے۔ اس باب میں پھیلی ہوئی بدگمانیاں معاشرتی فساد کی بنیاد بن جاتی ہیں۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

”عادل امام کو قیامت کے دن اللہ کا سایہ نصیب ہوگا۔“

ابوبکر صدیق کا قول ہے کہ:

السلطان العادل المتراضع ظل الله در معه في الارض.

”عادل اور متواضع حاکم زمین میں اللہ کا سایہ اور اس کا نیزہ ہے۔“

(بخاری، باب فضل من ترک الفواحش)

اسی لیے اسلامی ریاست میں عدلیہ آزاد و غیر جانبدار ہوتی ہے کیونکہ یہ عدل کی محافظ و امین ہوتی ہے۔ اس کی نظر میں اعزہ و اقارب اور اغیار و اعداء سب ایک جیسے ہونے چاہئیں اور سب کے ساتھ انصاف کرنا اس پر لازم ہے۔ کیا تاریخ عالم ایسی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے کہ خود سربراہ ریاست بلا جبر و کراہ خود کو قصاص کے لیے عوام کی عدالت میں پیش کرے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رحلت سے پیشتر بھرے مجمع میں بلا کر اعلان کیا کہ اگر کسی فرد پر مجھ سے کوئی غلطی ہوگی ہو تو وہ مجھ سے بدلہ لے سکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عدل اپنے بیگانے، دوست دشمن، امیر و غریب، مسلم اور غیر مسلم سب کے لیے یکساں اور بلا امتیاز تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرۃ طیبہ میں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کوئی مقدمہ لایا گیا جس میں ایک فریق مسلم اور دوسرا غیر مسلم تھا۔

فتح مکہ کے موقع پر بنی مخزوم کی فاطمہ نام کی ایک عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی۔ اس کی رہائی کے لیے بے پناہ دباؤ پڑا اور بالآخر اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو سفارشی بنایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روئے انور پر تکدر کے آثار نمودار ہوئے اور فرمایا:

”کیا تم حدود خداوندی میں سفارش کرتے ہو؟“

پہلی امتیں صرف اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی جرم کا مرتکب ہوتا تو اس سے چشم پوشی کی جاتی۔ کوئی معمولی آدمی پکڑا جاتا تو اسے سزا دلاتے۔

”خدا کی قسم! اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی چوری کرتی تو اسے بھی قطع ید کی سزا ضرور ملتی۔“^{۷۵}

انسان بنی نوع انسان کا ایک جزو لاینفک ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام افراد کو ایک امت کے ساتھ منسلک کیا اور فرمایا کہ تمام انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے بنایا ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:^{۷۶}

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ه.

”انسان کو اس نے ٹھیکری جیسے سوکھے سڑے ہوئے گارے سے بنایا۔“

قرآن حکیم میں انسانی جان کے محترم ہونے کے حوالہ سے ارشادات ربانی ملاحظہ

فرمائیں:

۱- أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا ط
وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا. ^{۷۷}

”جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔“

۲- وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ. ^{۷۸}

”اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔“

۳- وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ. ^{۷۹}

”اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے۔“

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف مواقع پر انسانی جان کی حرمت کی تلقین

فرمائی ہے:

۱- اکبر الكبائر الاشراک بالله و قتل النفس و حقوق الوالذین و قول الزور.

”بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے اور قتل نفس

اور والدین کی نافرمانی اور جھوٹ بولنا ہے۔“

- ۲۔ لن يزال المؤمن في فسحة من دينه عالم يصب وما حراما.
 ”مومن اپنے دین کی وسعت میں اس وقت تک برابر رہتا ہے جب تک وہ کسی حرام خون کو نہیں بہاتا۔“
- ۳۔ اول ما يحاسب به العبد الصلوة و اول ما يقضى بين الناس يوم القيامة في الدعاء.

”قیامت کے دن بندے سے سب سے پہلے جس چیز کا حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے۔ اور پہلی چیز جس کا فیصلہ لوگوں کے درمیان کیا جائے گا وہ خون کے دعوے ہیں۔“

اسلام نے کسی کی ناحق جان لینے والوں کے لیے قصاص کا حکم دیا ہے: ^{۵۰}
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ. ^ط
 ”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تمہارے لیے مقدموں میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔“

جان کے بدلے جان ہی لی جائے گی۔ اس میں امیر و غریب کا امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا۔ اس طرح اسلام نے امن قائم کرنے کی راہ ہموار کی۔ اسی وجہ سے تھا کہ قادیسیہ سے صنعاء تک ایک عورت تنہا سفر کر سکتی تھی۔ اس کی جان کو کوئی خطرہ ہوتا تھا اور نہ ہی مال کو۔ امن کو تہ و بالا کرنے والے سرکشوں کو تنبیہ کی گئی کہ ان کی بیخ کنی امن پسندوں کے حق حیات کو محفوظ کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ: ^{۵۱}
 الْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ.

”قتل اگرچہ برا ہے مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے۔“

کیونکہ قیام امن سے تمدن اور ترقی کی ضمانت میسر آتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات نہایت ہی سادہ فہم بھی تھیں اور جامع بھی۔ ان کا سرچشمہ وحی الہی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم توحید الہی کا پرچار فرماتے اور مسلمانوں کی روحانی تربیت کا اہتمام فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیش نظر مسلمانوں کی فلاح و بہبود تھی جس کے حصول کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عناصر اربعہ بیان فرمائے:

اولاً: ایمان باللہ اور یوم حساب۔ ایمان محض اقرار باللسان یا قلب کی ایجابی کیفیت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ تحت الشعور کی ایک ایقان کی کیفیت کا نام ہے۔ ایمان لانے کے بعد شبہات کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہر وقت آخرت میں احتساب کا دھیان رہنا چاہیے۔

ثانیاً: صالح جدوجہد جو ایمان سے مزین ہو۔ یہ عالمی امن اور بنی نوع انسان کی فلاح کی ضامن بھی ہونی چاہیے۔ ایمان کا فقدان عالمی فساد اور بگاڑ کا باعث بنتا ہے۔
 ثالثاً: حق کی مسلسل تلقین اور اس کی عظمت کے لیے بیانگ دہل کمر بستہ ہونا۔
 رابعاً: استقامت جو مصائب و مشکلات کے مقابلے میں تقویت قلب کا باعث بنتی ہے۔
 ارشاد ربانی ملاحظہ فرمائیں: ^{۸۲}

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبَّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَالْبَشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝
 ”جن لوگوں نے کہا: کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ نہ ڈرو، نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔“

حوالہ جات

- ۱ قرآن حکیم ۳: ۳۶
 - ۲ ام ایمن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد کی لونڈی تھیں۔ ان کا اصلی نام برکتہ تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے شادی کی تو ان کو آزاد کر کے زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے غلام تھے، سے شادی کر دی۔ اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہی کے لطن سے تھے۔
 - ۳ مسند احمد، الادب، المفرد
 - ۴ مشکوٰۃ، الادب المفرد، ج ۲، کتاب الادب
 - ۵ ترغیب و ترتیب منذری، ج ۲، ص ۱۳۴ بحوالہ ابن ماجہ نسائی
 - ۶ قرآن حکیم ۱۷: ۲۳-۲۴
 - ۷ قرآن حکیم ۳: ۳۶
 - ۸ قرآن حکیم ۳: ۳۴
- فَانِكْحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَنِّي وَتِلْكَ وَرُبِعٌ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاجِدَةٌ.
- ”جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو۔“
- ۹ قرآن حکم ۱۷: ۳۳
 - ۱۰ بخاری کتاب النکاح
 - ۱۱ نسائی، الادب المفرد
 - ۱۲ قرآن حکیم ۲: ۲۲۸
 - ۱۳ قرآن حکیم ۴: ۳۴
 - ۱۴ قوام یا قیم اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد یا ادارے یا نظام کے معاملات کو درست حالت میں چلانے اور اس کی حفاظت نگہبانی کرنے اور اس کی ضرورت مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو۔ (تفہیم القرآن جلد ۱، ص ۳۴۹، ابو الاعلیٰ مودودی)
 - ۱۵ بخاری و مسلم، باب النکاح
 - ۱۶ بخاری و مسلم، کتاب النکاح، باب الوصیۃ بالنساء

- ۱۷ قرآن حکیم ۱۹:۴
- ۱۸ قرآن حکیم ۳۱:۱۷
- ۱۹ ترمذی، کتاب البر و صلہ، باب ماجاء فی الادب الولد، سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فضل من عال یتیم
- ۲۰ بخاری کتاب الادب، مسلم کتاب البر
- ۲۱ بخاری کتاب الادب، باب بالجار الوصایا، ابوداؤد کتاب الادب باب حق الجوار
- ۲۲ مسلم باب الایمان
- ۲۳ مشکوٰۃ الادب الفرد، بخاری باب الاشمع دون
- ۲۴ قرآن حکیم ۸۳:۲
- ۲۵ قرآن حکیم ۱۷۷:۲
- ۲۶ قرآن حکیم ۲۵:۲
- ۲۷ قرآن حکیم ۹۰:۱۶
- ۲۸ قرآن حکیم ۲۶:۱۷
- ۲۹ قرآن حکیم ۳۸:۳۰
- ۳۰ بخاری، کتاب الادب، باب من بسط فی الرزق الصلۃ الرحم، ترمذی
- ۳۱ قرآن حکیم ۲۱۳:۲۶
- ۳۲ بخاری باب فضل من یتیم، مسلم باب فضل الاحسان الی الیتیم
- ۳۳ قرآن حکیم ۳:۴
- ۳۴ بخاری کتاب الزکاح
- ۳۵ قرآن حکیم ۲:۴
- ۳۶ ملاحظہ فرمائیں: سورۃ ہائے بقرہ، نساء، انفال اور حشر
- ۳۷ قرآن حکیم ۶۰:۲۳
- ۳۸ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق
- ۳۹ قرآن حکیم ۱۵۷:۷
- ۴۰ ابن ہشام حصہ دوم، ص ۴۷۸
- ۴۱ قرآن حکیم ۱۳:۴۹
- ۴۲ مسند احمد
- ۴۳ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۲، ص ۲۲۷ شبلی نعمانی
- ۴۴ مسلم کتاب الایمان

- ۴۵ بخاری، ج ۲ کتاب الادب، باب لجرۃ
- ۴۶ یہ دونوں تعدادیں امیر اسماعیل نے شرح بلوغ المرام، کتاب العتق میں نقل کی ہیں۔ بحوالہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۶، ص ۱۵۸ شبلی نعمانی
- ۴۷ قرآن حکیم ۲۴: ۳۳
- ۴۸ قرآن حکیم ۹۰: ۱۳
- ۴۹ بخاری، کتاب المعاصی من امر الجاہلیہ، ابوداؤد کتاب الادب
- ۵۰ بخاری، باب المفرد، سنن ابی ماجہ کتاب الوصایا
- ۵۱ راوی ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی حق الملوک
- ۵۲ بخاری، کتاب العتق
- ۵۳ بخاری، کتاب الادب، باب ما تثنی عن السباب
- ۵۴ کتاب الاموال ابی عبید قاسم بن سلام، المتونی، ۲۳۴ مطبوعہ مصر، ص ۲۳۵ بحوالہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۶، ص ۱۵۹ شبلی نعمانی
- ۵۵ ابن سعد
- ۵۶ ابوداؤد کتاب الجہاد، مسند ابن حنبل
- ۵۷ ابوداؤد، باب قسمۃ الفی
- ۵۸ بخاری
- ۵۹ مبسوط سرخسی، ج ۱۰، ص ۹۱-۹۲، شرح السید الکبیر، ج ۱، ص ۶۹ سرخسی بحوالہ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیاسی زندگی، ص ۱۲۱
- ۶۰ بخاری وفد بنی حنیفہ
- ۶۱ بحوالہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۷، ص ۶۶ شبلی نعمانی
- ۶۲ بخاری کتاب الاحکام
- ۶۳ مسلم
- ۶۴ ابن ماجہ، ج ۲، ص ۹۵۶
- ۶۵ بخاری کتاب الاحکام
- ۶۶ مشکوٰۃ الامارت، ص ۳۱۹
- ۶۷ ایضا
- ۶۸ بخاری کتاب النکاح
- ۶۹ بخاری، مسلم مشکوٰۃ

- ۷۰ کے مسلم، مشکوٰۃ
 ۷۱ کے بحوالہ خطبات بہاول پور، ص ۵۲ ڈاکٹر محمد حمید اللہ
 ۷۲ کے ایضاً
 ۷۳ کے قرآن حکیم ۲: ۱۳۵
 ۷۴ کے قرآن حکیم ۵: ۸
 ۷۵ کے بخاری کتاب الحدود، باب اقامة الحدود
 ۷۶ کے قرآن حکیم ۵۵: ۱۴
 ۷۷ کے قرآن حکیم ۵: ۳۲
 ۷۸ کے قرآن حکیم ۶: ۱۵۱
 ۷۹ کے قرآن حکیم ۲۵: ۶۸
 ۸۰ کے قرآن حکیم ۲: ۱۷۸
 ۸۱ کے قرآن حکیم ۲: ۱۹۱
 ۸۲ کے قرآن حکیم ۳۱: ۳۰

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عسکری فراست

قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.

”درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایک

بہترین نمونہ تھا۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر نظریہ ہر قول، ہر فعل اور ہر قدم اپنی جامعیت و کاملیت میں بے مثل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمت عملی علم اور منصوبہ بندی دونوں ہی بے نظیر اور قابل تقلید ہیں۔ مسلمانوں کی زندگی، آزادی اور وقار کی لیے جلال ناگزیر ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے:

إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبِكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ وَيَسْتَبْدِلُ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَفْرَهُ

شَيْئًا ۝ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ.

”تم نہ اٹھو گے تو خدا تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ کسی اور گروہ کو

اٹھائے گا، اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“

لیکن اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور انہیں تباہ کرنے کے لیے ان کا کفار ہی ہونا کافی تھا۔ بلکہ جن قبائل پر لشکر کشی کی گئی وہ پہلے سے آمادہ جنگ اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غزوات و محاربات مقصود بالذات نہ تھے بلکہ وہ بقول علامہ شبلی نعمانی سلسلہ دعوت میں اتفاقاً پیش آ گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے بعد سب سے پہلا کام حفاظت خود اختیاری کا کیا یعنی:

اولاً: قریش کی شامی تجارت کی ناکہ بندی کی جائے تاکہ ان کی معیشت پر ضرب کاری

لگائی جاسکے۔ سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مکہ میں ابو جہل کو اسی کی دھمکی دی تھی۔

ثانیاً: مدینہ کے قرب و جوار کے قبائل سے امن و صلح کا معاہدہ کیا جائے۔

اس کے پیش نظر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کی بہترین فوجی تربیت کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیادت میں ایک نئی فوجی تاریخ رقم کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں اکیس جہاد کیے۔ اسلام کے نزدیک جنگ پسندیدہ نہیں بلکہ ایک ناگزیر اقدام ہے اور اس کی اجازت درج ذیل چند صورتوں میں ہے۔

اول: کفار مسلمانوں پر حملہ کر دیں۔

دوم: مسلمانوں کو کفار سے حقیقی خطرہ ہو اور اس امر کا قوی احتمال ہو کہ وہ اس سے باز نہیں آئیں گے۔

سوم: مسلمانوں اور کفار کے درمیان کوئی معاہدہ ہو اور کفار اس کی پاسداری نہ کریں یا اسے توڑ دیں۔

چہارم: کفار مسلمانوں کو فرائض اسلام کی بجا آوری میں مانع ہوں اور مداخلت کریں۔
پنجم: مسلمانوں کے شعائر اسلامی کی بے حرمتی ہو رہی ہو۔

چنانچہ جہاد فی سبیل اللہ سید قطب شہید کے الفاظ میں ”زمینی اقدار اور پابندیوں سے خلاصی پانے کا نام ہے۔ گوشت پوست اور خونی رشتوں پر فتح یابی ہے۔ انسان کے اندر جو علوی معنی پایا جاتا ہے اس کی تحقیق ہے۔ انسان کے جسم میں جو شوق پایا جاتا ہے وہ اسے ادھر ادھر جھکا دیتا ہے اور انسانی ضروریات اور مقیدات پر غالب آنے کا نام ہے۔ یہ فنا سے بقا تک لے جانے کا نام ہے“

فوج کی تیاری (اقدامات قبل از جنگ)

ایک عظیم جرنیل کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ جو فوج تیار کرتا ہے اس کے پائے استقلال کو سخت سے سخت آزمائش بھی متزلزل نہیں کر سکتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے فوراً بعد امت کی عسکری تربیت پر بھرپور اور خصوصی توجہ دی۔

تربیت

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی سپاہ کی فطری اور آفاقی اصولوں کو مد نظر رکھ کر تربیت کی اور ان کو ربط، تسلسل اور ثبات کے اصولوں پر عمل پیرا ہونا سکھایا۔ ان کو یہ بات ذہن نشین

کرائی کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی مالک حقیقی ہے اس لیے صرف اسی کے آگے ہی سر بسجود ہونا ہے۔
اگر اس کی راہ میں قتال کرتے ہوئے جاں بحق ہو جائیں تو شہید کہلائیں گے اور اگر زندہ بچ
جائیں تو غازی کے نام سے جانے جائیں گے۔ اسی جذبہ سے سرشار ہو کر خالد بن ولید رضی اللہ
تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ:

”ہمیں موت اتنی ہی عزیز ہے جتنی تمہیں زندگی۔“

بقول اقبال ۔

کشاد در دل سمجھتے ہیں اس کو

ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ فَانفِرُوا ثَبَاتٍ أَوْنُفِرُوا جَمِيعًا.

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، مقابلہ کے لیے ہر وقت تیار رہو، پھر جیسا موقع

ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکل ویا اکٹھے ہو کر۔“

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر صحابہ کرامؓ کو فوجی مشقوں کی غرض سے مدینہ کے

گرد و نواح میں لے جایا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے کہ:

انَّ الْقُوَّةَ الرَّمِيَّ. ”یقیناً قوت نشانہ بازی ہے۔“

ایک سپاہی کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ مشقت برداشت کرنے کا عادی ہو۔ اسی لیے

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی سپاہ کو طویل مسافت پر روانہ فرماتے تاکہ وہ جغرافیائی حالات

اور موسم کی نامساعدت کے خوگر بن سکیں۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حمزہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہ اور دیگر اصحابؓ کی سرکردگی میں بھیجے گئے سرایا اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ اگر ایک طرف

انہوں نے سرحدوں اور No man's Lands کے متعلق تازہ بہ تازہ معاملات حاصل

کیں تو دوسری طرف غفار، بنو خزیمہ اور بنی مدینہ وغیرہ قبائل سے جنگی نوعیت کے معاہدات بھی

طے ہوئے۔ اس کا جہاں دشمن پر نفسیاتی اثر پڑا وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی گونہ

اطمینان حاصل ہوا کیونکہ انہی قبائل کے علاقے سے قریش کے قافلے گزرا کرتے تھے۔

مسلمانوں کے حلیف بن جانے کے بعد انہوں نے قریش کے قافلوں کے گزرنے پر پابندی

عائد کر دی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت جسمانی ہی کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے محض چھ

روز میں مدینہ کی سنگلاخ زین میں نو ہزار گز لمبی، پانچ گز چوڑی اور چار گز گہری خندق فاقے کی حالت میں کھودی۔ خندق کے حدود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود قائم کیے اور اسے کھودنے میں خود برابر شریک رہے۔ محاصرہ کے دوران میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر تین تین فاقے گذر گئے۔ ایک روز صحابہ کرام نے آپ کو اپنے پیٹ پر بندھے پتھر دکھائے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ حضور کے شکم مبارک پر ایک کی بجائے دو پتھر بندھے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک عام فرد کی طرح خندق کھودنے میں حصہ لیا یہاں تک کہ شکم مبارک پر مٹی اور خاک کی ایک تہہ جم گئی تھی۔^{۱۱}

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں ابھی مستقل فوج قائم نہ ہوئی تھی اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر بار ہر دستہ میں نئے رضا کار لیتے تاکہ ہر فرد کو باری باری فوجی خدمت سرانجام دینے کا موقع مل سکے۔ اس طرح مستقل فوج پر ہی مکمل بھروسہ کرنا ٹھیک نہیں۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی افواج میں غیر مسلموں کو شامل نہ کیا جائے کیونکہ ان کے پانچویں کالم ہونے کا امکان ہر وقت رہے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے لشکر میں نابالغ افراد کو شامل نہیں کرتے تھے کیونکہ جہاد ایک فریضہ الہی ہے اور اس کے لیے بلوغ کی پابندی ہے۔ غزوہ بدر میں مدینہ سے ایک میل کے فاصلے پر ایک مقام بئر ابی غبتہ پہنچ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لشکر کا جائزہ لیا اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ اس بنا پر واپس بھیج دیے گئے کہ وہ سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے۔ اسی طرح غزوہ احد کے موقع پر بھی زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ، براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عرابہ بن اوسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کم عمر ہونے کی بنا پر واپس کر دیا گیا لیکن جاں شاری کا یہ ذوق تھا کہ رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جب واپس آنے کو کہا گیا تو وہ انگوٹھوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد اونچا نظر آئے۔ چنانچہ ان کو لے لیا گیا۔^{۱۲} سمرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہم سن تھے۔ انہوں نے رافع رضی اللہ تعالیٰ کو پچھاڑنے کا دعویٰ کیا۔ چنانچہ دونوں کا مقابلہ کرایا گیا اور سمرۃ رضی اللہ تعالیٰ نے رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زمین پر دے مارا۔ اس طرح ان کو بھی شامل سپاہ کر لیا گیا۔^{۱۳}

۸ھ میں سریہ موتہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوج کا علم زید بن حارثہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا کیا اور فرمایا کہ ان کی شہادت کی صورت میں یہ امانت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور پھر عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا ہو۔ اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان باہم مشورے سے جس کو چاہیں اپنا سردار چن لیں۔ یہ درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تربیتی پروگرام کا ایک حصہ تھا۔ چنانچہ پہلے زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شہادت پائی، پھر ان کی جگہ جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے اور ان کی شہادت کے بعد عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسلمانوں کی قیادت سنبھالی۔ بالآخر انہوں نے بھی جام شہادت نوش کیا۔ مسلمانوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے پیش نظر خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا قائد چنا جو ان کو بحفاظت رومیوں کے زرعے سے نکال کر واپس مدینہ لائے۔ ۱۳ جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بدن پر نوے زخم بھالے اور تیر کے تھے خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ سے نو تلواریں لڑتے لڑتے ٹوٹ گئیں، صرف ایک یمنی تیغ رہ گیا جو نہیں ٹوٹا۔ ۱۴

گھوڑے، اونٹ اور اسلحہ

قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ملاحظہ فرمائیں: ۱۵

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخِرِينَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ط

”اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لیے مہیا رکھو تا کہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوف زدہ کر دو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔“

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حقیقت کا مکمل ادراک رکھتے تھے کہ گھوڑا صحرا میں زندگی بسر نہیں کر سکتا کیونکہ گرنگی اور تشنگی اس کی برداشت سے باہر ہے لیکن سرعت اور فرمانبرداری کے لحاظ سے میدان کارزار کے لیے ایک بے نظیر سواری ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ۱۶

”گھوڑوں کی پیشانی میں قیامت تک برکت رہے گی۔“

گھوڑے کے برعکس اونٹ ایک صحرائی جانور ہے اور صحرا میں محض خشک کانٹے دار جھاڑیاں ہی کھا کر اپنے معدہ کو تسکین دے دیتا ہے اور ایک مرتبہ پانی پی لینے کے بعد چند روز اس کے بغیر بھی گزارا کر لیتا ہے۔ اسی لیے غزوات اور سرایا جو صحرا میں لڑے گئے ان میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گھوڑوں کی بجائے اونٹوں کو ترجیح دی۔ ایسا ایک لحاظ سے مندرجہ بالا ارشاد ربانی کی تکمیل بھی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آلات حرب کی فراہمی اور تیاری کی طرف بھرپور توجہ دی۔ غزوہ ہوازن کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع ملی کہ صفوان بن امیہ، جو کثیر السلاح کے نام سے مشہور تھا کو اسلحہ کے حصول کے لیے پیغام بھیجا۔ اس طرح اس سے سوزر ہیں اور دیگر اسلحہ عاریتاً حاصل کیا۔ کچھ ہی عرصہ میں عبداللہ ربیعہ، جو مکہ کے ایک نہایت دولت مند شخص تھے، سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیس ہزار درہم قرض لیے۔^{۱۸} طائف اور حنین کے غزوات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منجیق استعمال کی۔ اس سے ثابت ہوا کہ دشمن پر ضرب کاری لگانے کے لیے معیاری آلات حرب کا مالک ہونا کتنا ضروری ہے۔ طائف کے محاصرہ میں مسلمانوں نے پہلی دفعہ قلعہ شکن آلات یعنی دبابہ اور منجیق استعمال کیے۔^{۱۹} طبری اور ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ عروہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور غیلان بن سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جرش (یمن کا ایک علاقہ) میں جا کر قلعہ شکن آلات کے بنانے اور استعمال کرنے کا فن سیکھا تھا۔^{۲۰}

حالات سے مکمل آگاہی

ایک قائد اس وقت تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا جب تک وہ حالات سے مکمل طور پر آگاہ نہ ہو۔ اس کے لیے فوجی کمانداروں سے حاصل کردہ رپورٹوں کی روشنی میں آئندہ کالائے عمل تیار کیا جاتا ہے۔ گشتی پیٹرول کرنے والوں کی کارکردگی ہی فتح یا شکست کا باعث بنتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سپہ سالاری اور علمبرداری کے فرائض سونپتے وقت میرٹ کو ہی بنیاد بناتے۔ اس طرح ان کی صلاحیتوں کا بہترین استعمال ہوتا اور ان کے پیش نظر بھی یہ بات رہتی کہ انہوں نے امانت کو اپنی زندگی کا شعار بنانا ہے۔ اپنی عسکری فراست کے پیش نظر

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیشہ ہی دشمن کی جنگی تیاریوں کا درست انداز لگایا، صورت حال سے ہمیشہ ہی باخبر رہے اور ایسا لائحہ عمل تیار کیا کہ دشمن کی چالیں دھری کی دھری رہ گئیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دشمن کے ناگہانی حملوں کی بھی فکر رہتی تھی اسی لیے اس کے مدارک کے طور پر اپنا دفاعی نظام ہمیشہ ہی مضبوط رکھا۔ جب کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تو اپنی غیر موجودگی میں ایک نائب اور کچھ فوج ضرور چھوڑ جاتے، جیسے غزوہ بدر کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابولبابہ بن عبدالمبذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا۔ رازداری کا یہ عالم تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوائے غزوہ تبوک کے ہر غزوہ کے لیے روانگی کے وقت اپنے ارادے کو صیغہ راز میں رکھا۔^{۲۱} فتح مکہ کے موقع پر امہات المؤمنین تک کو سفر کی منزل کا علم نہ تھا۔ اس رازداری کے باعث ہی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بے خبری میں قریش کو جالیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کی نقل و حرکت سے باخبر رہنے کے لیے باقاعدہ آٹھ جاسوسی دستے روانہ کیے۔

غزوہ احد کے لیے قریش کی روانگی کی اطلاع آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے چچا عباس کے ذریعے ملی جو ابھی مکہ میں ہی مقیم تھے اور مشرف بہ اسلام نہ ہوئے تھے۔ غزوہ احزاب کے موقع پر خندق کی کھدائی میں چھ روز^{۲۲} صرف ہوئے لیکن حملہ آوروں کو پہلے اس کا علم نہ ہو سکا۔ اس غزوہ میں بنو قریظہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عہد شکنی کی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تصدیق کے لیے سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور خوات بن جبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا اور تاکید فرمائی کہ اگر اس خبر میں کوئی صداقت ہے تو واپسی پر مجھے اشارہ کنایہ میں اطلاع دیں تاکہ برملا انکشاف سے لوگوں میں بددلی نہ پھیلے۔

غزوہ ہوازن سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفار کے اجتماع کی خبریں ملیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تصدیق کے لیے عبد اللہ بن ابی حذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا۔ وہ جاسوس بن کر حنین میں پہنچے اور کئی ایک روز تک فوج میں رہ کر تمام حالات تحقیق کیے۔ ان کی فراہم کردہ اطلاعات کی روشنی میں ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقابلہ کی تیاریاں کیں۔^{۲۳}

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ بھی عادت مبارکہ تھی کہ اپنے کیمپ کے ارد گرد محافظ اور پہرہ دار بھی متعین فرماتے:

انضباط

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی سپاہ میں بے مثل انضباط پیدا کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اطاعت امیر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

”اگر چھٹی ناک والا حبشی بھی تمہارا حاکم بنا دیا جائے تو اس کی بھی اطاعت کرو۔“

مسلمانوں نے اس پر مکمل طور پر عمل کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر مہم کے لیے نیا کماندار مقرر فرماتے: جو بعد میں کسی دوسری مہم میں ایک عام سپاہی کی حیثیت میں کسی دوسری مہم میں شرکت کرتا اور اس میں کسی قسم کی سبکی محسوس نہ کرتا۔ سریہ سیف البحر میں امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کماندار تھے جب کہ سریہ رابع میں عبیدہ بن الحارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سریہ ضرار میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کمان عطا ہوئی۔ موتہ کی لڑائی میں کمان زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حصہ میں آئی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک آزادہ کردہ غلام تھے۔ ان کے ماتحت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے جلیل القدر جرنیل تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ کا جو آخری لشکر تیار کیا اس کی قیادت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرزند اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سونپی گئی۔ اس لشکر میں لاتعداد جلیل القدر صحابہ کرام شامل تھے اور کسی کو ایک نوجوان کی قیادت پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہی تربیت کا نتیجہ تھا کہ جب عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کمان سے معزول کیا تو انہوں نے بلا کم و کاست حکم کی اطاعت کی اور ایک سپاہی کی حیثیت سے اس فوج میں خدمات سرانجام دیں۔

اب انضباط کا ذکر لشکر کے مارچ کرنے کے حوالے سے دیکھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لشکر کو تربیت دیتے اور ہر سمت ایسے افراد مقرر فرماتے جو ادھر کے حالات سے زیادہ واقف ہوتے اور بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتے۔ لشکر کے تین بڑے حصے..... مقدمۃ الجیش، تسم اکبر

اور موخر دستہ..... ہوتے۔ ان کا ہمیشہ آپ میں مواصلات کا سلسلہ قائم ہوتا۔ لڑائی کے لیے لشکر کو چار حصوں یعنی یمینہ، میسرہ، قلب اور محفوظ میں تقسیم کیا جاتا۔ تیر انداز ہمیشہ ہی بازوؤں پر تعینات ہوتے۔ دشمن کے گھڑ سوار دستوں کو روکنے کے لیے نیزہ بردار اگلی صفوں میں تعینات کیے جاتے جب کہ تلوار بردار دستے آخری صفوں میں متعین کیے جاتے۔ تیر اندازوں کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد تھا کہ وہ اس وقت تک تیر نہ چلائیں جب تک دشمن انتہائی قریب یعنی رزم گاہ میں نہ پہنچ جائے۔ غزوہ بدر میں دستوں کی ترتیب اس طرح رکھی گئی کہ یلغار کے وقت سورج مسلمانوں کی پشت کی جانب تھا جب کہ اس کی شعاعیں قریش کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ دشمن کو جلد از جلد ناکارہ بنانے کے لیے حکم تھا کہ ان کے جوڑوں پر ضرب لگائی جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لڑائی کے لیے جاتے تو لڑائی سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نصرت کے اس طرح طالب ہوتے:

اللهم انت عنصري، ونصيري بك احوول و بك احوول و بك اقاتل.

”اے اللہ! تو میرا دست و بازو ہے، تو میرا پروردگار ہے۔ تیرے سہارے پر میں مدافعت کرتا ہوں، حملہ کرتا ہوں اور لڑتا ہوں۔“

اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے اور اپنی آوازوں کو پست رکھتے، شور و غل سے پرہیز کرتے۔^{۲۵}

تور یہ (دکھاوا)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لڑائی کا ارادہ کرتے تو اکثر تور یہ سے کام لیتے اور فرماتے:

الْحَرْبُ خُدْعَةٌ.

”لڑائی دھوکہ ہے۔“

کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے:

ولم يكن رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم بريد غزوة إلا دى

ی بغیرھا.

یعنی ”اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو کسی اور موقع کا تو یہ فرماتے تھے۔“

غزوہ بدر میں بدر پر پڑاؤ ڈالنے سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ملاقات عرب کے ایک شیخ سے ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے قریش کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے جواباً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق استفسار کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے اپنے سوال کے متعلق مکرر پوچھا تو اس نے قریش اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لشکر دونوں کے متعلق بتایا کہ وہ اس وقت فلاں فلاں جگہ پر ہوں گے۔ پھر اس نے پوچھا:

”اب تم بتاؤ، تم کہاں سے آئے ہو؟“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”ہم کنوئیں سے آئے ہیں۔“ یہ کہا: اور واپس چلے آئے۔

وہ شیخ حیران ہو کر کہتا تھا:

”کنوئیں سے آئے ہیں؟ کیا عراق کے کنوئیں سے آئے ہیں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ جنگی حکمت عملی تھی کہ دشمن کو تذبذب میں رکھنے کے لیے محض تیاری کا حکم دیا جاتا، منزل مقصود خفیہ رکھی جاتی اور غیر معروف راستوں سے ہوتے ہوئے اچانک یلغار کی جاتی۔ اچانک حملہ انہی قوموں پر کیا جاتا جن کی نسبت یہ احتمال ہوتا کہ ان کو خبر ہوگی تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا کسی اور مقام پر بھاگ جائیں گے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ ان لوگوں کو خبر ہوئی اور وہ کسی اور طرف چل دیئے۔ ایسی مثالیں غزوہ سلیم ۳ھ غزوہ ذات الرقاع ۴ھ سریہ عکاشہ ۶ھ، سریہ علی بنی سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۶ھ، غزوہ بنو لحيان ۶ھ، سریہ عمرالی قریہ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۷ھ اور سریہ کعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۸ھ کی ہیں۔

فتح مکہ کے وقت کوچ مکہ کی جانب جنوب کی بجائے شمال کا رخ کیا۔ جس سے گمان ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شاید باز نطینوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے جا رہے ہیں۔ وہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حلیف افراد کو ساتھ لے کر شمال مشرق کا رخ کیا اور پھر جنوب مشرق کو چلے۔ اس طرح رخ بدل بدل کر سفر کیا تا کہ کسی کو پتہ نہ چل سکے۔ دشمن کو

اچانک دبوچ لینا کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اچانک مکہ پہنچ جانا قریش کی بددلی کا باعث ہوا۔

حضور صلی علیہ وآلہ وسلم نے غزوہ احزاب کے سوا باقی تمام غزوات میں اچانک اصول پر عمل کیا اور ہر موقع پر طریق ہائے جنگ پر کامل مہارت کا ثبوت دیا۔ غزوہ حنین میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے شمال میں روانہ ہوئے اور نصف دائرہ بناتے ہوئے بحر انہ سے دشمن کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ صرف غزوہ تبوک کے موقع پر منزل ظاہر کی گئی تاکہ مسلمان نامساعد حالات میں دور دراز کے سفر کے لیے مناسب تیاری کر لیں۔ نیز ان کو معلوم ہو کہ مد مقابل ایک بہت بڑی قوت ہے۔ لیکن استعمال خفیہ راستوں کا ہی کیا گیا۔ غزوہ تبوک میں لڑائی کی نوبت نہ آئی لیکن مسلمانوں کا دشمن کی دہلیز پر پہنچ جانا ان کو مرعوب کرنے کے لیے کافی تھا۔ یہ نفسیاتی فتح سیاسی فتح میں تبدیل ہو گئی۔ ہر قل کو پتہ چل گیا کہ اسے مسلمانوں کے متعلق بد حالی کی جو اطلاعات مل رہی تھیں، وہ باطل تھیں۔ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر بصیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح کے تمام فوائد حاصل کر لیے۔ غزوات خیبر اور عطفان میں بھی اچانک پن کا یہی مظاہرہ کیا گیا۔ دومتہ الجندل کا حکمران نیل گائے کے شکار میں مصروف تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ بنو مصطلق پر بھی صبح سویرے حملہ کیا گیا۔

عام طور پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سپاہ میں کئی کئی سپاہی مشترکہ طور پر کھانا پکاتے تھے مگر فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دس ہزار سپاہ کو مکہ کی وادی میں پھیل جانے اور فردا فردا آگ کی مشعلیں روشن کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح مسلمان اصل تعداد کے مقابلے میں کوئی پانچ گنا زیادہ نظر آئے۔ اس سے قریش کے حوصلے پست ہوئے۔ اسی وجہ سے ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ایک تنگ گھاٹی کے اونچے کنارے پر کھڑا کیا تاکہ وہ پورے لشکر کی حرکت کا مشاہدہ کر سکے۔ یہ ایک بہت بڑا نفسیاتی حربہ تھا جس سے وہ بالکل ہی بددل ہو گیا۔ رہی سہی کسر اس کے گھر کو دارالامان قرار دینے کے اعلان سے نکل گئی۔

تحفظ اور چوسی

ارشاد ربانی ہے:

خذوا حذرکم۔

”حفاظت، دفاع مکمل کرلو۔“

اس ارشاد کے مطابق سپاہ کو تحفظ، اسباب و اسلحہ کا تحفظ اور معلومات کا تحفظ شامل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود راتوں کو پہرہ دیا کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب ۲ھ میں عبداللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لطن نخلہ کی طرف روانہ کیا تو ان کو ایک سر بمہر لفافہ دیا۔ فرمایا کہ اسے دو روز بعد کھولنا اور ہدایات پر عمل کرنا۔ خط کے مندرجات درج ذیل تھے: ۲۶

”برابر چلے جاؤ یہاں تک کہ نخلہ میں جا کر ٹھہرو جو مکہ اور طائف کے بیچ میں ہے اور قریش کی دیکھ بھال کرتے رہو اور ان کی خبریں دریافت کرو۔“

اسی طرح فتح مکہ کے موقع پر مکہ کے ارد گرد پہاڑیوں پر الاؤ جلانے کا مقصد دشمن کو مسلمانوں کی اصل تعداد کے متعلق غلط فہمی میں ڈالنا تھا۔ غزوہ ہوازن میں ایک شب انس بن ابی مرشد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو طلایہ گروی پر مامور کرتے وقت ہدایات دیں۔ اس فرض کے لیے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ، سامنے والے پہاڑ کی گھائی پر بطور خاص رات بھر نظر رکھو، ادھر سے کوئی ادھر نہ آنے پائے۔“

مالی وسائل کی فراہمی

کسی بھی فوج کی تیاری کے لیے مالی وسائل ناگزیر ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت کی تمام تر تہی دستی کے باوجود امت کی ایسی تربیت فرمائی کہ ہر لڑائی کے لیے عطیات جمع کرنے کے لیے ہر فرد دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا۔ اس ضمن میں غزوہ تبوک کی مثال درخشاں ہے۔ اس میں ہر فرد نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر عطیات جمع کرنے میں حصہ لیا۔ اگر عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا آدھا مال پیش کیا تو صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا سارا گھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔ اس قدر کم جانی و مالی وسائل کے باوجود ایک بہترین فوج کی تشکیل ایک عظیم عسکری کارنامہ ہے۔

ایک واضح نصب العین

ایک عظیم جرنیل اس خوبی سے بھی متصف ہوتا ہے کہ اپنی سپاہ کے ہر فرد تک نہایت ہی

موثر اور منطقی طریقے سے ایک واضح نصب العین پہنچائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا عظیم نصب العین تھا نہ کہ دنیاوی مقصد، علاقہ، دولت یا شہرت کا حصول۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مسلمان کے لیے شکست موت نہیں بلکہ اصولوں سے انحراف قرار دیا۔

یہ اسی نصب العین کا ہی اعجاز تھا کہ مسلمان عظیم مقصد کی راہ میں بے جگری سے لڑتے تھے اور اپنا آخری قطرہ خون تک بہانا سعادت کی انتہا سمجھتے تھے۔

دوران جنگ (مشاورت)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مشاورت کی طرح ڈالی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ عادت مبارک تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قبل ہر ایک متعلقہ فرد سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ فیصلہ کرنے سے پہلے ہر ایک اچھے نظریہ کی پذیرائی فرماتے لیکن جب فیصلہ کر لیتے تو پھر اس میں رد و بدل ناممکن ہوتا تھا۔

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مروی ہیں:

”میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر اپنے دوستوں سے مشورہ

کرنے والا کوئی نہیں دیکھا۔“

غزوہ بدر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ سے نکل کر بدر میں مدینہ کی طرف نزدیک والے کنوئیں پر اترے۔ جناب بن منذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے حکم سے یہاں اترے ہیں یا کسی حربی تدبیر کے پیش نظر ایسا کیا ہے؟

فرمایا: ”حربی تدبیر کے پیش نظر ہی ایسا کیا ہے۔“

انہوں نے کہا: ”پھر مناسب نہیں۔ ہمیں قریش کے نزدیک والے کنوئیں پر اترنا چاہیے اور اس کے پیچھے جتنے کنوئیں ہیں، سب مٹی سے بھر دینے چاہئیں۔ پھر ہم تالاب کھود کر پانی سے بھر لیں ایسا کرنے سے ہمارے پاس پینے کے لیے وافر پانی ہوگا اور ان کے پاس پینے کے لیے پانی نہیں ہوگا۔“

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا اور اس کے مطابق عمل کیا۔ لیکن اس کے باوجود دشمنوں کو پانی لینے کی عام اجازت دی۔^{۲۷}

غزوہ احد کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوجوان صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مشورہ مانا اور مدینہ سے باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کیا۔ حالانکہ عبداللہ بن ابی نے محصور ہو کر لڑنے کا مشورہ دیا تھا۔ اسی بنا پر اس نے اپنے تین سوا افراد مسلم سپاہ سے نکال لیے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا: ”پیغمبر زرہ پہن کر اتار نہیں سکتا۔“ لیکن اس نے سنی ان سنی کر دی۔

غزوہ احزاب کے موقع پر سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشورہ پر خندق کھودی گئی۔ اس سے پہلے اہل عرب اس طریقہ سے بالکل ناواقف تھے۔ غزوہ طائف کے موقع پر جب بنی ثقیف محصور ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوفل بن معاویہ الدیلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا:

”اہل طائف لومڑی کی طرح ہیں۔ لومڑی اپنے بھٹ میں گھس گئی ہے۔ اگر

کوشش جاری رہی تو پکڑ لی جائے گی۔ چھوڑ دی جائے تو کوئی نقصان نہ ہوگا۔“

اس رائے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محاصرہ اٹھالیا۔

اس سے غزوات و سرایا کا مقصد بھی آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اگر آپ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کا مقصد ملک گیری، جوع الارض یا اقتدار ہوتا تو فتح تک محاصرہ جاری رہتا۔

غزوہ خیبر میں حباب بن منذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے

پڑاؤ والی جگہ کے متعلق استفسار کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جگہ حکم خداوندی کے

تحت کیمپ لگایا ہے یا حربی تدبیر کے تحت۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حربی تدبیر کے تحت ایسا

کرنے کو کہا تو حباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا:

”یہ جگہ قلعہ نطاہ کے بالکل قریب ہے۔ زیادہ تر ان (یہود) کی تربیت یافتہ اور جنگ

آزمودہ فوج اسی قلعہ میں ہے، وہ ہمارے نظام حالات سے واقف ہیں جب کہ ہم ان کے

حالات سے واقف نہیں۔ ان کے تیرہم تک پہنچ سکتے ہیں اور ہمارے تیر ان تک نہیں پہنچ سکتے

اور ہم پر ان کے شب خون مارنے کا بھی ہر وقت خطرہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ کھجوروں سے گھری

ہوئی نشیبی جگہ ہے اور بیماری کا گھر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حکم دیں تو ہم ان مفاسد سے خالی جگہ کمپ لگائیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی یہ رائے پسند فرمائی۔ اور فرمایا: ”تمہارا مشورہ درست ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبوک میں کم و بیش بیس روز قیام فرمانے کے بعد دیکھا کہ ہرقل کی طرف سے کوئی پیش قدمی نہیں ہو رہی، اردگرد کے قبائل سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاہدات طے فرمائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار و مہاجرین سے مشورہ کیا کہ رومیوں کے علاقے میں پیش قدمی کی جائے یا واپسی اختیار کی جائے۔ صحابہ کرامؓ کے مشورے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واپسی کے لیے کوچ کا حکم دیا۔

زمین کا چناؤ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیشہ ہی دشمن کے مقابلے میں لڑائی کے لیے ایک بہتر مقام کا انتخاب کیا۔

غزوہ بدر کی مثال لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ریتلی زمین کا انتخاب کیا اور نشیبی زمین قریش کے حصے میں آئی۔ اس طرح بارش کے پانی نے ان کی مشکلات میں اضافہ کیا۔

خوراک کی فراہمی

دوران لڑائی یہ ضروری ہے کہ خوراک کی رسد سادگی سے جاری رہے۔ یہ چیز سپاہ کی کارکردگی کو بہتر بنانے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ غزوہ بدر میں قریش اپنے لیے روزانہ ہی اونٹ ذبح کرتے۔ یہ چیز وقت کے ضیاع اور توجہ کے مبذول کرنے کا باعث بنتی۔ اس کے علی الرغم مسلمانوں کے ہر سپاہی کے پاس کھجوریں، ستوا اور پانی موجود تھا۔ وہ ستو کو پانی میں گھول کر نوش کر لیتے۔ نظام رسد میں سادگی ان کو سرعت الحریکت بننے میں مدد ثابت ہوئی۔

ایک غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع ملی کہ کچھ لوگوں کے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں جب کہ بعض کے پاس خاصی خوراک موجود ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”سب لوگ اپنے کھانے کی چیزیں لے آئیں۔“

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کا مساوی راشن مقرر فرما دیا۔ اس طرح سب کو خوراک کی بہم رسانی آسان ہو گئی اور قرآن حکیم کے حکم **كُلُوا جَمِيعًا** کا مفہوم بھی ادا ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی موقع پر حکم دیا کہ اب تمہیں الگ کھانے کی اجازت نہیں، سب کو ایک جگہ سے ایک جیسا کھانا ملے گا۔

جدت و تنوع

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لڑائی سے پہلے خود دست مبارک میں تیر لے کر سپاہ کی صفوں کو درست فرماتے تھے جب کہ اس کے برعکس کفار کی فوج میں کوئی تربیت و صف بندی نہ تھی۔ صف بندی ایک افسر (امام) کی اطاعت، تمام سپاہیوں (نمازیوں) کی باہم محبت اور دستگیری اور ایک تکبیر کی آواز پر پورے صفوف کی حرکت اور نشست و برخاست مسلمانوں کو صف جنگ کے اوصاف سکھاتی ہے۔^{۲۹}

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ سنت مبارک تھی کہ شب خون نہ مارا جائے بلکہ آپ علی الصبح طلوع آفتاب کے وقت لڑائی کا آغاز فرماتے: ^{۳۰}

جب شروع دن میں نہ لڑتے تو لڑائی کو موخر کر دیتے یہاں تک سورج ڈھل جاتا، ہوائیں چلنے لگتیں اور اللہ تعالیٰ کی مدد اتر پڑتی۔ ^{۳۱}

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بات بھی ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھتے کہ آفتاب کی طرف منہ نہ ہو۔ ایسی صورت میں تمازت آفتاب کا شکار دشمن ہوتا۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہواؤں کے رخ کا بھی خاص خیال رکھتے۔ کوشش یہ ہوتی کہ رزم گاہ میں ہوا پیچھے سے چل رہی ہوتا کہ وہ رفتار میں رکاوٹ کا باعث نہ بنے۔ ^{۳۲}

غزوہ احزاب کے موقع پر خندق کی کھدائی، غزوہ طائف میں منجیق اور دبا بے کا استعمال اور جنگ میں پیغام رسانی کے لیے پوشیدہ اور خفیہ لکھائی کا طریقہ ایجاد کرنے کا سہرا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر ہے۔ اس طرح آپ نے دوران لڑائی کو ڈور ڈزا استعمال کرائے جیسے غزوہ بدر میں ”احد احد“ اور غزوہ احد میں ”امت امت“ یعنی مارو مارو کے الفاظ استعمال

کے گئے تاکہ حملے کے وقت دوست دشمن میں امتیاز برتا جاسکے۔

ثابت قدمی اور جاں نثاری

۱۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُولُوهُمْ
الْأَذْبَارَ ۝ وَمَنْ يُؤَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبْرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَخَيِّرًا إِلَى
فِتْنَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَا وَبَهُ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝^{۳۳}

”اے ایمان والو! جب تم ایک لشکر کی صورت میں کفار سے دو چار ہو تو ان کے
مقابلہ میں پیٹھ نہ پھیرو۔ جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری۔ الا یہ کہ جنگی چال
کے طور پر ایسا کرے یا کسی دوسری فوج سے جاننے کے لیے..... تو وہ اللہ کے
غضب میں گھر جائے گا۔ اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ بہت بری جائے بازگشت
ہے۔“

۲۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ فِتْنَةً فَاقْتَبُوا ۖ^{۳۴}

”اے ایمان والو! جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو۔“

عبداللہ بن اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک صحابی تھے۔ انہوں نے ایک مکتوب میں حضور صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان یوں نقل کیا: ”جب دشمن سے مقابلہ آڑے تو ثابت قدم رہو۔“
اسی مکتوب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان بھی درج ہے:^{۳۶}

وَاعْلَمُوا أَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السِّيُوفِ.

”یقین کرو کہ بہشت تلواروں کی چھاؤں میں ہے۔“

لڑائی کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے یہ بیعت
لیتے کہ وہ میدان جنگ سے نہیں بھاگیں گے اور بعض اوقات مرنے پر بیعت لیتے۔^{۳۷}

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر لڑائی کے موقع پر فراست، شجاعت اور قیادت کے
بے مثال نمونے پیش کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام سرایا اور غزوات میں کبھی بھی سپاہ
کی کمی کو اپنے ذہن پر سوار نہیں کیا۔ کم و بیش ہر غزوہ میں کفار کی تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں
بہت زیادہ ہوتی تھی۔ اسی طرح ان کا اسلحہ اور ساز و سامان بھی مسلمانوں کے مقابلے میں بہت

زیادہ ہوتا تھا۔ غزوہ احد میں جب تیروں کی بارش ہو رہی تھی اور حالات ناموافق ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسم زخمی اور دندان مبارک شہید ہو چکے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمت اور یقین فزوں تر تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پھر بھی مسلسل فوج کو ہدایت اور حوصلہ دے رہے تھے۔

غزوہ احزاب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کے شانہ بشانہ خندق کھودی۔ خوراک کی کمی کے باعث جہاں مسلمانوں نے اپنے پیٹوں پر پتھر باندھے وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی پیٹ پر پتھر باندھ کر چٹانیں توڑیں اور محاصرے کی صعوبتوں کو برداشت کیا۔ لیکن مسلمانوں نے کبھی بھی ہتھیار ڈالنے کا نہ سوچا۔

غزوہ حنین میں مسلمان پسپا ہو رہے تھے، ان کے حوصلے ٹوٹ چکے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باواز بلند ان کو حوصلہ دلاتے رہے اور تیروں کی بارش میں بھی پیش قدمی فرمائی۔^{۳۸} صحابہ کرامؓ کی جاں نثاری کو ثابت کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ مختلف غزوات میں وہ اپنے قریبی عزیز واقارب کے خلاف برسر پیکار تھے۔ غزوہ بدر میں ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرزند عبدالرحمن (بعد میں مسلمان ہوئے) قریش کے لشکر میں شامل تھا۔ اسی غزوہ میں مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ہاتھوں سے ایک کافر بھائی کو واصل جہنم کیا۔

حکمت عملی

دشمن ہمیشہ ہی مسلمانوں کے مقابلے میں ہر طرح کے کیل کانٹے سے لیس بہترین صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے جم غفیر لے کر میدان میں اترتے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انوکھی حربی حکمت عملی اور طریقہ دفاع کا استنباط کیا اور پھر اس پر عمل کیا:

قوت ایمان اپنی جگہ مسلم لیکن غزوہ بدر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عسکری فراست نے مسلمانوں کو فتح سے ہمکنار کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش کے تجارتی کارواں کو روکنے کے لیے مدینہ سے نکلے تھے لیکن وہ بیچ نکلا اور قریش کا لشکر اس کو بچانے کے لیے مکہ سے چل پڑا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کے لشکر کا وادی بدر کے شمالی مدفل کے بجائے کوہ اسفل کے دامن میں انتظار کرنا بہتر سمجھا تا کہ منبع آپ کے کنٹرول میں رہے۔

حربی نقطہ نظر سے یہ جگہ مدینہ سے بہت بہتر تھی اور مسلمانوں کے غالب آنے کے مواقع بہت زیادہ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انفرادی جنگ سے احتراز کرنے کی ہدایت فرمائی تاکہ نقصان کا احتمال کم ہو۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مثلث کی شکل میں صف بندی کا حکم دیا جس سے دشمن عقب سے حملہ نہ کر سکا۔ اس کے برعکس قریش نے انفرادی لڑائی لڑی۔ صف ہائے ثلاثہ مخصوص علامت کی حامل تھیں۔ اس طرح مسلمانوں کے لیے اپنوں اور دشمن میں امتیاز کرنا آسان ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اولین بار عرب میں ان حربی چالوں کا استعمال کیا جن سے قریش قطعی طور پر نا آشنا تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کے لشکر کی آمد کے بعد کی شب کی تاریکی میں اپنے لشکر کی جگہ تبدیل کر لی۔ اس طرح دوسرے روز مسلمانوں کی آنکھیں آفتاب کی شعاعوں سے خیرہ ہونے سے بچ گئیں۔ ایک کامیاب جرنیل کی ان چالوں کے نتیجے میں چشم فلک نے دیکھا کہ بے سرو سامانی والے ۳۱۳ مجاہدین نے کفار کی ایک ہزار سے زائد کیل کانٹے سے لیس فوج کو شکست فاش دی۔ غزوہ بدر قریش کے لیے لبطشۃ الکبریٰ (بڑی پکڑ) قرار پایا۔

غزوہ احد میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہاڑ کو قدرتی دفاع کے طور پر استعمال فرمایا اور جبل رماہ کے ایک کم ارتفاع ٹیلہ (جسے عینین کہتے تھے) پر پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ عبداللہ بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قیادت میں مامور فرمایا: کیونکہ قریش کے پاس دو سو شہ سوار تھے جو اطراف ڈھانپے ہوئے تھے۔ ان کی قیادت خالد بن ولید کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دستے کو کسی بھی حالت میں اپنی پوزیشن سے ہلنے کی ممانعت فرمائی۔ ان کو مسلمانوں پر حملے کی صورت میں تیر اندازی کی ہدایت بھی فرمائی:

علاوہ ازیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی سپاہ کو انفرادی لڑائی سے پرہیز اور صف بندی کی تلقین فرمائی:

جب گھمسان کارن پڑا تو مسلمانوں نے قریش پر دباؤ بڑھایا اور قریش کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مسلمانوں کی صف بندی ختم ہو گئی اور وہ مال غنیمت اکٹھا کرنے لگے۔ ان کو دیکھ کر تیر اندازوں کا دستہ بھی (چند افراد کو چھوڑ کر) اپنی جگہ پر ثابت قدم نہ رہ سکا۔^{۳۹} سگنورا ہی خالد بن ولید کے سوار مسلمانوں کے عقب میں پہنچ گئے۔ اب سامنے سے قریش کا دباؤ تھا اور عقب پر

سواروں کا حملہ۔ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تیغ و تیر و سنگ کی بارش ہو رہی تھی۔ اب مسلمانوں کو درہ پر تعینات دستے کی حربی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ شکست کے قریب پہنچے ہوئے مسلمانوں کو مکمل شکست سے دوچار ہونے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمت عملی نے ہی بچایا۔ قریش مدینہ پر حملہ آور نہ ہو سکے اور انہوں نے مکہ کی راہ لی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے جاسوسی کے نظام سے یہ اطلاع بروقت مل گئی کہ قریش شاید مدینہ پر حملہ آور ہوں (اگرچہ ایسا نہ ہوا) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمان سپاہ کو دوسرے روز ہی منظم کیا تاکہ کسی بھی قسم کے امکانی حملے کا مقابلہ کیا جاسکے۔

غزوہ احد میں مسلمانوں کی عارضی ہزیمت کے بعد کفار محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تلاش میں دیوانے ہو رہے تھے۔ ابوسفیان نے چیخ چیخ کر ان کے متعلق پوچھا: پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے جواب دینے سے منع فرمایا: لیکن جب اس نے اپنے ساتھیوں کو ان تینوں کے قتل ہونے کے متعلق بتایا تو عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نہ رہا گیا اور پکارا اٹھے:

”اللہ کے دشمن تو جھوٹ کہہ رہا ہے۔“

یہ اعلان اہل اسلام کی شجاعت اور بسالت کا اظہار ہے۔ پہلے جواب نہ دینا اور پھر جواب دینا، نہایت مناسب اور مستحسن اقدام تھا۔ جواب نہ دینے میں بے اعتنائی اور اس کی تذلیل منظور تھی اور اب جواب دینے میں اس کی تحقیر اور اہانت مقصود تھی۔

غزوہ احزاب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دکھا دیا کہ بہت بڑے دشمن سے دفاعی جنگ لڑ کر بھی اسے شکست سے دوچار کیا جاسکتا ہے۔ عربوں کے ہاں خندق کے ذریعے دفاع ایک انوکھی چیز تھی جسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشورے پر کھودنے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ سے باہر موجود ہر قسم کی زرعی پیداوار کو اندرون شہر منتقل کرنے کی ہدایات دیں تاکہ دشمن ان سے استفادہ نہ کر سکے۔

خندق کھودنے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنفس نفیس حصہ لیا۔ خندق کو خشک ہی رہنے دیا گیا کیونکہ پانی بھر دینے سے اس کو عبور کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ خندق قلعہ شیخین

سے قبا تک کھودی گئی یعنی مشرق، شمال مشرق اور جنوب مشرقی سمت میں خندق نہیں کھودی گئی کیونکہ ان اطراف میں باریک اور تنگ راستوں والے گھنے باغات کی موجودگی دشمن کی پیش قدمی میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لیے کافی تھی۔ محاصرہ کے دوران میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نعیم بن مسعود اشجعی (غطفانی رئیس جو باطنی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرفدار تھے) کو احزاب اور مدینہ کے یہودیوں کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کو کہا: نعیم نے یہودیوں کو قریش کے کچھ افراد اپنے پاس یرغمال رکھنے کا مشورہ دیا اور اس طرح کا مشورہ قریش کو بھی دیا۔ یہودی سرداروں کی ممکنہ یرغمالی کا خوب چرچا ہوا کہ یہودی ان یرغالیوں کو مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے جو انہیں قتل کر دیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جب اس خبر کی صحت کے متعلق استفسار کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: معلنا امرنا ہم بذالک۔

”شاید ہم نے ایسا حکم دیا ہو۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمہ معنی جواب کی ہر شخص کے لیے اپنی تعبیر تھی۔ قریش کو یہ پختہ یقین ہو گیا کہ یہودی مسلمانوں کے حلیف ہیں اور ان کا چند افراد کو یرغمال بنانے کا مطالبہ اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے یہ مطالبہ تو یکسر مسترد کر دیا البتہ ہفتہ کے روز مسلمانوں پر حملہ کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ یہودیوں نے یوم سبت کو حملہ نہ کرنے کی دلیل دی۔ اس طرح احزاب اور یہودیوں کے درمیان شکوک پیدا ہو گئے اور وہ دونوں مسلمانوں کے خلاف متحدہ اقدام نہ کر سکے۔

تمام آثار و قرائن اور اسباب و وسائل اپنے حق میں ہونے کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح نامہ حدیبیہ کو ایک مغلوب کی طرح قبول کرنے میں ذرا تاثر نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فتح مبین قرار دیا کیونکہ اس معاہدے نے مسلمانوں اور اہل مکہ کے درمیان دس برس کے لیے جنگ بندی کر دی۔ اس طرح خیبر کے یہودیوں اور قریش کے درمیان اتحاد ختم ہو گیا۔ خیبر کو مزید تنہا کرنے اور اپنا عقب محفوظ کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے دو اتحادی قبیلوں (بنی فزارہ اور بنی غطفان) کی سرکوبی ضروری خیال کی۔ غزوات بدر اور احزاب میں مسلمانوں کی فتح اور معاہدہ حدیبیہ جس کی رو سے اہل مکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صلح کرنے پر مجبور ہوئے کے پیش نظر انہوں نے لڑائی سے اجتناب ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔

مکہ پر حملہ کرنے کے سلسلے میں لشکر کی تیاری کے احکام سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کا رابطہ بیرونی دنیا سے منقطع کیا تاکہ کسی طرح بھی قریش تک مسلمانوں کے ارادوں کی خبر نہ پہنچ سکے حتیٰ کہ تجارتی قافلے بھی شہر سے باہر ہی توقف کرتے، کاروباری لین دین بھی راس ہوتا۔ حاطب بن ابی بلتعہ نامی ایک مہاجر صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان تیاریوں کے پیش نظر اندازہ لگا لیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے صفی بن عمرو نامی ایک تاجر کی مشرک کنیر سارہ کو ایک خط لکھ کر اپنے خاندان والوں کو مکہ پہنچانے کا فریضہ سونپا۔ ایک تاجر کی کنیر ہونے کے ناطے اسے شہر سے باہر جانے پر کسی نے نہ روکا۔ مدینہ کے اطراف کے تمام راستوں کو کنٹرول کرنے پر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مامور تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اطلاع دی۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابو مرثد غنوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معیت میں سارہ کا تعاقب کیا اور اسے مکہ کی راہ میں روضہ فاخ کے مقام پر جا پکڑا۔ اس کے سر کی مینڈھیوں سے ایک خط ملا جس میں مسلمانوں کی تیاریوں کا ذکر تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاطب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس بارے میں استفسار فرمایا تو انہوں نے اقرار کیا کہ وہ اپنے خانوادہ کو مطلع چاہتے تھے کہ وہ مکہ کو چھوڑ دیں تاکہ لڑائی کے خطرات سے محفوظ رہ سکیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اس موقف کو تسلیم کر لیا اور ان سے کوئی تعرض نہ فرمایا: ^۱ حالانکہ یہ خط اگر دشمنوں تک پہنچ جاتا تو مسلمانوں کو سخت خطرات کا سامنا کرنا پڑتا۔

مکہ جانے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور مختلف راستوں سے بیک وقت شہر میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ اس طرح قریش کی کمر ہی ٹوٹ گئی۔

فتح مکہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوازن اور ثقیف کے قبائل کی تیاریوں کی اطلاعات ملنا شروع ہوئیں۔ یہ قبائل اپنی شجاعت، تیر اندازی اور تیر افگنی کے لیے شہرت رکھتے تھے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں مکہ کی تسخیر کے بعد انہیں اپنی آزادی خطرے میں محسوس ہوئی۔ قریش کے کئی ایک متمول افراد کے طائف میں باغات اور املاک تھیں۔ یہ قبائل مسلمانوں کو شکست دے کر قریش کی میراث اور سیادت کے حصول کے خواہاں تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم نے پیش بندی کے طور پر فرمایا کہ ان کو مکہ کی طرف بڑھنے کا موقع نہ دیا جائے۔ کیونکہ اگر ان قبائل نے پیش قدمی کر لی تو قریش کے شورش پسند عناصر کو ایک بار سر اٹھانے کا موقع مل سکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ اندیشہ بالکل درست ثابت ہوا۔ لڑائی کے پہلے مرحلہ پر ہوازن اور ثقیف کامیاب ہوئے تو ایسے عناصر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان کے درپے ہو گئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بوقت لڑائی جنگی لباس اور جنگی ہتھیار زیب تن فرماتے۔ بعض اوقات نیچے دوزرہیں پہنتے۔ مختلف کمانداروں کو دینے کے لیے متعدد علم استعمال فرماتے: غزوہ بدر میں مہاجرین کا علم مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عنایت فرمایا۔

جب کسی قوم پر فتح پاتے تو اس مقام پر تین روز قیام فرماتے اور پھر واپس لوٹتے۔ عموماً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعرات کو علی الصبح نکلنا پسند فرماتے۔ ہر فرد کو اپنے اپنے علم تلے لڑنے کا حکم صادر فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دشمن کے علاقہ میں جاتے وقت قرآن حکیم ساتھ لے جانے سے منع فرماتے تھے۔ لڑائی سے پیشتر دشمن کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جاتی۔

بعد از جنگ (قوانین جنگ)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درج ذیل اصول حرب متعارف کرائے، تاریخ میں ان کی نظیر نہیں ملتی ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیشتر عرب کی جنگ سفاکی اور درندہ پن کا مظہر تھی:

بچوں، عورتوں، جنگ نہ کرنے والے مردوں، گھروں میں پناہ گزین لوگوں اور مذہبی پیشواؤں کے قتل سے منع فرمایا۔^{۲۲} عرب میں دشمن کو گرفتار کرنے کے بعد کسی چیز سے باندھ کر اس کو تیروں کا نشانہ بناتے یا تلوار سے قتل کرتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی سختی سے مخالفت فرمائی۔ خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے عبدالرحمن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک لڑائی میں چند افراد کو اسی طرح قتل کرایا تھا۔ جب ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو یہ حدیث سنائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”اللہ کی قسم! میں مرغ کو بھی اس طرح مارنا جائز نہیں رکھتا۔“ عبدالرحمن نے اسی وقت کفارہ گناہ کے طور پر چار غلام آزاد کیے۔^{۴۳}

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عین میدان جنگ میں اگر گھسان کارن پڑا ہو تو حریف کے چہرہ پروار کرنے سے منع فرمایا ہے۔^{۴۴} کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔^{۴۵} عربوں میں یہ عام رواج تھا کہ فاتح کو یہ اختیار ہوتا کہ وہ مفتوح کو خواہ قتل کر دے، بردہ فروشوں کے ہاتھ فروخت کر دے یا غلام بنائے یا زندہ جلا ڈالے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے برعکس مفتوحین کو آزاد کر دینے کی طرح ڈالی۔ غزوہ بدر میں قریش کے جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں سے جو باثروت تھے ان کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چار ہزار درہم فدیہ لے کر رہا کرنے کا حکم دیا۔ متوسط افراد کو نیزہ و تلوار مہیا کرنے کو کہا۔ خواندہ لیکن نادار قیدیوں کو دس بچوں کو خواندہ بنانے کا حکم دیا۔^{۴۶} چنانچہ زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو کاتب وحی تھے، اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔^{۴۷} قیدیوں میں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مطلب بن حطب، صفی بن ابی رفاعہ اور ابو عزیہ جمعی پر احسان کیا اور ان کو بلا فدیہ آزاد کر دیا۔ اسیران بدر کو صحابہ کرام میں دو دو چار چار کے حساب سے تقسیم کر دیا گیا۔ وہ ان کو کھانا کھلاتے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے۔ ایک قیدی ابو عزیہ (برادر مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا کہنا ہے کہ مجھے اسیر رکھنے والے صبح یا شام کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوریں اٹھا لیتے۔ مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھ کو واپس کر دیتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاکید کی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔^{۴۸}

قیدیوں میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا داماد ابو العاص بھی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس کی رہائی کے لیے تین ہزار درہم فراہم کیے اور ایک ہزار درہم کے عوض کچھ زیور بیچا۔ اس میں ایک ہار خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تھا جسے دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دلگیر ہوئے۔ چنانچہ وہ ہار واپس کر دیا گیا۔^{۴۹} فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسلمانوں کو آمادہ کرنے کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ ابو العاص کو بغیر فدیہ کے رہا کر دیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور فرمایا کہ

ابوالعاص اپنی رہائی کے عوض زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو طلاق دے دے یا حلقہ بگوش اسلام ہو جائے۔ چنانچہ اس نے رہا ہو کر زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مدینہ بھیج دیا۔ غزوہ بدر میں ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا عباس بھی گرفتار ہوئے۔ انصار کے کچھ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ: ”اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حکم دیں تو ہم ان کو فدیہ کے بغیر چھوڑ دیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
 ”ایک درہم بھی ان سے نہ چھوڑو۔“^{۵۰}

عباس کے ساتھ ان کے دو بھتیجے عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث اور ان کے حلیف عتبہ بن عمر بھی گرفتار ہونے والوں میں شامل تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عباس کے ساتھ ساتھ ان تمام کا بھی فدیہ وصول کیا۔ اس سلسلہ میں قرآن حکیم میں ارشاد بانی ملاحظہ ہو:^{۵۱}

يَا أَيُّهَا لَيْبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ ۚ إِنَّ يَعْلَمَ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِيكُمْ خَيْرًا مِّمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ يَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝
 ”اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! تم لوگوں کے قبضہ میں جو قیدی ہیں ان سے کہو اگر اللہ کو معلوم ہوا کہ تمہارے دلوں میں کچھ خیر ہے تو وہ تمہیں اس سے بڑھ چڑھ کر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہاری خطائیں معاف کرے گا، اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔“

غزوہ خیبر کی ایک قیدی صفیہ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عقد میں لے لیا وہ رئیس خیبر کی دختر تھیں اور ان کا شوہر بھی قبیلہ نضیر کا رئیس تھا۔ ان دونوں کے قتل کے بعد ان کے پاس خاطر، حفظ مراتب اور رفع غم کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی مداوانہ تھا۔ یہ حسن خلق اور رحم کی بہترین مثال ہے۔ اسی طرح کا واقعہ غزوہ بنی مصطلق میں جویریہ کے ساتھ بھی پیش آیا۔

چشم فلک نے دیکھا کہ فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف فرما دیا۔ مسلمان مکہ میں خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر داخل ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے تھے۔ ”الیوم یوم الرحمة“۔ یاد رہے کہ قریش نے مسلمانوں کی

ہجرت کے بعد ان کی املاک پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب وہ وقت تھا کہ ان کو ان کے حقوق دلائے جائیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ اپنی املاک سے دستبردار ہو جائیں۔^{۵۲}

غزوہ ہوازن کے دوران میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سپاہ سے فرمایا کہ اگر تم نجدیوں پر قابو پا لو تو بنی سعد بن بکر کے کسی فرد پر سختی نہ کرنا۔ دشمن کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ گرفتار شدگان میں شیمابنت الحارث بھی تھیں۔ ان کا نام حذافہ اور لقب شیماتھا۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضائی بہن تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو احترام سے اپنی چادر بچھا کر بٹھایا اور واپسی پر انہیں کچھ اونٹ، بکریاں، ایک غلام مکحول اور ایک باندی عطا فرمائی۔ ہوازن کے قیدیوں کی رہائی کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رئیس قبیلہ زبیر بن حرد کی استدعا پر فرمایا کہ ”خاندان عبدالمطلب کے حصے کے قیدی تو فوری طور پر رہا ہیں لیکن عام رہائی کے متعلق تم نماز ظہر کے بعد مسلمانوں کے اجتماع کی درخواست پیش کرو۔“ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا: ”مجھ کو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے لیکن میں تمام مسلمانوں سے ان کے لیے سفارش کرتا ہوں۔“ مہاجرین اور انصار بول اٹھے: ”ہمارا حصہ بھی حاضر ہے۔“ اس طرح چھ ہزار قیدی دفعۃً آزاد ہو گئے۔^{۵۳}

(ب) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہروں کو آگ لگانے، فصلیں اور پھلدار درخت اجاڑنے، جانوروں کو بے دریغ قتل کرنے سے منع فرمایا:

(ج) احترام انسانیت کا یہ عالم تھا کہ دشمن کے مقتولین کو بھی واپس ہونے سے پہلے ٹھکانے لگواتے۔^{۵۴} غزوہ بدر کے موقع پر کفار کے مقتولین کی زیادہ تعداد کے پیش نظر الگ الگ دفن کرنے کی بجائے ان کی لاشوں کو ایک وسیع کنوئیں میں ڈلوادیا۔ لیکن امیہ بن خلف کی لاش پھول کر اس قابل نہیں رہی تھی کہ اس جگہ سے ہٹائی جائے، اس لیے وہیں خاک میں دبا دی گئی۔^{۵۵}

(د) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبادت گاہوں کی بے حرمتی سے ہمیشہ ہی منع فرمایا:

(ر) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دشمن کو آگ میں جلانے، ایذا دینے اور مشلہ کرنے سے منع فرمایا۔ غزوہ بدر کے قیدیوں میں سہیل بن عمرو بھی تھا۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے خلاف اپنی لسانی فصاحت کا مظاہرہ کیا جاسکتا تھا۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: کہ یا رسول اللہ! اس کے دودانت اکھڑا دیجیے کہ پھر اچھا نہ بول سکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں اگر اس کو مثلہ کروں گا تو خدا اس کے بدلے میں میرے اعضاء بھی بگاڑ دے گا۔^{۵۶}

جب کوئی مقام فتح ہو جاتا تو حضور اقامت عدل کے لیے وہاں تین روز تک قیام فرماتے۔^{۵۷} جب فتح و ظفر کی خبر آتی تو سجدہ شکرانہ بجالاتے۔^{۵۸} غنیمت کا ہر قسم کا مال جمع کرنے کا حکم دیتے۔ پہلے سلب کے حقداروں میں سلب تقسیم فرماتے، پھر باقی غنیمت کے پانچ حصے فرماتے۔ پانچواں حصہ ان لوگوں کو دیتے جن کو دینے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اس میں سے کچھ مال رفاہ عامہ میں خرچ فرماتے۔ کچھ ان لوگوں کو دیتے جن کا غنیمت میں باقاعدہ حصہ نہیں جیسے غلام، بچے اور عورتیں۔ پھر باقی چار حصے فوج میں تقسیم فرماتے۔ گھوڑ سوار کو تین حصے دیتے۔ ایک حصہ اس کا اور ”اس کے گھوڑے کے ہوتے اور پیدل کو ایک حصہ دیتے۔ اگر مناسب سمجھتے تو بعض لوگوں کو اصل غنیمت سے انعام دیتے جیسے ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کی اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر شہسوار اور پیدل کے دونوں حصے دیئے۔ لیکن عام طور پر انعام کو پسند نہیں فرماتے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد تھا کہ ”طاقتور کو اپنی غنیمت میں کمزور کو بھی شریک کرنا چاہیے۔“

یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کا ہی اثر تھا کہ مسلمان دنیا کی عظیم ترین سپاہ بن گئے۔ ان کے اخلاق کا پیمانہ ہمیشہ ہی بلند رہا۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں جب بیت المقدس فتح ہوا تو مسلمانوں کے داخلہ شہر کے وقت رومیوں نے تو بصورت دوشیزائیں فصیل شہر پر ایستادہ کر دیں۔ لیکن آفرین ہے کہ انہوں نے آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہ دیکھا۔

حوالہ جات

- ۱ قرآن حکیم ۳۳:۲۱
- ۲ حکمت عملی ان رویوں اور اقدامات کا نام ہے جو جنگ سے پہلے اور اس کے بعد دشمن کی کامیابی کے امکانات کو مسدود کریں اور حالات کو اپنے حق میں سازگار بنائیں۔ اسلام تکبر و غرور کو سخت ناپسند کرتا ہے لیکن جہاد کے موقع پر قوت کے اظہار کو پسند فرمایا گیا ہے۔ (ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی الخیلاء فی الحرب)۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ اس سے دشمن مرعوب ہوتا ہے اور رفقاء میں مستعدی و سرگرمی پیدا ہوتی ہے۔
- ۳ ۷ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو عمرۃ القضا ادا کرنے کا حکم دیا۔ طواف کے دوران میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کو ارشاد فرمایا کہ کفار کے سامنے اپنی قوت اور چستی کا مظاہرہ کریں، اپنے کندھوں سے چادریں ہٹالیں دوڑ دوڑ کر طواف کریں۔ ایسا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار پر اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے فرمایا: نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکہ میں آنے سے قبل مشرک ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ تمہارے شہر میں وہ لوگ آئیں گے جن کو شرب نے ضعیف اور ناتواں کر دیا ہے۔ اس کے رد عمل کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا حکم دیا۔
- ۴ منصوبہ بندی جنگ کے عملی پہلو سے متعلق ہوتی ہے۔
- ۵ قرآن حکیم ۹:۳۹
- ۶ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۴، ص ۱۲
- ۷ بخاری کتاب المغازی
- ۸ تفسیر فی ظلال القرآن ۳۸:۹-۳۹
- ۹ عربوں کی یہ عادت تھی کہ وہ سخت بھوک میں پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے تاکہ کمر جھکنے نہ پائے۔
- ۱۰ بخاری باب غزوہ احزاب
- ۱۱ تاریخ طبری، ج ۲، ص ۱۳۹۱ بحوالہ شبلی نعمانی سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱، ص ۲۲۶
- ۱۲ ایضاً
- ۱۳ بخاری، کتاب الجنائز، باب علامات النبوة فی الاسلام و سریہ موتہ۔
- ۱۴ بخاری کتاب المغازی
- ۱۵ قرآن حکیم ۸:۶۰

- ۱۵ بخاری کتاب الجہاد والسریر
- ۱۶ ابوداؤد، باب الضمانہ
- ۱۷ مسند احمد ضعیف، ج ۴، ص ۳۶
- ۱۸ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱، ص ۳۲۳ شبلی نعمانی
- ۱۹ طبری، ج ۳، ص ۱۶۶۹ مطبوعہ یورپ بحوالہ ایضاً
- ۲۰ بخاری کتاب الجہاد والسریر
- ۲۱ موسیٰ بن عقبہ کے خیال میں خندق کی تیاری میں بیس روز، واقدی کی رائے میں چوبیس روز اور ابن قیم کے نزدیک پورا ایک مہینہ لگا تھا۔
- ۲۲ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱، ص ۳۱۸، شبلی نعمانی
- ۲۳ مسلم
- ۲۴ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱، ص ۱۹۸ شبلی نعمانی
- ۲۵ طبری، ص ۱۲۷۴ بحوالہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱، ص ۳۵۰
- ۲۶ ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۶ بحوالہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱، ص ۱۷۹ شبلی نعمانی
- ۲۷ بخاری، ج ۲، ص ۱۰۹، کتاب قول اللہ وامرہم شورئٰ پیغمہم
- ۲۸ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۵، ص ۱۰۰ شبلی نعمانی
- ۲۹ بخاری کتاب المغازی ذکر غزوة خیبر
- ۳۰ ابوداؤد، کتاب الجہاد باب فی الوقت یستحب اللقاء
- ۳۱ خطبات بہاول پور، ص ۲۹۱ ڈاکٹر محمد حمید اللہ
- ۳۲ قرآن حکیم ۱۶:۸
- ۳۳ قرآن حکیم ۴۵:۸
- ۳۴ بخاری کتاب الجہاد باب البصر عنہ القتال
- ۳۵ ایضاً
- ۳۶ بخاری کتاب الجہاد والسریر
- ۳۷ بخاری کتاب الجہاد، باب الشجاعة فی الحرب والکفین
- ۳۸ تاریخ طبری، ج ۳، ص ۱۴۰۱ بحوالہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱، ص ۲۲۸ شبلی نعمانی
- ۳۹ اس حکمت عملی کو دوسری عالمی جنگ میں روس نے جرمنی کے خلاف اختیار کیا۔
- ۴۰ بخاری کتاب المغازی و کتاب الاستدان
- ۴۱ ابوداؤد، کتاب الجہاد

- ۴۲ ابوداؤد، ج ۲، ص ۱۰، باب الاسیر بالنبل
- ۴۳ بخاری کتاب العتق مسلم کتاب البر والصله
- ۴۴ مسلم کتاب البر
- ۴۵ مسند احمد حنبل، ج ۱، ص ۲۴۶
- ۴۶ طبقات ابن سعد، غزوه بدر، ص ۱۴
- ۴۷ تاریخ طبری، ص ۱۳۸۸ بحوالہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ج ۱، ص ۲۰۳
- ۴۸ ایضاً بحوالہ ایضاً، ص ۲۰۴
- ۴۹ بخاری، باب فضل الجهاد و باب فدا المشرکین
- ۵۰ قرآن حکیم ۸: ۷۰
- ۵۱ سیرة النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ج ۱، ص ۳۱۱ شبلی نعمانی
- ۵۲ بخاری کتاب المغازی، تاریخ طبری ج ۳، ص ۱۶۷۶ بحوالہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱، ص ۳۲۷ شبلی نعمانی
- ۵۳ روض الانف بحوالہ سیرة النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱، ص ۲۰۲ شبلی نعمانی
- ۵۴ بخاری کتاب المناقب
- ۵۵ تاریخ طبری، ص ۱۳۴۴، بحوالہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱، ص ۲۰۳ شبلی نعمانی
- ۵۶ ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی الامام یتقیم عنہ الظہور علی العدد بارفہم
- ۵۷ ابوداؤد کتاب الجهاد فی سجود الشکر

بین الاقوامی تعلقات کا اسلامی نظریہ

ظہور اسلام کے وقت حکمران تہذیب و ثقافت کے نام پر الامحدود اختیارات کا استعمال کرتے اور اس طرح عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس وقت کی دو بڑی طاقتیں قیصر و کسری تھیں اور تمام دنیا دو بڑے کیمپوں میں تقسیم تھی۔ رعایا کے ساتھ نہایت ہی ذلت آمیز سلوک ہوتا تھا۔ بظاہر ان ریاستوں کی بڑی چمک دمک تھی لیکن اندرونی طور پر وہاں بدظنی، نفرت اور عدم اعتماد کی فضا تھی۔ دنیا سیاسی، معاشی اور طبقاتی اختلافات کی بنا پر فی الواقعہ جہنم بن چکی تھی۔ دلسوزی کا مستقل راج تھا اور دنیا آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی تھی۔

عصر حاضر میں بین الاقوامی تعلقات کو نہایت ہی پیچیدہ نوعیت کا حامل مانا جاتا ہے۔ سیاسی تعلقات اور پارلیمنٹوں کی کمی نہیں ہے حتیٰ کہ اقوام متحدہ کا ادارہ بھی موجود ہے لیکن پھر بھی امن کا قیام نظر نہیں آتا۔ ذرائع کی کمی نہیں ہے لیکن ایزدی کے مطابق اقدامات کے نہ ہونے کی حیثیت وجہ سے سکون نہیں ہے۔ خشیت الہی کا فقدان ہے اس لیے اخروی جوابدہی کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ جب تک انسانوں کے ساتھ تعلقات کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلقات کے تابع نہیں کیا جاتا اور خود غرضی کی بجائے مطیع خداوندی اختیار نہیں کی جاتی، امن عالم حاصل نہیں ہو سکتا۔ خود غرضی کے جذبات کی وجہ سے ہی پوری دنیا نسلی اور قومی تعصبات کا شکار ہے اور انتہا پسند ثقافتی، سیاسی اور معاشی رقابتیں انسانیت کے ساتھ تباہی کا کھیل رچا رہی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: ”جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلقات کو استوار کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے اور اس کے درمیان فاصلے کو درست کر لیتا ہے۔“

اہل مغرب اسلام کو ایک مذہب خیال کرتے ہیں جب کہ مذہب ایک مسلک کے مترادف ہوتا ہے۔ اس کے علی الرغم اسلام ایک دین ہے جو زندگی کے اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کا تعلق دنیوی اور اخروی زندگی دونوں سے ہے۔ اسلام میں جنگ اور صلح دونوں کے قوانین کی مساوی اہمیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب او

ریاست میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے جنگیزی

مغربی علماء کا عام طور پر یہ خیال ہے کہ اقوام کے مابین طرز عمل کا جدید ضابطہ سولہویں صدی کے آخر اور سترہویں صدی کے ابتدائی عشروں تک فروغ نہیں پایا تھا جب ہیوگو گروڈش (The Law of war and peace) کی شہرہ آفات کتاب ۱۶۲۵ء میں منظر عام پر آئی اور بین الاقوامی قانون انیسویں صدی کے آخر تک اپنے سن بلوغت کو پہنچا۔ لہذا بین الاقوامی قانون اور سفارتی درجات مسیحی ریاستوں کے مابین ان کے طرز عمل کے اصول تھے اور ان کا اطلاق یکسر دنیائے مسیحیت پر ہی ہوتا تھا۔

آرتھر نساؤم (Arther Nussbaum) رقم طراز ہے کہ ”قرون وسطیٰ میں پاپائے روم غیر مسیحی حکمرانوں کے ساتھ معاہدات طے کرنے کی ممانعت کرتے تھے۔ ۲۔ مثال کے طور پر شاہ ولاڈسلاس (Vladislas) کے دربار میں تعینات پاپائے روم کے مندوب کو عام حکمت عملی کے طور پر ترکی کے سلطان مراد دوم (۱۴۲۱-۱۴۵۱ء) سے معاہدہ کا عدم قرار دینے کا اختیار حاصل تھا کیونکہ ”کافروں کے ساتھ کیے گئے عہد کی کوئی وقعت نہیں ہے۔“ ۳۔ تاہم سفارتی تحکقات جن کے نتیجے میں ۱۹۵۶ء کی پریس کانگریس قائم ہوئی میں یہ طے پایا کہ ترکی کو رسمی طور پر سفارت کاری کے یورپی ڈھانچے میں رکن کے طور پر مدعو کیا جائے۔ اس کے باوجود ایڈورڈ واس گیولک (Edward Vos Gulic) کا کہنا ہے کہ یورپی سفارتی ڈھانچے نے ”سلطنت عثمانیہ کو اور باقی ماندہ دنیا کو غیر رکن ہی تصور کیا“ حتیٰ کہ ۱۸۸۹ء میں بھی تھیوڈور ڈی ولزے کو یہ یقین تھا کہ مسیحی اقوام بین الاقوامی قانون کو صرف اپنے باہمی تعلقات میں لازمی تسلیم کرتی تھیں۔ شہ مغرب نے جنگ عظیم دوم کے بعد تک بین الاقوامی قانون اور سفارتی طریقوں کے فوائد سے غیر مسیحی دنیا کو بار آور نہ کیا۔ (حتیٰ کہ اس وقت بھی برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل کے اس بارے میں سنجیدہ تحفظات تھے کہ اوقیانوس چارٹر کی دفعات کا غیر مغربی ممالک پر اطلاق ہونا چاہیے یا نہیں؟ اس پس منظر میں یہ امر باعث دلچسپی ہے کہ اسلام نے اپنے لیے اور غیر مسلم دنیا کے لیے بین الاقوامی طرز عمل کے مختلف ضوابط وضع نہیں کیے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے انبیاء کرم علیہ السلام کے برعکس آفاق عالمین پر

جلوہ فرما ہوئے جیسا کہ ارشاداتِ بانی ہیں:

۱۔ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ.

”اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کہو اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۔“

۲۔ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ.

”ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔“

۳۔ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا.

”اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم نے تم کو تمام انسانوں ہی کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔“

۴۔ هَذَا بَلَّغٌ لِّلنَّاسِ.

”یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لیے۔“

اسی حقیقت کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔

ہر کجا ہنگامہ عالم بود
رحمتہ للعالمینی ہم بود

اسلام میں بنیادی طور پر بین الاقوامی تعلقات کے لیے رہنمائی قرآن حکیم اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ میں ملتی ہے۔ بعد میں آنے والوں کے لیے بھی یہی تقلید کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ قرآن حکیم کی کئی ایک آیات اس بات کی عکاسی کرتی ہیں کہ وحدتِ تخلیق کا تعلق براہ راست خالق کی وحدانیت سے ہے۔ جیسے فرمایا:

تَبْرَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۗ مَا تَرٰى فِي خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِن تَفٰوُتٍ ۗ فَاَرْجِعِ الْبَصَرَ ۗ هَلْ تَرٰى مِن فُطُوْرٍ ۗ ثُمَّ اَرْجِعِ الْبَصَرَ

كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبُ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ ۝ وَلَقَدْ زَيَّنَّا
السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِلشَّيْطَانِ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ
عَذَابَ السَّعِيرِ ۝

”نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی سلطنت ہے اور وہ
ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو
آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ اور وہ زبردست بھی ہے
اور درگزر فرمانے والا بھی۔ جس نے تہ برتہ سات آسمان بنائے۔ تم رحمان کی
تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو، کہیں تمہیں کوئی
خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ، تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔
ہم نے تمہارے قریب کے آسمان کو عظیم الشان چراغوں سے آراستہ کیا ہے اور
انہیں شیطانوں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ ہم نے مہیا کر رکھی ہے۔“

بین الاقوامی سطح پر معاشی عدل کی بنیاد انسانیت قرار دی گئی کیونکہ الخلق عیال اللہ
صاحب الخلق الی اللہ من احسنی الی عیالہ۔ اس طرح اسلام تمام دنیا سے نفرت اور
تصادم کا خاتمہ چاہتا ہے اور سود مند تعلقات کے فروغ کا خواہاں ہے۔ لہذا یہ مسلمانوں اور غیر
مسلموں کے لیے بین الاقوامی طرز عمل کا ایک ہی ضابطہ چاہتا ہے۔ ان بنیادی عقائد کے
ذریعے ایک ایسی عالمگیر ریاست کی بنیاد رکھی جاتی ہے جس کے دائرے میں تمام انسان ایک
عالمی ریاست کے عالمی شہری قرار پاتے ہیں جن کے حقوق مساوی اور فرائض یکساں ہیں۔

مدینہ کے یہودی اوس، خزرج کو باہم متحد نہیں ہونے دیتے تھے جن کی جنگ بعاث نے
کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محض ایک پیغمبر ہی نہ تھے بلکہ آپ
ایک مدبر بھی تھے۔ ہجرت کے فوراً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۶۲۲ء میں ایک بین الاقوامی
معاہدہ امن طے فرمایا جو میثاق مدینہ کے نام سے منسوب ہے۔ اس میں ہر طبقہ کے سیاسی اور
معاشرتی حقوق و فرائض متعین کر دیئے گئے۔ اس کا حرف آج بھی زندہ و پابندہ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کو امن و امان اور اخوت و مساوات کا گہواہ بنایا اور
مہیں سے اپنا پیغام امن بین الاقوامی سطح پر پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین

اسلام کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مستحکم حکومت کی دعا فرماتے۔^{۱۱}

وَقُلْ رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اَجَلْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۝

”یعنی اور دعا کرو کہ پروردگار، مجھ کو جہاں بھی لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔“

میثاق مدینہ کو آج بھی غیر مساوی فریقین کے مابین مساوی معاہدے کے نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی رو سے غیر مسلموں کے مذہبی اور سیاسی حقوق کی ضمانت دی گئی۔ معاہدے کی دفعات ہیں۔^{۱۲} یہ معاہدہ طرفین کی رفاہیت اور حقوق کی نگہبانی میں جامعیت کے اعتبار سے تاریخ کا اہم ترین باب ہے۔^{۱۳} میثاق مدینہ محض میثاق نہیں بلکہ ایک دستور ہے جو تحریر ہے اور اس کے لیے لفظ صحیفہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے پہلا دستور تھا۔^{۱۴} اس کا ایک مقصد اسلام کی حقانیت کو ممتاز کرنا بھی تھا۔ اسی مقصد کے پیش نظر دستور کی ایک دفعہ میں مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ اگر ان کا کوئی غیر مسلم رشتہ دار کسی مسلمان کے ہاتھوں قتل ہو جائے تو ان کی قصاص پر اصرار نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی کسی مسلمان کے خلاف کسی غیر مسلم کی مدد کرنی چاہیے۔ معاہدے کا مرکزی مسئلہ جنگ و صلح کے امور ہیں۔ یہ لازم قرار دیا گیا کہ جنگ و صلح من حیث المملکت ہوگی۔ ایسا نہیں ہوگا کہ چند لوگ صلح یا جنگ کریں اور چند نہ کریں۔ بلکہ ہر ایک کی ذمہ داری انفرادی ہونے کے ساتھ ساتھ اجتماعی بھی قرار پائی۔ مدینہ کو ایک حرم قرار دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں سے ایک نیم عرب شہر کو حرم منوالینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک سیاسی کارنامہ تھا۔^{۱۵} میثاق مدینہ درحقیقت محتاط اور دانشمندانہ اصلاح ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبائل کی بے راہ روی پر کھلم کھلا ضرب نہیں لگائی لیکن اسے ختم کر ڈالا۔ یہ دستاویز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے نظیر اور فرزانہ سیاست کی نشاندہی کرتی ہے۔ دستاویز نہ صرف اپنے زمانے میں اہمیت کی حامل تھی بلکہ اس نے آنے والے تمام مسلمان حکمرانوں کے لیے بھی رہنما اصول مہیا کیے کہ وہ اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ کس طرح سلوک کریں۔ یہ انسانیت کا اولین دستور ہے، بعد کے تمام دستاویز و منشور بشمول

اقوام متحدہ کے منشور اسی کا چربہ ہیں۔^{۱۶}

جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۹ھ میں غسان کی سرحد پر عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ امن کے معاہدات طے کیے ان کو جزیہ کی ادائیگی پر مسلمانوں کے زیر حفاظت لیا گیا۔ اس طرح یہ ایک مستند حکمت عملی بن گئی کہ جب حفاظت نہ کی جاسکے تو یہ رقم قبول نہ ہوگی۔ جب کوئی فرد یا قبیلہ جزیہ دینے سے انکار کرتا تو حفاظت کا ذمہ واپس لے لیا جاتا تھا۔ اسلام معاہدین کو اپنے دامن رحمت میں چھپا لیتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذمی کے قتل کے بارے میں فرمایا:

۱۔ من قتل معاهد الم یروح رائحة الجنة. ^{۱۷}

”جس نے کسی معاہد (ذمی) کو قتل کیا وہ جنت کی بو سے بھی محروم ہوگا۔“

۲۔ عن عدة من انباء الضحاة من ابائهم رفعوه الامن ظلم معاهدًا او انتصه او كلفه فوق طاقته اور افذشيئا بغير طب نفس نانا حججه يوم القيامة. ^{۱۸}

”کئی فرزند ان صحابہؓ اپنے آباء کے حوائے سے موضوعاً روایت کرتے ہیں کہ جو معاہد پر ظلم کرے یا معاہدے میں کمی پیدا کرے یا اس کی قوت برداشت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالے یا اس کی خوش دلی کے بغیر اس سے کچھ وصول کرے تو اس میں روز قیامت اس کی طرف سے وکیل ہوں گا۔“

اسی طرح ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص معاہدہ کو ناحق مار ڈالے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت حرام کر دے گا۔“ ^{۱۹}

اسی طرح ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص معاہدہ کو ناحق مار ڈالے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت حرام کر دے گا۔“
خلفاء راشدین کے دور میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ جیسے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل حمص سے وصول کیا جزیہ واپس کر دیا کیونکہ مسلمان اہل شہر کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے۔ جزیہ کی بدولت ذمیوں کے لیے مذہبی اور ثقافتی خود مختاری کی ضمانت بھی میسر آتی

تھی۔ اگرچہ میثاق مدینہ تو یہودیوں کے لیے بغیر جزیہ کی ادائیگی کے مذہبی آزادی بھی مہیا کرتا تھا یعنی یہودیوں کا اپنا دین اور مسلمانوں کا اپنا دین۔

دستور مدینہ سے درج ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں:

اولاً: باوجود اس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور یہودی قبائل کے درمیان تعلقات روبہ تنزل ہوئے جس کا نتیجہ یہودیوں کے مدینہ سے اخراج کی شکل میں سامنے آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ مثال قائم کر دی کہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی دوستی اور باہمی اعانت کے معاہدات طے کرنے کے لیے مذاکرات ہو سکتے ہیں۔ نتیجہ مساوی ذمہ داریوں کو قبول کیا جاسکتا ہے۔

ثانیاً: غیر مسلم شہری جزیہ ادا کر کے ذمی بن سکتے ہیں۔ اس طرح ان کی حفاظت اسلامی ریاست کے ذمہ ہوگی۔ اگر وہ فوجی خدمات ادا کرنا چاہیں تو بھی ان کی حیثیت مکمل شہریت اندوزی والی ہوگی۔

ثالثاً: آزادانہ طور پر طے کیے گئے معاہدات کا رسمی ذمہ داریوں کا درجہ ہوگا جن کو یک طرفہ طور پر منسوخ نہیں کیا جاسکتا۔

دریں اثنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کے گرد و نواح کے قبائل سے بھی معاہدات کیے اور اس کے ساتھ قریش کے تجارتی راستوں کی ناکہ بندی کی۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو مدینہ کی ریاست کا احساس دلایا۔ ۲ھ میں غزوہ بدر میں مسلمانوں کی فتح کے بعد قریش نے ایک وفد دوبارہ حبشہ بھیجا تا کہ وہاں مقیم مسلمانوں کو نجاشی سے حاصل کر لیں اور ان کی ایذا رسانی کا سامان کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمرو بن امیہ الضمری (جو ابھی مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے) کو اپنا سفیر بنا کر نجاشی کے پاس بھیجا تا کہ وہ مسلمانوں کی سفارش کرے اور ان کی حفاظت کے لیے نجاشی کو آمادہ کریں۔

مدینہ کو اقتصادی محاصرہ سے نجات دلانے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خانہ کعبہ کے عمرہ کا قصد کیا اور وہاں معاہدہ حدیبیہ طے پایا جس کی رو سے مسلمانوں نے قریش کے مفروضہ ان کو واپسی کرنے تھے۔ لیکن قریش اس شرط سے مبرا تھے۔ معاہدہ طے پانے کے وقت

قریش کے سفیر سہیل بن عمرو کے فرزند ابو جندل رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جو مسلمان ہو چکے تھے) پاپہ زنجیر وہاں آ گئے۔ (وہ مکہ کے نشیب کی طرف سے نکل بھاگے تھے) قریش نے ان کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ لمحہ باعث اضطراب تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو جندل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو واپس کر دیا۔ اور فرمایا:

”اے ابو جندل صبر کرو! ہم بد عہدی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ عنقریب تمہارے لیے کوئی راستہ نکالے گا۔“

وقت نے ثابت کر دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ کتنا درست تھا۔ معاہدہ کی یہی شق اہل مکہ کے لیے مصیبت بن گئی۔ اسی طرح ایک بار ابورافع قریش کے سفیر بن کر مدینہ آئے اور اسلام قبول کر کے وہیں ٹھہر جانا چاہا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”میں عہد شکنی کر سکتا ہوں اور نہ ہی قاصدوں کو اپنے پاس روک سکتا ہوں۔ اس وقت تم واپس جاؤ۔ اگر وہاں جا کر بھی تمہارے دل کا یہی حال رہے۔ تو پھر تم مدینہ آ جانا۔ چنانچہ ابورافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ لوٹ گئے، دوبارہ مدینہ آئے اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔“

اسلام میں صلح حدیبیہ سے بڑھ کر کوئی فتح نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں اور قریش کو امن و سلامتی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ روابط قائم کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ قریش اور دیگر قبائل کو اسلام کو عقل و شعور کے ساتھ سمجھنے کا بھی موقع ملا۔ خاندانی اور تجارتی تعلقات کی بنا پر کفار مدینہ میں آتے اور قیام کے روابط کی وجہ سے ان کو اسلام کا بھی ادراک ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے جتنے مسلمان ہوئے تھے ان دو سالوں میں اتنے یا اس سے زیادہ افراد مشرف بہ اسلام ہوئے۔ خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قبول اسلام بھی اسی زمانے کی یادگار ہے۔ ایفائے عہد کی ایسی کوئی مثال ملنا مشکل ہے۔ اسی طرح مکہ کے ابوبصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (عتبہ بن اسید ثقفی) نے اسلام قبول کیا اور مدینہ آ گئے۔ قریش کے دو آدمی انہیں واپس لانے کے لیے آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاہدہ کی پاسداری کرتے ہوئے انہیں واپس کر دیا۔ مکہ کی راہ میں ابوبصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے موقع پا کر ایک کو قتل کر دیا جب کہ دوسرا فرار ہو گیا۔ اب ابوبصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بحیرہ احمر کے کنارے شام

کی شاہراہ پر عیص نامی ایک جگہ پڑاؤ ڈالا جہاں مکہ کے دیگر مفرور بھی ڈیرا ڈالنے لگے۔ انہی میں ابو جندل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے۔^{۲۲} دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تعداد ستر ہو گئی۔ وہ قریش کے آنے والے ہر قافلہ کے لیے وبال جان بنتے چلے گئے حتیٰ کہ قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدے کی اس شق کی تفسیح کی استدعا کی جسے پذیرائی ملی۔ اس طرح مسلمانوں کو مضطرب کرنے والی شق قریش کے لیے پریشان کن نکلی۔ چند عورتیں بھی مسلمان ہو کر مدینہ آئیں۔ ان میں ام کلثوم عتبہ بن ابی معیط کی جوان کنواری بیٹی تھی۔ اس کے رشتہ دار اس کو لینے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں واپس نہیں کیا کیونکہ یہ شرط مردوں کے واپس کرنے کی تھی نہ کہ عورتوں کی۔^{۲۳} اس ضمن میں فرمان الہی ملاحظہ ہو:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمْ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ ۗ اللَّهُ
 أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ ۚ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۗ
 لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۗ وَآتُوهُنَّ مَا أَنْفَقُوا ۗ وَلَا جُنَاحَ
 عَلَيْكُمْ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أَجُورَهُنَّ ۗ وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ
 الْكُوفَرِ ۗ وَسَأَلُوا مَا أَنْفَقْتُمْ وَلَيْسَ لَكُمْ أَنْفَقُوا ۗ ذَلِكَ حُكْمُ اللَّهِ ۗ
 يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو (ان کے مومن ہونے کی) جانچ پڑتال کر لو، اور ان کے ایمان کی حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو۔ نہ وہ کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ کفار ان کے لیے حلال۔ ان کے کافر شوہروں نے جو مہر ان کے دیئے تھے وہ انہیں پھیر دو اور ان سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ تم ان کے مہر ان کو ادا کر دو۔ اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ رو کے رہو۔ جو مہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیئے تھے وہ تم واپس مانگ لو اور جو مہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیئے تھے انہیں وہ واپس مانگ لیں۔ یہ اللہ کا حکم ہے۔ وہ

تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ علیم حکیم ہے۔“

اس کے بعد معاہدے کی دوسری شرائط بھی جو بظاہر مسلمانوں کے حق میں نہیں تھیں، رفتہ رفتہ بے اثر ہوتی چلی گئیں۔ فقط وہ شرائط باقی رہ گئیں جو مسلمانوں کے لیے سود مند تھیں۔

اس شق کی تفسیح کے بعد پھر کبھی مسلمانوں نے قریش کے تجارتی قافلوں سے تعرض نہیں کیا بلکہ خود اس کی حفاظت کے لیے فوج بھیجتے تھے۔ ۲۵ جیسے سریہ خبط باسیف البحر (۵۸) شام سے واپس آنے والے قریش کے تجارتی قافلے کی حفاظت اور جہدیہ کو روکنے کے لیے روانہ کیا گیا: ۲۶

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خون ریزی کو روکنے اور امن و سلامتی کے قیام کے لیے اہل مکہ اور دیگر اقوام سے بھی معاہدے کیے۔ یہ معاہدے صحیح معنوں میں اخوت، عدل و انصاف، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیاسی بصیرت اور اسوۂ حسنہ کا بہترین نمونہ ہیں۔ یہ معاہدے اس لیے کامیاب رہے کہ ان میں اخلاقی روح کار فرما تھی اور زندگی کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسان کے نکتہ نظر کو بدل دیا تھا۔ غزوہ خیبر وہ پہلا غزوہ ہے جس میں غیر مسلم رعایا کے لیے بنائے گئے طرز حکومت کی بنیاد پڑی۔ ۲۷ یہ معاہدے نفرت، انتقام اور انسانی توہین کے ہر اثر سے پاک ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل نجران، جو عیسائی تھے، کے ساتھ ۱۰ھ میں جو معاہدہ طے فرمایا: اس کی دفعات ملاحظہ ہوں: ۲۸

۱۔ ہرگز ہرگز ان کو (عیسائیوں) رسوا نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ انہیں فوجی خدمات سرانجام دینے کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ ان پر صرف عدل و انصاف کی حکمرانی ہوگی۔

۴۔ ان کا مال و دولت ان کا مذہب اور ان کی عبادت گا ہوں کی حفاظت کی جائے گی۔

معاہدے کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ اگر وہ سودی لین دین کریں گے تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ ۲۹

یہ بات ذہن نشین رہے کہ انسانوں کو پر امن بقائے باہمی کا پہلا درس ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا۔ اسلام میں لڑائی کی اس وقت اجازت ہے:

اولاً: جب مسلمان جارحیت کا شکار ہوں۔

ثانیاً: لڑائی کا مقصد جارحیت اور فتنہ و فساد کو روکنا ہو۔

ثالثاً: مسلمان امن پسند قوتوں کے ساتھ امن اور جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر سکتے ہیں بشرطیکہ یہ معاہدے انقلاب اور اخوت کے اخلاقی اصولوں پر ہوں۔ بصورت دیگر یہ معاہدے کامیاب نہیں ہوں گے۔ جیسے ہمارے پاس ۱۹۱۹ء کے معاہدہ ورسائی کی مثال موجود ہے۔ جسے ٹھونسا گیا لہذا کچھ عرصہ کے بعد ہی ہٹلر نے اسے اپنے پاؤں تلے روند ڈالا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی ریاست کسی معاہدے کو منسوخ کر سکتی ہے یا نہیں؟ درج ذیل حالات میں مسلم ریاست کے پاس انفساخ معاہدہ کا جواز موجود ہے اور وہ طاقت کا استعمال کر سکتی ہے:

۱۔ جب غیر مسلم مسلمانوں کے ساتھ آزادانہ طور پر طے کیے گئے معاہدہ کی خلاف ورزی کریں یا ان کی وفاداری کو قبول کرنے کے بعد ان کی مقتدر سیادت کے ساتھ بغاوت کریں۔

۲۔ جب معاہداتی ذمہ داریوں کے باوجود معاہداتی فریق تواتر کے ساتھ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو۔ ایسی صورت میں معاہدے کی حقیقی خلاف ورزی سے پہلے تنبیخ کا اعلان ضرور کیا جانا چاہیے۔

۳۔ جب ایسے لوگ جنہوں نے تکرار کے ساتھ مسلم ریاست کے ساتھ معاہداتی تعلقات قائم کیے ہوں اس کو دھوکہ دیں اور وہ اپنے تمام روابط میں تمام اخلاقی اور سیاسی اقدار کو نظر انداز کریں ان کے خلاف سنگدلانہ جنگ کی اجازت ہے حتیٰ کہ وہ توبہ کر لیں اور حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں۔

۴۔ جب ریاست کے غیر مسلم اندرونی دشمن وفاداری اور دوستی کا دم بھریں لیکن فی الواقعہ شہری اتھارٹی کا انتشار اور پائمالی ان کا نصب العین ہو۔ جب افراد خفیہ طور پر دراندازی کریں اور شہری نظم و نسق میں انتشار پیدا کریں اور جرائم میں ملوث ہوں۔ اس دفعہ کا تعلق دشمن کے جاسوسوں اور سبوتاژ کرنے والوں سے ہے۔

اگر دشمن مسلمانوں یا ذمیوں کو پکڑ لیں، ان پر تشدد کریں یا خوف زدہ کریں اور قیدیوں میں خود کو آزاد کرنے کی ہمت یا وسائل نہ ہوں تو پھر مسلم ریاست پر یہ لازم ہے کہ ان کی آزادی

یقینی بنانے کے لیے طاقت والے یا پرامن اقدامات کرے۔

آخری شرط کی مزید صراحت اس طرح ہے اگر مسلمانوں نے قصداً کسی ایسی غیر مسلم ریاست میں اقامت اختیار کر رکھی ہو جس نے مسلم ریاست کے ساتھ باہمی عدم مداخلت کا معاہدہ کر رکھا ہو تو ایسی صورت میں مسلم ریاست پر ان مسلمانوں کی ذمہ داری عائد نہیں ہو گی۔^{۳۱}

قرآن حکیم میں ارشاد الہی ملاحظہ ہو: ^{۳۲}

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَنَصَرُوا أَوْلِيَّكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٌ^ط وَالَّذِينَ آمَنُوا
وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَالَكُمْ مِنْ وَلَايَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا^ج وَإِنْ
اسْتَنْصَرُواكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمْ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ
مِيثَاقٌ^ط وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ^و

”جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے، اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالسلام میں) آئیں گے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں۔ ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے۔ لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔“

ایسے مسلمان کسی بھی غیر مسلم ریاست میں رہ سکتے ہیں البتہ اگر ان پر ایذا رسانی ہو رہی ہو یا ان کو مذہبی آزادی سے محروم رکھا جا رہا ہو تو مسلم ریاست پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ ان کی ہر ممکن مدد کرے۔

اسلام میں جنگ کا تصور نہایت واضح ہے، اسے جہاد کا نام دیا جاتا ہے۔ تاہم تشدد یا تشدد کی دھمکی کی سختی سے ممانعت ہے۔ ضمیر کی آزادی کے متعلق قرآن حکیم میں کئی ایک آیات موجود ہیں۔ چند ایک ملاحظہ ہوں۔

۱۔ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ لَقَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَكْفُرْ
بِالطَّغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ ۙ لَا
انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝۳۳

”دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے
الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان
لے آیا۔ اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ
(جس کا سہارا اس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔“

۲۔ قَدْ جَاءَكُمْ بِصَآئِرٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ الْبَصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۗ وَ مَن غَمِي
فَعَلِيهَا ۗ وَمَا اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ۝ وَ كَذٰلِكَ نَصْرَفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا
دَرَسَتْ وِلْيٰتِنَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ ۝۳۴

”دیکھو، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آ گئی
ہیں۔ اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود
نقصان اٹھائے گا میں تم پر کوئی پاسبان نہیں ہوں۔ اس طرح ہم اپنی انابت کو
بار بار مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور اس لیے کرتے ہیں اور اس لیے
کرتے ہیں کہ یہ لوگ کہیں تم کسی سے پڑھ آئے ہو اور جو لوگ علم رکھتے ہیں
ان پر ہم حقیقت کو روشن کر دیں۔“

۳۵۔ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِنَفْسِكُمْ ۚ فَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۚ

”دیکھو! تم نے بھلائی کی تو وہ تمہارے اپنے ہی لیے بھلائی تھی، اور برائی کی تو
وہ تمہاری اپنی ذات کے لیے بڑائی ثابت ہوئی۔“

۳۶۔ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفِرْ ۚ

”صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے
اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔“

اسلام بزور شمشیر پھیلانے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ یہ مسلمانوں کے اخلاقی مشن کے
ساتھ ذاتی طور پر منسلک ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے: ۳۷

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ. ط

”اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

اسلام کا مدعا معاشرے میں توازن اور انصاف پیدا کرنا تھا اور یہی جہاد فی سبیل اللہ کے معانی ہیں۔ ارشاد ربانی ہے: ^{۳۸}

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ.

”اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔“

ان آیات کی روشنی میں اسلامی جنگ کے تصور کو Bellum Justum کہا جا سکتا ہے۔ جس کی زیادہ واضح شرائط اور حالات میں کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

دفاعی جنگ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ ”جو کوئی اپنا دفاع کرتے ہوئے مارا جاتا ہے وہ شہید ہے۔“ جو کوئی اپنی جائیداد کے دفاع میں مارا جاتا ہے شہید ہے۔ جو کوئی اپنے خاندان کے دفاع میں مارا جاتا ہے وہ شہید ہے۔ اور جو کوئی اللہ کی راہ میں مارا جاتا ہے وہ شہید ہے۔“

دفاعی جنگ کی درج ذیل دو اقسام ہیں:

- ۱۔ جب دشمن فی الواقعہ مسلم علاقے پر حملہ آور ہوا ہو۔
- ۲۔ یا فی الواقعہ حملہ آور نہ ہوا ہو لیکن اپنی حکمت عملی ناقابل برداشت انداز میں چلا جا رہا ہو۔ پہلی قسم خود اپنی وضاحت کرتی ہے۔ قرآن حکیم نے ایک واضح فیصلہ دیا ہے: ^{۳۹}

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝

”اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کہ

اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

دوسری قسم کا جواز قرآن حکیم میں اس طرح موجود ہے: ﴿۴۰﴾

أَذِنَ لِلَّذِينَ يُقْتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظَلَمُوا ۗ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝

”اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ وہ

مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔“

انسانی بنیادیں بھی جہاد فی سبیل اللہ کا باعث ہو سکتی ہیں۔ اس کی سند قرآن حکیم اور

احادیث دونوں سے ثابت ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ﴿۴۱﴾

”تم میں جو کوئی منکر کو دیکھے تو اسے ہاتھ سے سیدھا کرنے کی کوشش کرے۔ اگر ایسا

نہیں کر سکتا تو زبان سے کرے۔ اگر ایسا بھی نہیں کر سکتا تو دل سے کرے۔ اور یہ ایمان کا

آخری درجہ ہے۔“

اس ضمن میں قرآن حکیم کا ارشاد بھی واضح ہے: ﴿۴۲﴾

وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُم

وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا تَقْتُلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ

يُقْتَلُوا فِيهِ ۗ فَإِن قَتَلُوكُم فَاقْتُلُوهُمْ ۗ كَذٰلِكَ جَزَاءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝

”ان سے لڑو جہاں بھی تمہارا ان سے مقابلہ پیش آئے اور انہیں نکالو جہاں

سے انہوں نے تم کو نکالا ہے، اس لیے کہ قتل اگرچہ برا ہے، مگر فتنہ اس سے بھی

زیادہ برا ہے۔ اور مسجد حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں تم بھی نہ لڑو،

مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چوکیں تو تم بھی بے تکلف انہیں مارو کہ ایسے

کافروں کی یہی سزا ہے۔“

لفظ فتنہ، انتشار لا قانونیت اور طوائف الملوکی نشانہ ہی کرتا ہے جن کی وجہ سے معاشرے

میں کمزور عناصر کی ایذا رسانی ہوتی ہو۔ قرآن حکیم نے اس لفظ کو وسیع تر مفہوم میں استعمال کیا

ہے یعنی کمزور کا استحصال، ان کے قانون حقوق کا تصرف بے جا، شہریوں کی املاک پر غیر قانونی

قبضہ اور بالآخر ریاست سے ان کا اخراج۔

ضمیر کی آزادی ایک نہایت ہی متبرک حق ہے۔ اسلام نہ صرف اسے تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کے حصول کے لیے مسلح مداخلت کی بھی اجازت دیتا ہے۔ یہ حق محض مسلمانوں کے لیے ہی مخصوص نہیں ہے کیونکہ مسلم ریاست کو غیر مسلم کی مذہبی آزادی کی حفاظت کا بھی حکم دیا گیا ہے۔^{۲۳}

الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبَّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهَدِمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلُوتٌ وَ مَسْجِدٌ يُذَكَّرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝

”یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اس تصور پر کہ وہ کہتے تھے ”ہمارا رب اللہ ہے۔“ اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب مسمار کر ڈالی جائیں۔ اللہ ضرور ان کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔“

مسلم ریاست کو ایسی غیر مسلم ریاستوں کے اندرونی معاملات میں فوجی مداخلت کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے جو تبلیغ اسلام کی مخالفت نہیں کرتیں اور مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی خواہاں ہیں اور پرامن بقائے باہمی کی خواہش مند ہیں۔
قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے: ^{۲۴}

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الدّٰىنِ لَمۡ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدّٰىنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنۡ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبْرُوْهُمْ وَتُقْسَطُوْا اِلَيْهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسَطِيْنَ ۝
اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الدّٰىنِ قَتْلُوْكُمْ فِى الدّٰىنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنۡ دِيَارِكُمْ وَظَهَرُوْا عَلٰى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلُّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

”اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں

تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں۔“

ان ارشادات ربانی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے غزوہ تبوک (رجب ۹ھ) کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف قبائل سے معاہدے کیے۔ اس طرح سے اس علاقے میں ریاستیں معرض وجود میں آ گئیں اور ان معاہدات کے ذریعے اسلامی ریاست کی شمالی سرحد محفوظ ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد ہی اسلام بین الاقوامی سطح پر مکتوبات نبوی کے ذریعے متعارف ہونا شروع ہو گیا تھا۔ آپ نے دس برس کے لیے مدینہ کو فوری طور پر جنگ بندی کے ذریعے اقتصادی محاصرہ سے آزاد کرالیا۔ اب مدینہ کے تجارتی کارواں بلا خوف و خطر مکہ سے عبور کر سکتے تھے۔ اس معاہدے کے ذریعے جو سب سے نمایاں چیز سامنے آئی وہ اہل مکہ کا مسلمانوں کو تسلیم کر لینا تھا۔ نیز عرب میں جو قبائل قریش سے خائف تھے وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

معاہدہ حدیبیہ نے ثابت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت بڑے ڈپلومیٹ ہیں۔ اس وقت مسلمان مکہ پر بزور شمشیر قبضہ کر سکتے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل مکہ کو صلح کے لیے مجبور کیا اور اپنے لیے وقت حاصل کیا۔ اس وقت مدینہ کے شمال میں خیبر کے یہودی اور جنوب میں قریش تھے۔ خدشہ تھا کہ اگر مسلمان ایک فریق کی طرف بڑھیں تو دوسرا فریق مدینہ پر حملہ کر دے۔ ان حالات میں ایک زیرک سیاستدان اور عسکری فراست رکھنے والے کمانڈر کی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ ایک فریق سے صلح کی جائے اور اس کو تنہا کر دیا جائے۔ اس طرح اس کو آسانی سے پٹا جاسکتا ہے۔ مکہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو مسلمانوں سے لڑائی نہیں چاہتے تھے۔ مسلمانوں میں خود اہل مکہ کے رشتہ دار موجود تھے۔ قبائلی رشتوں، خونی رشتوں اور ذاتی تعلقات کے اثرات موجود تھے۔ ان حقائق کی موجودگی میں ڈپلومیسی کا تقاضا یہی تھا کہ مصالحت کی جائے۔ معاہدہ طے کرنے کے کچھ عرصہ

بعد مکہ میں قحط پڑا۔ عرب کا ایک قبیلہ یمامہ اہل مکہ کو خوراک سپلائی کرتا تھا۔ اس نے اسلام قبول کر لینے کے بعد مکہ کو خوراک کی ترسیل بند کر دی۔^{۴۵} اہل مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بندش کی شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف رئیس یمامہ (ثمامہ بن اثال) کی اس بندش کے ختم کرنے کا حکم دیا۔^{۴۶} بلکہ اہل مکہ کو پانچ سو طلائی سکے بھی بھجوائے۔ تاکہ شہر کے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھجوروں کی خاصی تعداد بھی ان کو بھجوائی۔ اس طرح اہل مکہ کے دلوں میں مسلمانوں کے متعلق نرم گوشہ پیدا ہوا۔

قریش نے اپنی حماقتوں کے باعث معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزیاں کیں۔ اس طرح اس کی تینخ عمل میں آئی۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش تھی کہ مکہ پر اچانک حملہ کیا جائے تاکہ اہل مکہ کشت و خون کے بغیر ہی ہتھیار ڈال دیں۔ فتح مکہ کے دن عام معافی کا اعلان آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبرانہ بصیرت کا ثبوت تھا۔ بغیر خون ریزی کے فتح کے جھنڈے گاڑنا اسی وجہ سے ممکن ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوسفیان کے گھر کو دارالامن قرار دیا۔ تاریخ ایسی کوئی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے ورنہ فاتحین مفتوحین کے ساتھ نہایت ہی دردناک اور ذلت آمیز سلوک کیا کرتے تھے، جیسے یہودیوں کی تورات میں زیر نگیں آجانے والی قوتوں کے بارے میں تحریر ہے:

”جب خداوند تیرا خدا نہیں تیرے حوالے کر دے تو انہیں مار پوا اور محروم کیجیو۔

نہ ان سے کوئی عہد کیجیو اور نہ ان پر رحم کیجیو۔“^{۴۸}

حوالہ جات

- ۱
- ۲
- ۳
- ۴
- ۵
- ۶ قرآن حکیم ۷: ۱۵۸
- ۷ قرآن حکیم ۲۱: ۱۰۷
- ۸ قرآن حکیم ۳۳: ۲۸
- ۹ قرآن حکیم ۱۴: ۵۲
- ۱۰ قرآن حکیم ۶۷: ۵۱
- ۱۱ قرآن حکیم ۱۷: ۸۰
- ۱۲ ابن ہشام حصہ اول، ص ۵۱۷-۵۲۳
- ۱۳ حیاة محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۲۸۵، محمد حسین بیگل
- ۱۴ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نظام حکمرانی جلد اول، ص ۷۶، ڈاکٹر محمد حمید اللہ
- ۱۵ ایضاً، ص ۹۸
- ۱۶ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیاست خارجہ، ص ۱۸۸، پروفیسر محمد صدیق قریشی
- ۱۷ تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۱۸۹، ابن کثیر

- ۱۸ مشکوٰۃ، باب الصلح
- ۱۹ سنن دارمی شریف
- ۲۰ فتوح البلدان، ص ۱۳۱، مقالات شبلی، ص ۲۲۱، ۲۳۱، شبلی نعمانی
Muhammad at Madina ص ۲۲۲، ۲۲۵، منگمری واٹ
Diplomacy in Islam ص ۱۲، ۲۰ ڈاکٹر افضل اقبال
- ۲۱ بخاری کتاب الشروط
- ۲۲ ایضاً
- ۲۳ ایضاً
- ۲۴ قرآن حکیم ۶۰:۱۰
- ۲۵ فتح الباری، ج ۸ ص ۱۲ بحوالہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ج ۱، ص ۳۵۲ شبلی نعمانی
- ۲۶ ایضاً ص ۶۱، ۶۲ بحوالہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ج ۱، ص ۳۵۲ شبلی نعمانی
- ۲۷ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ج ۱، ص ۲۸۸ شبلی نعمانی
- ۲۸ فتوح البلدان، حصہ اول ص ۱۰۸، ۱۰۹ بلاذری؛ زاد المعاد جلد سوم ص ۱۲۶، ۱۲۷ کتاب
الخراج ص ۴۲، ۴۳ امام ابو یوسف
- ۲۹ ابوداؤد باب اخذ الجزیہ
- ۳۰ الجہاد فی الاسلام، ص ۵۱، ۵۸ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
- ۳۱ ایضاً
- ۳۲ قرآن حکیم ۸:۴۲
- ۳۳ قرآن حکیم ۲:۲۵۶
- ۳۴ قرآن حکیم ۶:۱۰۴، ۱۰۵
- ۳۵ قرآن حکیم ۱۷:۷
- ۳۶ قرآن حکیم ۱۸:۲۹
- ۳۷ قرآن حکیم ۳:۱۱۰
- ۳۸ قرآن حکیم ۲۲:۷۸

قرآن حکیم ۲: ۱۹۰	۳۹
قرآن حکیم ۲۲: ۳۹	۴۰
مسلم ج ۱، ص ۵۰	۴۱
قرآن حکیم ۲: ۱۹۱	۴۲
قرآن حکیم ۲۲: ۴۰	۴۳
قرآن حکیم ۶۰: ۸، ۹	۴۴
بخاری کتاب المغازی	۴۵
بخاری باب وفد بنی حنیفہ	۴۶
شرح سید کبیر للرخی، ص ۹۶	۴۷
تورات باب استثناء	۴۸

کتابیات

- ۱۔ القرآن الحکیم
۲۔ تفہیم القرآن
۳۔ تفسیر عثمانی
- سید ابوالاعلیٰ مودودی
مولانا محمود الحسن، مولانا
شبیر احمد عثمانی
- مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور ۱۹۷۸
سہارن پور
- ۴۔ تفسیر فی ظلال القرآن
۵۔ تفسیر ابن کثیر
- سید قطب شہید
عماد الدین اسماعیل ابن
کثیر
- لاہور
ابن کثیر اکادمی لاہور
- ۶۔ بخاری حصہ اول، دوم، سوم
- ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل
بخاری ترجمہ: علامہ
معید الزمان
- مکتبہ رحمانیہ اردو بازار
لاہور
- ۷۔ مسلم جلد اول تا ششم
۸۔ موطا
- ابو الحسن مسلم
امام مالک
- مکتبہ مسعودیہ کراچی
کارخانہ تجارت کتب
کراچی
- ۱۹۵۳ء
- ۹۔ ترمذی
- امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ
کثیر
- کارخانہ تجارت کتب
کراچی
- ۱۹۵۳ء
- ۱۰۔ سنن دارمی
۱۱۔ سیرت النبی
حصہ اول و دوم
- ابو محمد عبید اللہ دارمی
ابن ہشام
ترجمہ: مولانا عبد الجلیل و
مولانا غلام رسول مہر
- محمد سعید اینڈ سنز کراچی
شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۲

۱۲۔ طبقات ابن سعد

محمد بن سعد

نفیس اکیڈمی کراچی

۱۹۶۲ء

حصہ اول و دوم

ترجمہ: علامہ عبداللہ

العماری

نفیس اکیڈمی کراچی

۱۳۔ تاریخ طبری حصہ اول

ابی جعفر محمد بن جریر

الطبری ترجمہ: سید محمد

دوم

ابراہیم

نفیس اکیڈمی کراچی

علامہ حافظ ابن قیم

۱۴۔ زاد المعاد

۱۹۶۲ء

جلد اول، دوم

ترجمہ: رئیس احمد جعفری

۱۹۶۲

نفیس اکیڈمی کراچی

احمد بن یحییٰ بن جابر الشہیر

۱۵۔ فتوح البلدان

بالبلاذری

ترجمہ: ابوالخیر مودودی

۱۹۹۰ء

جامعہ علوم الاثریہ جہلم

شیخ عبداللہ بن شیخ محمد بن

۱۶۔ سیرۃ الرسولؐ

عبدالوہاب ترجمہ: مولانا

حافظ محمد اسحاق

۱۷۔ سیرۃ النبیؐ

مولانا شبلی نعمانی وسید

۱۹۹۱ء

الفیصل ناشران و تاجران

سلیمان ندوی

کتب لاہور

۱۸۔ رحمۃ للعالمینؐ

قاضی محمد سلیمان سلمان

شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

منصور پوری

۱۹۔ خطبات مدراس

سید سلیمان ندوی

۱۹۳۶ء

دارالندوة اعظم گڑھ

۲۰۔ رسول رحمتؐ

مولانا ابوالکلام آزاد

۱۹۷۰ء

شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

مرتبہ: مولانا غلام رسول

مہر

- ۲۱۔ قافلہ انسانیت کا سالار مولانا سید ابوالحسن ندوی لاہور
- ۲۲۔ حیاة محمدؐ عظیم
- ۱۹۵۵ء ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ڈاکٹر محمد حسین ہیکل
- ۲۳۔ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی ڈاکٹر محمد حمید اللہ ادارہ اسلامیات کراچی
- ۲۴۔ عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی جلد اول مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن ڈاکٹر محمد حمید اللہ
- ۱۹۸۸ء ادارہ تحقیقات اسلامیہ اسلام آباد ڈاکٹر محمد حمید اللہ
- ۲۵۔ خطبات بہاول پور
- ۲۶۔ محمدؐ..... پیغمبر اسلام کانٹیننٹن ویرزبل جورجیو گرن لائٹ ریس گجرات ۱۹۸۰ء
- ۲۷۔ آنحضرتؐ بحیثیت سپہ سالار محمود خطاب مشیت ترجمہ: رئیس احمد جعفری لاہور
- ۲۸۔ پیغمبر اعظمؐ و آخر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر فیروز سنز لاہور
- ۲۹۔ حسن انقلاب ڈاکٹر نصیر احمد ناصر فیروز سنز لاہور
- ۱۹۸۳ء ادارہ ترجمان القرآن لاہور سید ابوالاعلیٰ مودودی
- ۳۰۔ الجہاد فی الاسلام
- ۱۹۸۸ء شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور پروفیسر محمد صدیق قریشی
- ۳۱۔ رسول اکرمؐ کی سیاست خارجہ
- ۱۹۹۰ء شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور پروفیسر محمد صدیق قریشی
- ۳۲۔ رسول اکرمؐ کا نظام جاسوسی
- ۱۹۵۸ء پنجاب بکڈپولاہور سید واجد رضوی
- ۳۳۔ رسول اکرمؐ میدان جنگ میں

۳۴۔ سیرت عائشہؓ	سید سلیمان ندوی	مکتبہ مدنیہ لاہور
۳۵۔ مقالات شبلی	مولانا شبلی نعمانی	اعظم گڑھ ۱۹۵۳ء
۳۶۔ اسلام اور عدل و احسان	رئیس احمد جعفری	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور
۳۷۔ اسلام میں عدل اجتماعی	سید قطب شہید	لاہور
۳۸۔ چند معاشی مسائل اور اسلام	سید یعقوب شاہ	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور
۳۹۔ اسلام میں مرکزی حکومت کا تصور اور اس کی معاشی و اقتصادی ذمہ داریاں	رشید احمد ندوی	۱۹۸۶ء لاہور
۴۰۔ امن عالم اور اسلام	سید قطب شہید	لاہور

- 41- Ahmed Brig. Gulzar; The Battles of the Prophet of Allah; vols. i&ii, Rawalpindi, 1981, 1983.
- 42- Ahmed, brig. Gulzar; The Profhtet's Concept of War, Lahore, 1986.
- 43- Hamidullah, Dr. Muhammad; Muslim Conduct of State, Lahore, 1961.
- 44- Hamidullah, Dr. Muhammad Muahammad Rasulullah, Karachi, 1979.
- 45- Iqbal, Dr, Afzal; D9plomacy in Islam. Lahore, 1962.
- 46- Nussbeum, Arthur; A concise History of the law of nations New york, 1947.
- 47- Watt, Montgomery; Muhammad at Mēdinā. London, 1962.